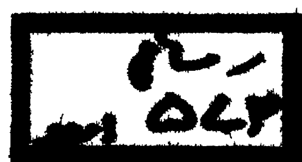




مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

جلد ۱۸۔ نمبر ۴ | بابتہ ماہ اپریل سنہ ۴۵ء | سالانہ چندہ صر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع پریس۔ دہلی

اقبال اور وطنیت

اسلامی دنیا میں اقبال کے سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی افکار کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اقبال بیسویں صدی کے اسلامی مفکر ہیں جو جدید فلسفے اور سائنس کی روشنی میں اسلامی افکار و سیاسیات کی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تفسیر و تشریح فرما رہے ہیں۔ اقبال مرحوم کے خطبات "اسلامی الہیات کی تعمیر نو" کی اشاعت کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقات میں خالص اسلام اور اس کی تعلیمات و روایات سے متعلق اس مفکر اعظم کے خیالات کو جو مزید اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان کے افکار کو زیادہ سے زیادہ تشریح کے ساتھ پیش کیا جائے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان پر تبصرہ بھی کیا جائے۔

اقبال کے تمدنی اور ثقافتی تصورات میں وطنیت اور مسئلہ وحدت اسلامیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے اس لئے میں اس فرصت میں بحث و تبصرہ کے لئے اسی کو منتخب کر رہا ہوں۔ موجودہ حالات میں کم سے کم ہندوستان میں مسئلہ وطنیت و قومیت بہت زیادہ فکر و بحث کا محتاج ہے، اور ممکن ہے کہ خاص اس مسئلے کی وضاحت اقبال کے دوسرے سیاسی افکار و تصورات کی توضیح و تشریح میں بھی کوئی مدد دے سکے۔

اس مسئلے کے متعلقات پر بحث کرنے سے پہلے میں ایک اصولی چیز کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ اصولی سے میری مراد یہ ہے کہ اگرچہ اس چیز کا اس مسئلے کے مختلف زاویوں اور گوشوں سے کوئی خصوصی تعلق نہیں اور اس حیثیت سے اُسے اس مسئلے کے متعلقات میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اقبال کے عام فلسفیانہ تصورات و افکار کے سلسلے میں وہ ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور ضرورت ہے کہ جب کبھی اقبال کے کسی مخصوص فکر یا نظریے سے بحث کی جائے تو اس اصولی چیز کو بھی پیش نظر رکھا جائے

تاکہ اقبال کی حقیقی غرض و غایت سمجھنے میں بے راہ روی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

اقبال مرحوم جیسا کہ ظاہر ہے، دراصل اسلامی فلسفے کے جدید شارح ہیں جو مخصوص حالات میں اس کے فلسفیانہ تصورات کی شرح فرما رہے ہیں۔ کسی فلسفیانہ نظام کی شرح و تفسیر کے لئے بھی کچھ مقررہ اصول اور ضابطے ہیں جن کی پابندی بہرحال ہر شارح کے لئے ضروری ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک اہم اصل وہ ہے جسے خود علامہ مرحوم نے اپنے خطبات کی تمہید میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

"یہ بہرحال پیش نظر رہے کہ فلسفیانہ نظر و فکر کے سلسلے میں قطعیت Finality کوئی چیز نہیں۔ جس قدر علم ترقی کرے گا اور فکر کے لئے نئی راہیں اور روشیں کھلیں گی اسی قدر دوسرے خیالات اور شاید ان خیالات سے زیادہ صحیح اور معقول خیالات جو ان خطبات میں پیش کئے گئے ہیں امکان پذیر ہو سکیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انسانی فکر و تصور پر بیداری کے ساتھ نظر رکھیں اور اس سے متعلق ایک آزادانہ تنقیدی روش اختیار کریں۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن حالات میں اقبال مرحوم، اپنے خطبات میں اسلامی فلسفے کی گویا ارتقائی تفسیر فرما رہے ہیں، وہ حالات تبدیل ہو سکتے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ قدرتی طور پر ان تفسیرات میں بھی شاید بہتر اور مناسب تغیرات راہ پا سکتے ہیں۔ اس لئے اہل بحث و نظر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقبال مرحوم کی پیش کردہ تفسیرات کو آخری اور قطعی تصور نہ فرمائیں اور خود اقبال کے افکار کی تشریح میں بھی حالات، ماحول اور گرد و پیش کو نظر انداز نہ ہونے دیں۔

کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی عہد میں وطنیت کے مبلغ تھے اور اس کے بعد غالباً یورپ سے مراجعت فرمانے پر انھوں نے وطنیت کو خیرباد کہا اور اس کے خلاف وحدت اسلامیہ کی تبلیغ فرمائی۔ اس خیال کی تائید میں علامہ کی ابتدائی مشق سخن کی نظمیں

مثلاً تصویر درد، ترانہ ہندی، نیا شوالہ اور ہندوستانی بچوں کا گیت پیش کی جاتی ہیں۔ ان تمام نظموں کا نچوڑ ہے۔

ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

بعد کی نظموں اور مثنویوں میں نہ صرف یہ کہ وطنیت کی مذمت کی گئی ہے بلکہ اُسے "تہذیب نوی" کا ایک بت اور مذہب کا کفن" بتایا گیا ہے اور مسلم سے درخواست کی گئی ہے۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے — اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

بظاہر اقبال کی تعلیمات میں یہ ایک تضاد ہے اور جس طرح اقبال کے پرستار اس کو پیش کر رہے ہیں اس سے تو صاف بناپن نظر آتا ہے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ اقبال کی ابتدائی نظموں کو جن میں وطنیت کا راگ الاپا گیا ہے منسوخ قرار دیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ شاعر اسلام کے یہ خیالات اس عہد کے ہیں جب ان کا فکر پوری طرح پختہ نہ ہونے پایا تھا۔ یہ شاعر کے (خدانخواستہ) خام خیالات ہیں جن پر اسلامی نظام معیشت و سیاست کی بنیادیں کھڑی نہیں کی جا سکتیں۔

جو اصحاب قرآن شریف کی بعض آیات کو جو بظاہر انھیں متناقض نظر آتی ہیں بے باکانہ منسوخ قرار دیدیتے ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اقبال کی ان نظموں کو بھی قابل نسخ قرار دیں۔ بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ ایسا کر بھی رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ وہ شاعر کے بالکل ابتدائی اور ناپختہ خیالات ہیں۔ جب شاعر کے مطالعے میں وسعت اور تجربات میں ہمہ گیری آئی تو طبعی طور پر ان کے خیالات بھی تبدیل ہو گئے۔ وہ اولاً ہندوستانی قومی شاعر تھے۔ لیکن بعد میں وہ خالص اسلامی شاعر ہو گئے۔

دراصل یہ کہنا اقبال کی بہت بڑی توہین ہے کہ یورپ کے سفر نے ان کے نظریے

بدل دے اور انھیں قومی شاعر سے اسلامی شاعر بنادیا۔ یہ تو یقینی ہے کہ اقبال کی تعلیمات میں کوئی تباین
وتناقص نہیں۔ نہ ان کے خیالات میں کوئی ایسی ناہمواری ہی ہے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ ان کے
نظریے ادلتے بدلتے رہے ہیں۔ جس وطنیت کے اقبال گن گا رہے ہیں کبھی انھوں نے اس
وطنیت کی خدمت نہیں کی اور نہ درحقیقت وحدت اسلامیہ اور وطنیت میں کوئی تباین
ہی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ چونکہ اقبال وحدت اسلامی کے مبلغ ہیں اس لئے
وہ وطنیت یا قومیت سے بیزار ہیں۔

وطنیت کے معنی ہیں وطنی اشتراک، وطنی اتحاد اور وطنی رشتہ۔ بنی نوع انسان
میں سب سے زیادہ وسیع اشتراک انسانیت میں ہے۔ انسان کے تمام افراد بہرحال
انسان ہیں اور وہ سب ایک وصف انسانیت میں شریک ہونے کے باعث انسان
کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور صفات بھی ہیں جو افراد انسان میں اتحاد و یکسانی کی
موجب ہیں۔ یہ سب صفات سب ایک حیثیت کی نہیں۔ انسانیت کے بعد وسعت اور
ہمہ گیری کے اعتبار سے ان میں درجات کا تفاوت ہے۔ مثلاً نسل، زبان، مذہب اور
وطن۔ ان میں سب سے زیادہ وسیع تر مابہ الاشتراک مذہب یا دین ہے۔ اس لئے
کہ مذہب نام ہے ان معتقدات و روایات کا جو زندگی کے لئے کسی مکمل نظام عمل کی تشکیل
کرسکیں اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑی سے بڑی توسیع ہوسکتی ہے یعنی اس مکمل نظام عمل
کی حدود میں مختلف نسل اور زبان کی قومیں داخل ہوسکتی ہیں اس کے بعد زبان اور نسل کا
درجہ ہے۔ میں چونکہ وحدتِ لسان کو وحدت نسل کا لازمی نتیجہ نہیں سمجھتا اس لئے زبان کی
حدود کو نسلی دائرے سے زیادہ وسیع قرار دے رہا ہوں۔ سب سے آخر میں وطن ہے
جو دائرہ اتحاد میں سب سے زیادہ تنگ اور سب سے زیادہ محدود و مختصر بھی دائرہ وطنیت
ہے جو ایک جغرافیائی حدود میں بسنے والے افراد انسان کو وحدت کے ایک ہی رشتے میں منسلک
کئے ہوتے ہے۔ وطنیت سے تنگ تر دائرے بھی ہوسکتے ہیں۔ مثلاً قبیلہ، خاندان،

شہریت وغیرہ۔ لیکن موجودہ انسانی معیشت پر نظر رکھتے ہوئے ان دوائر کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے اس بحث و نظر سے ان کو خارج کر دیا گیا۔

گذشتہ دو صدی سے یورپ میں وطنیت کو اجتماعی زندگی کی اساس قرار دے دیا گیا ہے اور یہ جدید تمدن کی بعض مخصوص ضروریات کے ماتحت ہوا ہے۔ کسی رشتہ کا استحکام منحصر ہے اس کی افادیت اور نافعیت پر اور یہ افادیت موقوف ہے انسان کے عام سیاسی، معاشی اور اجتماعی منافع پر اس لئے سب سے بڑا محرک عمل وہی ہو سکتا ہے جو ان منافع کی صحیح اور بہترین تنظیم کر سکے گذشتہ تاریخی تجربات نے بتایا ہے کہ جتنے ما بہ الاشتراک بھی ہیں ان سب میں وطن ہی اس قابل ہے کہ وہ کسی قوم کی بہترین اور شائستہ ترین تنظیم انجام دے سکے اور شاید یہی ایک صورت سیاسی تنظیم کی ممکن بھی ہے۔ دراصل بنی نوع انسان کے اشتراک اور باہمی تعاون کا مسئلہ انسان کی اجتماعی حیات سے وابستہ ہے۔ اگر انسان طبعی طور پر متمدن نہ ہوتا یا افراد انسان ایک دوسرے سے الگ اور جدا رہ کر بھی ترقی کے منازل طے کر سکتے تو اشتراک یا تعاون اور وحدت یا یکسانی کا سرے سے سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ سوال اس وقت پیدا ہوا جب نوع انسان کے افراد ایک مقام پر رہتے بستے پائے گئے۔ ان کے سیاسی و معاشی مفاد کی یکسانی نے ان میں قومی وحدت کے جذبے کو نشو و نما پانے کا موقع دیا۔ چنانچہ تاریخ معیشت میں سب سے پہلے خاندان کی وحدت نے جنم لیا۔ اس کے بعد اس وحدت نے اس طرح وسعت اختیار کی جس طرح پانی میں کوئی چیز پھینکنے کے بعد جو دائرہ سا بنتا ہے وہ برابر وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ خاندانی وحدت سے قبیلے کی وحدت پیدا ہوئی اور قبیلے کی وحدت ہی وطنی وحدت نے جنم لیا۔ اور آخر میں وطنی وحدت نے قومی یا نسلی وحدت کا روپ اختیار کیا۔

وطنی وحدت کو جو دراصل جاذبۂ وطنیت کی علت ہے، مصنوعی قرار دینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ خالص فطری اور تاریخی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وطنیت ایک تجریدی احساس Abstractive sense ہے۔ لیکن مذہب بھی اس اعتبار سے تجریدی ہے

بلکہ وطن کے مقابلے میں اس کی "تجریدیت" زیادہ شدید اور تاریخی طور پر بعد کی چیز ہے۔ عام افرادِ انسان کے لئے ہر وہ رشتہ زیادہ مؤثر اور قابلِ احترام ہے جو ان کی روزانہ زندگی میں زیادہ مؤثر ہے۔ مذہبی وحدت خالص روحانی اور اخلاقی وحدت ہے اور اس کا شعور تاریخی ارتقا کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ انسان کے برتر تمدن کی یادگار رہے بلکہ اس کو انسان کی روزانہ زندگی اور اس کی ابتدائی و لازمی ضرورت سے اگر کوئی تعلق ہے تو نہایت بعید۔ شاید اسی وجہ سے وہ انسانِ اول کی زندگی میں کوئی بڑا محرکِ عمل ثابت نہ ہو سکا۔ نسلی یا قومی وحدت کا احساس جاذبۂ وطنیت سے متاخر ہے اور یہ اس لئے کہ جب تک کوئی قوم ایک ہی جغرافیائی حدود میں محصور ہے۔ اس وقت تک نسل اور وطن ایک ہی دائرے پر منطبق ہیں اور ان میں کوئی فصل نہیں جب قوم کے افراد وطن کی حدود سے قدم باہر رکھتے ہیں اور کسی دوسری جگہ جا بستے ہیں تو نسلی دائرہ گویا وطنی دائرے سے منفصل ہو جاتا ہے اور پھر یا تو پہلے رشتے بالکل ٹوٹ جاتے ہیں اور نئے سرے سے نئے رشتے جوڑے جاتے ہیں اور یہ دراصل وطنیت کی توسیع ہوتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب نئی بستی میں جہاں قوم کے افراد جا بستے ہیں کوئی دوسری قوم آباد نہیں اور اگر ہے تو اقلیت میں ہے۔ اس وقت یہ دونوں بستیاں مل جل کر ایک نئے قومی وطن کی تشکیل کرتی ہیں۔ یا پہلے رشتے اپنی جگہ قائم رہتے ہیں اور مقامِ ہجرت میں بھی نئے رشتے قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہجرت کرنے والے افراد کسی ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جو پہلے مقام سے اس قدر دور ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے ان میں کوئی رشتہ یا تعلق ہی نہیں۔ یا دارِ ہجرت میں وہ ایک غیر اہم اقلیت میں ہیں۔ اس صورت میں بھی وہ اس مقام کی اکثریت میں رل مل جاتے ہیں اور ایک نئے وطن اور جدید قوم کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔

لاطینی، ایرانی اور ہندی قومیں یوں تو ایک ہی نسل یعنی آرین قوم کی مختلف شاخیں ہیں اور لسانی شہادتوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قدیم زمانے میں ایک ہی مقام پر آ

تھیں اور ایک ہی زبان عام بول چال میں استعمال کرتی تھیں۔ لیکن جب یہ قومیں بچھڑیں اور ترک وطن کرکے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو ان کی نسلی وحدت مٹ گئی۔ اور گرد و پیش کے حالات نے اُن کی شکل و صورت، اوضاع و اطوار، زبان اور معتقدات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر اس درجہ بدل دیا کہ آج بدشواری خال خال لسانی علامات اور کسی قدر طبعی آثار کی بنا پر غالباً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قومیں کسی ماقبل تاریخ عہد میں ایک ہی مقام پر آباد تھیں اور ان میں ہر قسم کا اتحاد و وفاق تھا۔

قدیم زمانے میں وطن اور قوم کا مفہوم، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ایک ہی تھا۔ اور اس کی وجہ بھی بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ ایک قوم ایک ہی مقام کی حدود میں محصور ہوتی تھی۔ قوم اور وطن کے تصور کا باہمی اختلاف مربوط ہے، افراد قوم کی ہجرت اور ترک وطن کے ساتھ۔ جب کبھی کسی نسل یا قوم کے کچھ افراد کٹ کر الگ ہوئے اور ان کا سیاسی اور معاشی مفاد ان کی اصل یا سرچشمے کے عام منافع سے جدا ہوا تو یہ افراد ایک جداگانہ ہیئت اجتماعی کے مالک ہوگئے اور مجبور ہوئے اس امر پر کہ وہ اپنی سیاسی تنظیم اپنی قوم سے الگ اپنے مخصوص حالات کے مطابق کریں یا اس تنظیم میں اپنی مقام سکونت کے طبعی و جغرافیائی افتاد اور پڑوس میں آباد ہونے والی اقوام کا بھی خاص خیال رکھیں۔ ابتدا میں ان طبقات کا مخصوص ماحول اور ان کے اپنے سیاسی و معاشی مفاد کے علاوہ کوئی اور چیز ان طبقات کو ان کے اصل سرچشمے سے ممتاز یا مختلف نہ بناتی تھی۔ لیکن زمانے کا امتداد ان میں برابر امتیازی خصوصیات پیدا کرتا رہتا تھا۔ جس سے وہ اپنی اصل سے بدستور دور ہوتی چلی جاتی تھیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ وطنیت کو انسان کی اجتماعی حیات میں بہت بڑا دخل ہے اور یہ کہ وہ خالص فطرت کی پیداوار ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ گذشتہ دو تین صدی سے یورپ میں اس فطری اصول اجتماع کو شاید اس کی افادیت یا عمومیت کی بنا پر بہت سراہا جا رہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مصنوعی چیز ہے اور سرزمین یورپ کی پیداوار ہے۔

یا اس کی زندگی کل دو ڈھائی سو سال ہے جو اقوام کی زندگی میں ایک لمحے سے زیادہ نہیں۔
کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال یورپ کی جارحانہ وطنیت سے بیزار ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً ان کی بیزاری اس صحیح اور فطری جاذبہ وطنیت سے نہیں جس کی تخلیق ارتقائی تاریخ کے نقطۂ نظر سے سطور بالا میں کی جا چکی ہے۔ اقبال کی جارحانہ وطنیت سے بیزاری غالباً وطنیت کی بنیاد پر نہیں ورنہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

کی تاویل ہو سکے گی؟ دراصل جارحانہ وطنیت سے بیزاری اس کی جارحیت کی وجہ سے ہے اور جارحیت کے معنی ہیں تخریب و افساد۔ یعنی اپنے وطن کی تعمیر کو دوسروں کی تخریب سے مربوط سمجھنا۔ وطن کے نام پر بھولے بھالے افراد قوم کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ دوسرے ارکان کی آزادی پر ڈاکے ڈالیں اور انھیں غلام بنائیں۔ دراصل وطنی تنظیم ایک محدود اور مخصوص تنظیم ہے۔ اس میں اگر کوئی فائدہ ہے تو یہ کہ اس کے ذریعے انسانی اجتماعی ہیئات کے کسی قدر دشوار مسائل کو ذرا آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ انسان کا مفاد دو طرح کا ہے۔ شخصی اور اجتماعی۔ یہ دو طرح کے مفاد قدرتی طور پر برابر نبرد آزما رہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کی آیندہ ترقی اور کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کے ان دو مختلف مفادات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ان کی شکست و ریخت سے ایک خاص اعتلائی کیفیت حاصل کی جائے۔ اس صورت میں اجتماعی منافع کے دائروں کو جس قدر تنگ کیا جائے گا اسی قدر اختلاف اور تصادم کے امکانات کم ہوں گے اور عام افراد معاشرہ کو بھی زیادہ سے زیادہ اتحاد کے رشتوں میں منسلک کیا جا سکے گا۔ اسی خیال سے یورپ میں جب دوسرے وحدانی نظام کافی آزمائے جا چکے اور ان میں کوئی کامیابی نظر نہ آئی تو مجبور ہو کر وطنی تنظیم کو اختیار کیا گیا۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور وطن کے نام سے یورپ کے مختلف ممالک نے گذشتہ دو صدی

میں کافی ترقی بھی کی۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ ترقی کے لئے مسابقانہ جذبے کو ہوا دے دے کر خوب بھڑکایا گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس جذبے نے بھڑک کر رقابت کی شکل اختیار کی اور یورپ آگ اور خون کے کھیل میں دلچسپی لینے لگا۔

یورپ کی موجودہ وطنی تنظیم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وطن سے بالاتر وہاں کوئی اور رشتہ نہیں جو ان مختلف اوطان یا ممالک کو ملا کر ایک بڑی وحدت بنا سکے۔ حیات و کائنات بے شمار وحدات کا ایک نامحدود نظام ہے جس میں قانون تدرج کام کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ وسیع وحدت خود وجود یا ہستی ہے جو جوہر اور عرض دو وحدتوں کی جامع ہے۔ جوہر ایک بہت بڑی وحدت ہے جس میں اجسام اور ارواح کی بے شمار وحدتیں بندھی ہوئی ہیں۔ جسم ذرات کی ایک ناپید اکنار دنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ذرہ کا تجزیہ کیجئے۔ آپ کو نامعلوم برقپارے یا کوانٹم حرکت کرتے نظر آئیں گے۔ یہ ایک مثال ہے، یہ بات سمجھانے کے لئے کہ اوطان کی تنظیم کسی بلند تر جذبے کے ماتحت ہونا چاہیئے تھی تاکہ اس کے زیر اثر بین الاقوامی یا بین الاوطانی مسائل کی گتھیاں بھی سلجھائی جا سکیں۔ یورپ میں چونکہ کوئی ایسا رشتہ نہ تھا اس لئے ان اوطان میں تصادم ہوا اور وہاں میدان کارزار گرم ہو گیا۔ اقبال مرحوم اسی جذبۂ رقابت، اسی جاذبۂ مسابقت اور اسی جارحانہ وطنیت کو جو بالاتر رشتۂ اتحاد سے محروم ہے ایک نو تراشیدہ بت قرار دے کر اُسے توڑ دینے کی تبلیغ فرماتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اگر وطنیت سے اس کی جارحیت کی بنا پر بیزاری کا اظہار کیا جا سکتا ہے تو یہ جارحیت کسی ایسی تنظیم میں بھی پائی جا سکتی ہے جس کی بنیادیں مذہب پر قائم ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے عام مفاد کی خاطر غیر مسلموں پر بھی جور و جفا روا رکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کے نام پر غیر مسلموں کا خون بھی بہایا جا سکتا ہے اور بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا سکتا ہے جب

تک دنیا میں غیر مسلم آباد ہیں۔ اسلام کے نام پر تنظیم کے معنی یہ ہیں کہ زمین کے چپوں کو مسلم وغیر مسلم حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ اور اب جو کچھ وطن کے نام سے ہو رہا ہے اُسے اسلام، یہودیت، نصرانیت، اشتراکیت، اشتمالیت وغیرہ ناموں سے خوب کھل کر کیا جائے۔ بظاہر ان دو صورتوں میں کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ اسلام ظلم و سفا کی کا مخالف ہے۔ اس لئے ممکن نہیں کہ اسلام کے نام سے کوئی ناروا اقدام کیا جا سکے۔ ایک مسلم کے نقطۂ نگاہ سے یہ درست ہے اور شاید مسئلہ کی وضاحت کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں کہ خواہ مخواہ مسلم تاریخ (اسلامی نہیں) کی خوں ریزیوں کا اس سلسلے میں ذکر کیا جائے۔ اور فقہائے اسلام کے مشہور اصول "الاسلام او السیف" (اسلام قبول کرو ورنہ قتل کئے جاؤ گے) کے عملی تفسیریں بھی پیش کی جائیں۔ وطن پرستوں کے نقطۂ نگاہ سے وطن بھی خونریزی اور ظلم و تعدی کو روا نہیں رکھتا اور شاید یہ صحیح بھی ہو کہ یورپ کے باشندے اپنے وطن کا نام روشن کرنے کے لئے، اپنے قومی وقار کے استحکام کے لئے۔ اور اپنے وطن کو اچھالنے کی غرض سے جو انسانیت سوز اقدامات کرتے رہتے ہیں وہ انصاف اور جمہوریت کے نام سے کرتے ہیں۔ وہ ایک انسان کے دل میں بندوق کی گولی پیوست کرتے وقت بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم انسان کی عزت و ناموس کے بقا اور اعلاء کلمۂ حق کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ درست ہے اور ہزار بار درست ہے کہ قرآن کا فرمان ہے لَا تَعْتَدُوْا (زیادتی نہ کرو) لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس فرمان پر عمل بھی کیا جائے گا۔ اسلام زندہ باد اور مسلم قوم آباد کے فلک شگاف نعروں میں کسی حق پرست کی کم زور آواز لَا تَعْتَدُوا بھی سنی جائے گی۔

ڈاکٹر اقبال کی اسلامی وحدت وطنیت سے بالاتر ضرور ہے۔ لیکن اسی طرح جیسے دس نو سے زائد اور اس سے برتر ہے۔ وحدت اسلامی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمام وطنی امتیازات مٹا دئے جائیں اور اس پر اسلامی وحدت کی بنیادیں کھڑی کر دی

جائیں اور یہ ممکن بھی نہیں۔ اسلام نام ہے زندگی کے ہمہ گیر حق پرستانہ اصول کا اور بہر حال اسلامی ممالک یہ شاندار اصول حیات اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ان اصول کی تنقید کے لئے جن افراد کی ضرورت ہے وہ کسی ایک مقام کے باشندے ہی ہو سکتے ہیں۔ جن کی کچھ اپنی مخصوص ضروریات اور حالات بھی ہیں۔ یہ پورا ڈھانچا ملا جلا کر وطنیت کے نام سے موسوم ہے۔ مختلف اوطان یا ڈھانچوں کی تنظیم کے لئے بھی کچھ بالاتر اصول و قواعد کی ضرورت ہے وہ یہی اسلامی اصول ہیں جو ان ڈھانچوں کے باہمی تعلقات اور ارتباطات کی توثیق میں زیادہ سے زیادہ مدد پہنچاتے ہیں۔

وحدت اسلامی ایک بین الاقوامی نظام کا نام ہے جو بہت سے اسلامی اوطان کی وحدات پر مشتمل ہے۔ اس لئے وطنیت اور وحدت اسلامی میں کوئی تقابل یا منافات نہیں ہو سکتی۔ ایک دھائی یعنی دس نام ہے جداگانہ دس اکائیوں کا جب تک دس اکائیاں ایک جگہ جمع نہ ہوں دھائی کا وجود ناممکن ہے۔ اسی طرح جب تک متعدد اوطان کی وحدات نہ ہوں ایک اسلامی وحدت کا وجود کہاں ہو سکتا ہے اگر ایک دھائی اور دس اکائیوں میں کوئی اختلاف یا تقابل نہیں تو وطنیت اور اسلامی وحدت میں بھی منافات قطعی ناممکن ہے۔

وحدت اسلامی کی تشکیل صرف اسلامی وطنی وحدات ہی سے ہو سکتی ہے اور ڈاکٹر اقبال نے اس سلسلے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سید عبدالرحمٰن الکواکبی اور مولانا جمال الدین افغانی کی تعلیمات اور پرخلوص مساعی کی گویا باز آفرینی ہے مولانا افغانی کی سیاسی سرگرمیاں عالم اسلامی میں کافی مشہور رہی ہیں۔ وہ وحدت اسلامی (پان اسلامزم) کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ اور اس راہ میں ان کی بے مثال قربانیاں قابلِ صد ستائش ہیں۔ وہ اسلامی ممالک کو ایک ہی رشتۂ اتحاد میں

منسلک کرنے کے لئے برابر ساعی رہے۔ لیکن ان کا منشاء ہرگز یہ نہ تھا کہ عراق، عرب شام فلسطین، مصر، افغانستان، ایران اور ترکی اپنی قومی وحدات مٹا کر ایک وحدت بن جائیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان ممالک میں اسلام کے نام سے ایک مستحکم رشتۂ اخوت قائم ہوجائے۔ وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے بھی منفرد موتی کے دانوں کی طرح ایک ہی مسلک میں منسلک ہوں۔

اقبال جو مولانا جمال الدین کے پرستاروں میں سے ہیں دول اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کے خواہاں ہیں اور چونکہ یہ خطرہ ہے کہ ایرانی کی ایرانیت، افغان کی افغانیت اور ترک کی ترکیت اس اتحاد کی راہ میں مزاحم ہو اس لئے اس بلند و بالاتر مقصد کے پیش نظر وہ اس جذبے کو سبک اور حقیر قرار دے رہے ہیں۔ جہاں مسلم کے ساتھ غیر مسلم بھی آباد ہیں یا جہاں غیر مسلم ریاستیں بھی ہیں قدرتی طور پر وہاں وحدت اسلامی کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مقام پر بسنے والے مسلم و غیر مسلم کا اتحاد صرف وطنی خطوط پر ہی ہوسکتا ہے اور چونکہ وطنیت اپنی جگہ یعنی جب اسکا وحدت اسلامی سے تصادم نہ ہو، صحیح اور مسعود جذبہ ہے اس لئے وہ معیوب نہیں اور نہ اس سے بیزاری کوئی معقول چیز ہے۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں یعنی وفات سے ایک ماہ پہلے اقبال مرحوم نے وطنیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب کرہ ارضی کے اس حصے میں بودوباش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علی ہذا القیاس چینی عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کو تیار رہتا ہے۔ (روح اقبال صفحہ ۲۴۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور وطن میں کوئی تصادم نہیں۔ ایک مسلمان مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی جنم بھومی کے لئے قربانی دینے کو تیار ہو سکتا ہے اور اس کی بہبود کے لئے جدو جہد بھی کر سکتا ہے۔

وحدت اسلامی کی جو تشریح سطور بالا میں پیش کی گئی ہے وہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اقبال مختلف اسلامی اوطان کی ایک بالاتر تنظیم کرنا چاہتے تھے جس کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ وہ وطنیت کے مخالف نہ تھے۔ یہ غلط ہے کہ وہ ایک واحد اسلامی ریاست کا قیام چاہتے تھے۔ یہ دراصل ناممکن ہے۔ جو اصحاب وطنیت کے مخالف ہیں یا جو اقبال کو وطنیت کا مخالف بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک وحدت اسلامی کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں ایک واحد اسلامی ریاست ہو۔ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے لکھا ہے۔ (اردو اقبال نمبر صفحہ ۱۹۹)

> "اقبال کہا کرتے تھے کہ اسلام میں خلافتِ راشدہ کے بعد سے اب تک بھی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم نہ ہو سکی اور نہ اس کی کوئی امید دکھائی دیتی ہے۔ البتہ اتحاد اسلامی کا تخیل اس معنی میں ضرور عملی جامہ پہن سکتا ہے کہ تمام اقوام آزاد ہوں اور اسلامی مقاصد کے لئے باہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ یہ حکومتیں ایک قسم کی اسلامی قومی حکومتیں ہوں گی۔"

جن الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے انھیں غور سے پڑھئے اور فیصلہ فرمائیے کہ اقبال قومیت یا وطنیت سے بیزار ہیں۔ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

> "مگر ان قومی حکومتوں کی بنیاد اخلاق اور محبت پر استوار ہونا چاہیے یہ قومیت یورپ کی طرح جارحانہ نہ ہونا چاہیئے۔ جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی لعنت ہے۔"

یعنی جو قومیت "اخلاق اور محبت" سے عاری ہے وہ یورپی قومیت ہے اور اقبال مرحوم

اس سے ہمیں دور رکھنا چاہتے ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم کا اتحاد، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے وطن ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور یہ اتحاد اقبال کی تحریکات کے مطابق اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی نہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسی صورت پیش آئے کہ کسی مشترک قومی وطن کے مفاد کا تصادم کسی اسلامی قومی ریاست کے مفاد سے ہو جائے تو مشترک قومی ریاست کے مسلم باشندے کیا راہ اختیار کریں؟ اس کا جواب کسی قدر دشوار ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی صورتیں پیش آتی رہی ہیں اور مسلم فقہا اسلامی اصول کے مطابق اس کا حل بھی پیش کرتے رہے ہیں۔

مسعودی عرب کا مشہور مورخ اور سیاح ہے۔ اس نے چوتھی صدی ہجرت کے اوائل میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت کثیر تعداد میں مسلمان آباد تھے جو اہل ہند کے ساتھ رل مل گئے تھے۔ انھوں نے یہاں شادیاں بھی کر لی تھیں اور مستقل طور پر یہیں رس بس گئے تھے۔ بحر خزر (کیسپین) کے آس پاس بسنے والی قوموں کے متعلق مسعودی کا بیان ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور لرشیہ کہلاتے ہیں۔ یہ خوارزم (خیوہ) سے ہجرت کر کے یہاں آبسے ہیں۔ یہ بہترین سپاہی ہیں اور خزر کے بادشاہ کو ان کی بہادری پر بڑا اعتماد ہے۔ یہ لوگ اس شرط پر یہاں آباد ہیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں گے اور مسجدیں بھی تعمیر کر سکیں گے۔ وزیر انھی میں سے چنا جائے گا۔ اور اگر خزر کے بادشاہ کو کسی اسلامی سلطنت سے جنگ پیش آئے تو مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ میں نہ بھیجا جائے گا۔ وہ دوسری قوم سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ ان کے یہاں سات حکام عدالت ہیں۔ دو مسلمان، دو خزری، دو عیسائی اور ایک روسی۔ اگر کوئی مشکل قضیہ پیش آتا ہے تو اسے مسلم حکام عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا ہے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ان کی مسجدوں میں درس قرآن کے مدارس بھی ہیں۔ (مروج الذہب جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ قدیم قومیت کی ایک ابتدائی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی رشتۂ اخوت وطنی اتحاد سے کسی قدر بلند اور بالاتر ہے۔ یعنی اگر وطنی و ملی حقوق میں تصادم ہو تو بہر حال ملی حقوق مرجح ہونا چاہئیں۔ لیکن اسلامی ریاست کے ساتھ ہو کر وطن اور ملک کے خلاف جنگ بھی نہ کرنا چاہیئے۔ مشہور فقیہہ علامہ سرخسی فرماتے ہیں "اگر اسلامی حکومت اور اس حکومت میں جہاں مسلمان آباد ہیں جنگ چھڑ جائے تو مسلمانوں کو اپنے زمانہ قیام میں ہر طرح کے محاربانہ اعمال اور غداری سے مجتنب رہنا چاہیے"۔

(مبسوط جلد دہم صفحہ ۹۸)

بعض اصحاب کی یہ روش نامحمود ہے کہ وہ علامہ اقبال کے جستہ جستہ اشعار سے وطنیت کے متعلق اُن کے تصور کی تعیین فرماتے ہیں۔ اور ان کی نثری تحریرات کو یک سر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اقبال مرحوم کے واضح سیاسی اور مذہبی تصورات کو کسی قدر دھندلا بنا دیتے ہیں۔ خود شعر و شاعری کی بابت علامہ کے یہ الفاظ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئیں :-

"شاعرانہ القا یا الہام سے جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے وہ اصلاً انفرادی حیثیت کا ہے۔ وہ مجازی، مبہم اور غیر متعلق یعنی نامشخص ہوتا ہے" (خطبات صفحہ ۱)

شوکت سبزواری

ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

زرعی اصلاح و ترقّی کا کام کون کرے؟

زرعی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں عام طور پر اسے کافی سمجھا جاتا ہے کہ نئی پالیسی کا رُخ متعین کر دیا جائے اور مجوزہ اصلاحوں کا شمار کرا دیا جائے۔ لیکن اس کام کا آغاز اس کی نگرانی اور اس کی تکمیل کون کرے یعنی مناسب انتظامی مشین کے قائم کرنے کے سوال کا جواب غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اصلاح کے تمام بڑے کاموں کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ سرکاری افسروں اور ان کے عملے کی موجودہ ذہنیت کو بدلا جائے اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ دیہات میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو ان قابل لوگوں سے کام لے سکیں جو مقامی طور پر موجود ہیں اور خود گاؤں کے لوگوں میں اپنی مدد آپ اور اپنی اصلاح آپ کے جذبے کو بیدار کر سکیں۔ اس ضمن میں آیئے سب سے پہلے موجودہ عمالِ حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا ایک جائزہ لیں۔

نظام حکومت میں اصلاح یہ ظاہر ہے نظام حکومت میں مملکت کے مقاصد برابر جھلکتے رہتے ہیں" کسی مملکت کو زندہ اور فعال صورت میں دیکھنا ہو تو اس کے نظام حکومت کا مشاہدہ کرو" اس لئے نظام حکومت کی اصلاح کے مسئلے کو، مملکت کے مشاغل اور فرائض کی روشنی ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو نظام حکومت محض امن و امان کو قائم رکھنے کے لئے بنایا گیا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مملکت کے وسیع تر مقاصد کو پورا کر سکے گا، غلط ہوگا۔ موجودہ مملکت کی نوعیت کا عکس لازمی طور پر دفتری حکومت ہی کی صورت میں نظر آ سکتا تھا۔ سرکاری حاکم، چاہے وہ کتنے ہی اہل اور کارگذار کیوں نہ ہوں اپنے کام کی قدر دانی، رعایا اور عوام سے کرانا نہیں چاہتے بلکہ حکام بالا سے کرانا چاہتے ہیں اور یہ بات اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ عہدہ دار حکومت تک

سب پر صادق آتی ہے۔ کسی ملک کے اندر اعلیٰ ترین عاملہ کا دستوری حیثیت سے غیر ذمے دار ہونا سارے نظام حکومت پر غیر ذمے داری کی ایک چھاپ لگا دیتا ہے لیکن جب اعلیٰ ترین عاملہ کی نوعیت بدل جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ لیکن غیر محسوس طریقے پر ان تمام افسروں کا رویہ بھی بدل جاتا ہے جو سلطنت کی پالیسی کو عملی جامہ پہناتے ہیں اور عام پبلک سے روزانہ دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ غالباً انگلستان کے ملازموں میں جو اعلیٰ احساس فرض، ایمانداری اور مکمل خودگذاری پائی جاتی ہے اور ہندوستان کے افسروں میں عام طور پر جو نخوت اور حاکمانہ شیخی پائی جاتی ہے اس کی تہہ میں یہی بنیادی فرق کار فرما نظر آتا ہے۔

سرکاری افسروں کی ذہنیت میں تبدیلی

اس لئے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ حکومت کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ جو دفتری حکومت اس وقت کام کر رہی ہے وہ کسانوں کی ضرورت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی اس کے ہر کام میں گھس گھس اور دفتری خانہ پُری پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجلس قانون ساز میں اصلاح کے جو قوانین نہایت نیک نیتی سے منظور کئے جاتے ہیں ان کا خاطر خواہ اثر اس تیزی کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا جس کی کہ امید کی گئی تھی۔ آج کوئی شخص سرکاری افسروں کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ عوام کبھی بھی ان سے ہمدردی، امداد یا رہنمائی کے متوقع رہتے ہیں۔ سرکاری افسر اور غیر سرکاری لوگ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دو مختلف جنسوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دو ایسی جماعتیں نظر نہیں آتیں جو مختلف راستوں سے ایک ہی قسم کا کام کر رہی ہوں۔ بلکہ یہ مخالفوں کے دو گروہ معلوم ہوتے ہیں اگر سرکار یہ چاہتی ہے کہ جماعتی خدمت کے ادارے کی حیثیت سے کوئی زود اثر کام شروع کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اوپر سے نیچے تک اپنے عہدہ داروں میں خدمت کی ذہنیت پیدا کرے۔ ان میں لوگوں کی ضرورتوں، ان کی مشکلوں اور ان کے جذبات کو تیزی کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت ہونا

چاہیے۔ ان کے رویے میں اس وقت جو "دورباشی" کا انداز پایا جاتا ہے وہ ختم ہونا چاہیے انھیں اپنے آپ کو عوام کے حقوق کا محافظ سمجھنا چاہیے۔ ان کا مخدوم نہیں بلکہ خادم سمجھنا چاہیے۔ ذہنیت کے اندر یہ تبدیلی مرکز کی طرف سے مناسب رہنمائی کے ذریعے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ سرکاری ملازموں کی بھرتی اور ترقی کا اگر مناسب نظام اختیار کیا جائے گا اور اس کے معیاروں میں پالیسی کے نئے نصب العینوں کے پیش نظر بنیادی تبدیلیاں پیدا کی جائیں گی تو اس چیز کو ضرور حاصل کیا جا سکے گا۔

سرکاری گھس گھس اور دفتری خانہ پُری

اس بات کا ثبوت کہ موجودہ نظام حکومت کسانوں کی ضرورتوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ تقاوی کے قرضوں کے تجربے سے ملتا ہے۔ مصیبت کے زمانے میں گاؤں والے بطور حق کے تقاوی کا قرض حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب وہ اپنے اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انھیں ایک نہایت پیچیدہ اور طویل طریقہ کار کی پیروی کرنا پڑتی ہے جس کے مکمل ہونے میں بڑی دیر لگتی ہے اور ان کو تحصیل کے صدر مقام کے چکر لگانا پڑتے ہیں اس کے بعد بھی اس کسان کو خوش نصیب سمجھا جاتا ہے جسے کسی نہ کسی شخص کو کچھ نہ کچھ دیے بغیر تقاوی مل جاتی ہے تقاوی کے وصول کرنے کے طریقوں میں بھی کوئی لچک اور ہمدردی نہیں پائی جاتی۔ اس بات کو سب کمیٹیوں اور کمیشنوں نے تسلیم کیا ہے کہ کسان اس وقت بھی جب کہ اُسے حکومت سے قرض لینے کا حق اور موقع حاصل ہوتا ہے گاؤں کے ساہوکار سے قرض لینا زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ وہاں سے قرض اُسے آسانی سے مل سکتا ہے اور اس کے کام کے طریقوں کو وہ سمجھ سکتا ہے۔ انھی وجوہ کی بنا پر اعلیٰ طبقے کے وہ کسان بھی جن میں کچھ خودداری کا احساس ہوتا ہے سرکاری قرضوں کو نہیں لیتے اور ان کی جگہ نہایت گراں شرح سود پر ساہوکار سے قرض لینا جاری رکھتے ہیں۔

ہر وہ شخص جسے حکومت سے کبھی بھی کوئی واسطہ پڑا ہے سرکاری تاخیر کی مثالیں

اپنے ذاتی تجربے سے پیش کرسکتا ہے۔ کاغذی گھوڑوں کو ایک دفتر سے دوسرے دفتر میں ذرا ذرا سی بات پر اور قانون کی لفظی گرفت کی بنا پر دوڑاتے رہنا وہاں روز کا معمول ہے۔ دفتر کے لوگ ان تدبیروں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں جن سے ان تاخیروں کا پتہ ان کے اعلیٰ افسروں کو ان کے ماہانہ گوشواروں سے ہرگز نہیں چل سکتا " انصاف میں تاخیر کے معنی یہ ہیں گویا انصاف سے محروم کردیا گیا" یہ قول عدالت کے کام کے لئے جس قدر صحیح ہے اتنا ہی سرکار کے دوسرے کاموں کے لئے بھی صحیح ہے۔ سول انتظام حکومت کا اگر تازہ ترین اور اندوہناک ترین مظاہرہ دیکھنا ہو تو بنگال کے حالیہ قحط کو ملاحظہ کیجئے جہاں کی صورت حال پر قابو صرف اسی وقت پایا گیا جب غلّہ کی نقل وحمل اور تقسیم کا کام فوج کے حوالے کیا گیا۔

رشوت ستانی اس کے بعد رشوت ستانی کا مسئلہ ہے۔ بے شمار مواقع ایسے ہوتے ہیں جب گاؤں والے سرکاری عہدہ داروں سے کوئی نہ کوئی کام کرانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کا واسطہ زیادہ تر محکمہ مال عدالت اور پولیس کے عہدہ داروں ہی سے پڑتا ہے گاؤں والوں کو بعض سہولتوں، رعایتوں اور معافیوں کی ضرورت ہوتی ہے انھیں مال گذاری ادا کرنا ہوتی ہے انھیں دیوانی اور فوجداری کے مقدموں میں گواہی دینا ہوتی ہے۔ انھیں کسی دستاویز کی رجسٹری کرانا ہوتی ہے۔ اس قسم کے تمام موقعوں پر انھیں دفتری حکومت کے کسی نہ کسی عہدہ دار کی دلجوئی کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ انھیں دیر بے آرامی غیر ضروری خرچ بلکہ تشویش اور اذیت کا سا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ سرکاری دفتروں کے صحیح طریقہ کار سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بعض وقت وہ قانون کی گرفت سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے صرف ایک راستہ کھلا ہوتا ہے یعنی کسی نہ کسی کی مٹھی گرم کرنا اور غیر قانونی مطالبوں کو پورا کرنا۔

اس بیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رشوت ستانی ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے نہ یہ کہ

جہاں یہ موجود ہے وہاں قصور سارا سرکاری عہدہ داروں کا ہے۔ لیکن یہ بُرائی بلاشبہ موجود ہے اور حکومت بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہے۔ جب عوامی وزارتیں برسرِ حکومت تھیں تو انھوں نے رشوت ستانی کے خلاف مہم شروع کی تھی۔ اس بات کے کہنے سے ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر واقعی اصلاح کرنا ہے تو سرکاری ملازموں کی ذہنیت کا تبدیل کرنا سب سے مقدم ہے۔

اس بات کو بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ گاؤں والوں کو بیگار دینا پڑتی ہے جس کا کبھی انہیں معاوضہ مل جاتا ہے اور کبھی نہیں ملتا جب کبھی ملتا ہے تو وہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی گاڑی کو یا خود اُسے عین اس وقت خدمت کے لئے طلب کیا جا سکتا ہے جب اس کی کھیتی کا کام جاری ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی افسر گاؤں میں ڈیرا ڈالتا ہے تو گاؤں کے لوگوں کو اس کے عملے کے لئے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ چاہے بعد میں انھیں اس کے دام ہی کیوں نہ مل جائیں تفتیشِ جرم کی صورت میں پولیس کے لوگ گاؤں میں آتے ہیں اور کئی دن تک وہاں قیام کرسکتے ہیں اور ان کا خرچ گاؤں والوں کو اُٹھانا پڑتا ہے۔

نگرانی اور معائنہ سرکار نے معائنہ کرنے والوں کو بھی دفتروں کی کارگذاری کا پتہ چلانے کے لئے مقرر کیا ہے۔ وہ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے کہ آیا مقدمات کا فیصلہ جلد کیا جا رہا ہے یا نہیں گوشوارے تیار کراتے ہیں اور ان افسروں کو اکثر یہ ہدایتیں دی جاتی ہیں کہ جہاں تک ہوسکے مقدموں کا فیصلہ موقع واردات پر کردیا کریں اور دادرسی کے کام کو تیزی سے پورا کرلیا کریں۔ دفاتر کے انتظام کے لئے اور اصلاح و ترقی کے کاموں کے لئے افسروں اور اُن کے ماتحت عملے کی تربیت کا بھی انتظام موجود ہے لیکن ابھی تک ان انتظامات سے خاطر خواہ نتیجے نہیں نکلے ہیں۔ پولیس کو مشکل ہی سے خواندہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے سرکاری ملازموں کی تعلیم بھی ابھی بہت کم ہے۔

اعلیٰ افسروں کا اثر بھی جن سے معمولاً اصلاح حال کی توقع قائم کی جا سکتی ہے کم ہوتا

جارہا ہے۔ موٹروں کے رواج نے گاؤں کے دورے میں اختصار اور بلند بازی پیدا کردی ہے اور اس کی وجہ سے عوام کے ساتھ ان کے میل جول کے مواقع کم ہو گئے ہیں اب عوام کا واسطہ زیادہ تر ادنیٰ عہدہ داروں ہی سے رہتا ہے۔ اعلیٰ افسروں کے پاس اگر کبھی شکایتیں بھیجی جاتی ہیں تو ان کا میلان اپنے ماتحتوں کی طرفداری کی جانب ہوتا ہے کیونکہ دفتری حکومت بہرحال ایک واحد نظام رکھتی ہے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر کسانوں کے دل سے سرکاری عہدہ داروں اور افسروں کا اعتبار جاتا رہا ہے اور وہ انہیں کھلے طور پر بداعتمادی اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسی دوری اور غلط فہمی کی وجہ سے حکومت کی بہت سی نہایت اچھی اسکیمیں ناکام ثابت ہو چکی ہیں اور یہی وجہ امداد باہمی کی انجمنوں کی ناکامی کی بھی ہے۔ جو شخص بھی موجودہ صورت حال پر غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ اب اس طرف سے تغافل کرنا نہایت غیر مناسب ہے۔ اصلاح کی تمام چیزوں کی کامیابی کے لئے حکومت کے نمائندوں اور گاؤں والوں میں دوستانہ روابط کا ہونا نہایت ضروری ہے

<u>مقدم یا نمبردار</u> مقدم یا نمبردار کی موجودہ حیثیت اس بات کو اور بھی اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔ پرانے زمانے میں یہ شخص گاؤں کا ایک قدرتی رہنما ہوا کرتا تھا اور لوگ ہر معاملہ میں اس سے ہدایت اور مشورہ کے متوقع رہتے تھے۔ وہ ان کے رنج و راحت میں برابر شریک رہتا تھا۔ وہ گاؤں کی جماعت کا ایک فرد ہوتا تھا اور "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کی ایک زندہ مثال ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ ایک "افسر" یعنی سرکاری ملازم بن گیا ہے اور اس کو اپنی جگہ پر قائم رہنے کے لئے اعلیٰ عہدہ داروں کی سرپرستی کا سہارا لینا پڑتا ہے اس کے فرائض بہت سخت ہیں۔ اسے پیدائش اور اموات کا اندراج کرنا ہوتا ہے۔ اسے جرائم، مداخلت بے جا اور وبا اور بیماری کے بارے میں اطلاع کرنا ہوتی ہے۔ اسے پٹواری کی اور مالگذاری کے افسروں اور پولیس کے لوگوں کی ان کے فرائض کی بجا آوری

کے سلسلے میں امداد کرنا ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کام کو پورا کرنے سے وہ قاصر رہتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔ افسروں کے دورے کے وقت جو خرچ اٹھانا پڑتا ہے جلد ہی وہ اس ہنر کو سیکھ جاتا ہے جس کے ذریعے اپنے آقاؤں کو خوش رکھا جا سکتا ہے اور ضرورت کے وقت رعیت کی چمڑی ادھیڑی جا سکتی ہے اور اس قسم کی ضروریات ہزاروں کی تعداد میں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ اس نظام کو اوپر سرکار، نیچے بیگار کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اگر کسی بات پر نمبردار، پٹواری اور پولیس کے دیوان بھی مل جائیں تو پھر غریب دیہاتی کا اس دنیا میں کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان کے گاؤں کو ایک پرامن بہشت فرض کرنا محض افسانہ پرستی ہے۔ جب لوگوں کے پاس بہت سا خالی وقت ہوتا ہے تو انھیں جھگڑا کرنے میں مزا ملنے لگتا ہے اور سرکاری افسر جھگڑا کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ جھوٹے دعوے، جھوٹی گواہیاں اور مقدمہ بازی کا طویل سلسلہ گاؤں کے زوال اور نفاق کی تصویر کو مکمل کرتے رہتے ہیں۔

جن لوگوں نے ہندوستان کے گاؤں کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ان کو یہ بیان مبالغہ آمیز نظر آئے گا۔ لیکن جو شخص رات دن گاؤں کے لوگوں کے درمیان اٹھ بیٹھ چکا ہو اور جس نے ان کے مسئلوں کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہو اسے اس بیان میں دیہی علاقہ کی جماعتی زندگی کی صحیح جھلکیاں نظر آئیں گی۔ لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا حکومت کی طرف سے قومی تعمیر کے جو کام ہو رہے ہیں انھوں نے اس حالت میں کوئی بہتری نہیں پیدا کی ہے؟ کہنا یہی ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے؟ سرکاری رپورٹیں اس کا جواب اثبات میں دیتی بھی ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ سرکاری نگرانی میں انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ نمائشیں منعقد ہوتی ہیں۔ ہل اور دوسرے آلات رعایتی قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں۔ بڑے حکام کو خوش کرنے کے لیے چھٹی کے دن پورے گاؤں کی صفائی کر دی جاتی ہے۔ لیکن ان سب کاموں کو گاؤں کے "نئے رہنماؤں" کا طبقہ انجام دیتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے ساہوکاری

یا زائد لگان وصول کرکے کچھ روپیہ اکٹھا کر لیا ہے اور جن کے پاس گاؤں کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے فرصت ہوتی ہے۔ اس قسم کے تماشے کرکے وہ اپنا الّو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی اعلیٰ حکام پیٹھ موڑتے ہیں ہر چیز اپنی پرانی بے ڈھنگی رفتار پر چلنے لگتی ہے۔ یہ "نئے رہنما" اصلی کاشتکار نہیں ہوتے۔ انھیں حقیقتاً کھیتی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی اولاد سرکاری ملازمتوں یا علمی پیشوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ کھیتی کو یہ ذلیل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ شہروں میں جا بستے ہیں اور "پرباسی" زمیندار بن جاتے ہیں۔ وہاں جب کامیاب ہوتے ہیں تو دوبارہ اپنا روپیہ زمینداری کی خریداری میں لگاتے ہیں اور برائی کے اس چکر کو دائمی بنا دیتے ہیں۔ جب حالات یہ ہوں تو کسی دیرپا ترقی کی امید قائم نہیں کی جا سکتی۔

اصلاح کی صورت اس لئے اصلاح کی اوّلین شرط یہ ہے کہ پہلے ان کارکنوں کی اصلاح کی جائے جو کسانوں سے براہ راست واسطہ رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کا اعتماد اور اشتراک عمل حاصل کر سکیں۔ ایک معمولی کسان اپنا فائدہ خوب جانتا ہے وہ چالاک اور حوصلہ مند تو نہیں ہوتا۔ لیکن مخلص محنتی اور ایماندار ضرور ہوتا ہے اور صحیح رہنمائی کو قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ رشوت ستانی اور دوست پروری ایسی برائیاں ہیں جو مشرقی ملکوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لئے ان سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ان کو تو گوارا ہی کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ مغرب کے بہت سے ملکوں میں بھی اجتماعی زندگی کے ارتقاء کی ایک خاص منزل میں سخت قسم کی بدانتظامی اور بددیانتی عام طور پر پائی جاتی تھی۔ یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے اس قسم کی کافی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کا صحیح علاج جمہوری حکومت ہے۔ جب کسی قوم کی عزت نفس بیدار ہو جاتی ہے تو وہ فرسودہ خیالوں اور نصب العینوں کو ترک کر دیتی ہے اور ترقی پسندی کی کوشش کرنے لگتی ہے

یک زمانہ تھا جب مہذب دنیا کے لوگ جاپان اور روس پر ہنسا کرتے تھے کہ ان کے یہاں رشوت اور اندرونی سازشوں کی بڑی گرم بازاری ہے اور ان کی جمہوری اہلیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان ملکوں کی ترقی نے ثابت کر دیا ہے کہ تعلیم اور جمہوریت کے ذریعے کیسا انقلاب کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں ناخواندگی۔ معاشری نظام کی غیر تغیر پذیری اور لوگوں کے اس جمود کی وجہ سے جو صدیوں کے ظلم و افلاس کا نتیجہ ہے۔ اصلاح کا کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ افلاس اور غلامی برابر ہماری قومی زندگی کی جڑوں پر کلہاڑا چلا رہی ہے۔ لیکن ان کے باوجود ہندوستان کے دل کی حالت ابھی تک ٹھیک ہے۔ عوامی تحریکات کے اثر کو ہندوستان ضرور قبول کرے گا۔ اگر حکومت کے کارکنوں کی ذہنیت تبدیل ہو جائے اگر سرکاری افسروں اور عوام کے مقاصد میں یک جہتی پیدا ہو جائے تو دیہی علاقے کی کایا پلٹی جا سکتی ہے۔ علاج صرف یہ ہے کہ سرکاری کارکنوں میں "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" کا جذبہ پیدا کیا جائے نمبردار، پٹواری، اور تحصیل دار کو انتظام حکومت کے فن کا ضرور ماہر بنایا جائے لیکن انھیں اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھنے کی بھی تربیت دی جائے تاکہ وہ انھیں آہستہ آہستہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کر سکیں۔ ان کا کام خادم کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی تعلیم ہونا چاہیے۔

معاشی بہتری کے لئے جو تحریکیں چلائی جائیں گی وہ خود صحت مند قوتوں کو ابھاریں گی۔ لیکن اگر حکومت کی انتظامی مشین میں اوپر لکھی ہوئی اصلاحیں کر دی جائیں گی تو گاؤں والوں کو ضروری رہنمائی مل سکے گی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ خود گاؤں والوں کے اندر اپنے اداروں کے ذریعے اپنی مدد آپ کرنے کے جذبے کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ہر گاؤں میں ایک پنچایت۔ ایک امداد باہمی کی انجمن اور ایک اسکول کا انتظام کرنا ہوگا اور دوسرے طریقوں پر ان کے اندر اجتماعی زندگی کو ترقی دینا ہوگی۔

سرمنی لال بی نانا وتی

صنعتی انقلاب اور اس کے بعد کی معاشی ترقی

انگلستان میں اٹھارھویں صدی کے آخری نصف میں نام نہاد "صنعتی انقلاب" رونما ہوا۔ اس وقت سے آج تک معاشی کاروبار کا رجحان مغربی اور مغرب پرست ملکوں میں نمایاں طور پر بلندی کی طرف رہا ہے۔ ایک طرف آبادیوں میں بڑے اضافے ہوئے ہیں مثلاً انگلستان اور ویلز کی آبادی جو سنہ ۱۸۰۱ء میں ۹۰ لاکھ تھی سنہ ۱۸۵۱ء میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ اور آج چار کروڑ ہو گئی ہے دوسری طرف پیدائش دولت میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہو رہا ہے اگرچہ اس کو صحیح صحیح ناپا نہیں جا سکتا کیونکہ نئی نئی چیزیں برابر دریافت کی جاتی رہی ہیں اور مجموعی پیداوار میں مصنوعات اور خدمات کا تناسب بڑھتا رہا ہے اور زراعتی پیداوار کا گھٹتا رہا ہے۔ جو بہترین تخمینے موجود ہیں۔ ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انگلستان اور ویلز میں پیداوار فی کس سو سال پہلے کے مقابلے میں آج دو یا تین گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ سے زندگی کے عام معیار میں خاصی بلندی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو بھی صحیح صحیح ناپا نہیں جا سکتا۔ لیکن سو سال کے بیانات کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے بہت سے مزدوروں کے خاندان اور خاص کر کھیتوں پر کام کرنے والے مزدور ایسی زندگی بسر کرتے تھے جس کا شمار آج کل افلاس اور فاقہ زدگی میں کیا جائے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ موجودہ زمانے کے مزدور کو غذا، مکان، لباس نیز سفر، تعلیم اور تفریح کی سہولتیں اپنے دادا بلکہ اپنے باپ سے بھی کہیں زیادہ حاصل ہیں۔ کام کے ہفتہ کی لمبائی جس کا ناپنا ممکن ہے بلاشبہ کم ہو گئی ہے۔ فیکٹری اور تعمیرات کے مزدوروں کو انیسویں صدی کی دو تہائی مدت گزرنے تک ہفتہ میں ۶۰ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں اکثر مزدوروں کو ۵۴ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ آج وہ صرف

۴۸ گھنٹے یا اس سے کم کام کرتے ہیں۔ شرح اموات کی کمی کو بھی ناپا جا سکتا ہے۔ انگلستان اور ویلز میں شرح اموات ۱۸۷۰ء تک ۲۱ فی ہزار تھی۔ آج یہ ۱۲ سے کم ہے۔ پچھلے زمانے کی شرح اموات کی زیادتی کا سبب کچھ تو طبی واقفیت کی کمی تھی لیکن اس سے زیادہ یہ بات تھی کہ لوگوں کو کافی غذا کھانے کو نہیں ملتی تھی۔ انگلستان اور ویلز کے بارے میں ہم نے کچھ اوپر اعداد درج کئے ہیں۔ لیکن اس سے ملتے جلتے اعداد، آبادی، پیداوار اور معیار زندگی کے اضافے کے بارے میں مغرب کے اکثر ملکوں کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

ہم زیادہ تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ بلکہ معاشی کاروبار کی اس غیر معمولی توسیع کے بارے میں چند عام باتیں درج کئے دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس توسیع کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے بلکہ برابر جاری ہے۔ مغربی یورپ میں آبادی کی توسیع تو ضرور رک گئی ہے لیکن دوسری چیزوں میں اضافے کی طرف میلان اب تک برابر جاری ہے۔ اس کی تصدیق میں کچھ واقعات اور اعداد پیش کئے جا سکتے ہیں گذشتہ بیس تیس سال میں بہت سی ایسی بڑی صنعتیں وجود میں آئیں جو اس قسم کی چیزوں کو بناتی یا استعمال کرتی ہیں جیسے کہ ربڑ، پٹرول، موٹر کار، بجلی کے آلات، سینما کے فلم جن سے لوگ پہلے یا تو واقف نہیں تھے یا جن کی نسبتی اہمیت اتنی زیادہ نہیں تھی۔ کوئلے کی پیداوار دنیا میں ۱۸۶۰ء میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن تھی۔ ۱۸۲۰ء میں چار کروڑ ۰۵ لاکھ۔ ۱۸۹۰ء میں ۵۰ کروڑ۔ اور ۱۹۱۳ء میں ایک ارب ۲۰ کروڑ ٹن ہو گئی تھی۔ اس وقت سے دوسری چیزوں کے مقابلے میں کوئلے کی پیداوار میں نسبتاً کم اضافہ ہوا ہے۔ اس کی جگہ دوسری چیزیں مثلاً معدنی تیل ایک حد تک استعمال کی جانے لگی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ۱۹۳۶ء میں دنیا میں کوئلے کی پیداوار ایک ارب ۳۰ کروڑ ٹن تھی۔ اس کے مقابلے میں خام پٹرول کی پیداوار ۱۹۰۰ء میں ۲ کروڑ ٹن۔ ۱۹۱۳ء میں ۵ کروڑ ٹن اور ۱۹۳۶ء میں ۲۳ کروڑ ٹن

تھی۔ لوہے کی پیداوار سن ۱۸۰۰ء میں ۲ لاکھ ٹن تھی۔ سن ۱۸۸۰ء میں ایک کروڑ ہوئی۔ سن ۱۹۰۰ء میں ۴ کروڑ اور سن ۱۹۳۶ء میں ۹ کروڑ ٹن ہو گئی۔ ایک لحاظ سے صنعتی انقلاب کا دارومدار کوئلہ اور لوہے ہی پر تھا۔ لوہے کی ضرورت ابتدا میں مشینیں بنانے کے لئے اور بعد میں ریلیں اور ریل کی گاڑیاں بنانے کے لئے ہوئی اور کوئلے کی ضرورت مشینوں اور انجنوں کے لئے قوت محرکہ فراہم کرنے کے لئے ہوئی۔ اس لئے اگر صنعتی ترقی کو ناپنے کے لئے کوئلہ اور لوہے (اور موجودہ زمانے میں فولاد اور پٹرول) کی پیداوار کو استعمال کیا جائے تو اوپر کے اعداد کے دیکھنے سے یہ بات صاف طور پر نظر آتی ہے کہ امتداد زمانے کے ساتھ ترقی کی رفتار بھی برابر تیز ہوتی جا رہی ہے۔

ان مشینوں کا رواج جو بھاپ کی قوت سے چلتی تھیں آہستہ آہستہ ہی ہوا۔ واٹ نے سن ۱۷۶۹ء میں اسٹیم کے انجن کو ایجاد کیا تھا اور گردش میں لانے والی حرکت کو جس کے ذریعے ہر قسم کی مشینوں کے چلانے کا امکان پیدا ہوا۔ سن ۱۷۸۲ء میں ایجاد کیا گیا۔ لیکن سن ۱۸۰۰ء میں ساری سلطنت متحدہ برطانیہ میں صرف ۲۸۹ بھاپ کے انجن کام کرتے تھے۔ سن ۱۸۳۵ء میں قوت محرکہ سے چلنے والے کرگھوں کی تعداد ایک لاکھ ۲۳ ہزار تھی۔ (آج ان کی تعداد دس لاکھ ہے) اور ان میں سے سات ہزار کو چھوڑ کر باقی سب روئی کی صنعت میں لگے ہوئے تھے۔ روئی کی صنعت کے علاوہ دوسری صنعتوں میں سن ۱۸۴۰ء بلکہ سن ۱۸۵۰ء تک انگلستان میں فیکٹریوں کا نظام عام طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ملکوں میں یہ نظام اور بھی بعد میں رائج ہوا۔

اس کی ایک حد تک یہ وجہ تھی کہ مزدوروں میں نقل پذیری کم پائی جاتی تھی۔ بعض ملکوں میں مزدور انیسویں صدی کے خاصے طویل زمانے تک بیگار کے نظام کے ماتحت زمین کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ انگلستان میں انھیں نقل و حرکت کی آزادی تھی لیکن بہت سے شمال کی جانب (کیونکہ آبادی کا بیش تر حصہ جنوب میں تھا)

نقل سکونت کے لئے اور فیکٹری میں داخل ہونے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ شروع کے سالوں میں فیکٹری کے مزدوروں میں زیادہ تر آئرلینڈ کے لوگ تھے۔ لیکن اصل وجہ فیکٹری نظام کی ترقی کے سست ہونے کی یہ تھی کہ ابھی معاشی کاروبار کی مختلف شاخوں میں ترقی ہونا باقی تھی۔ کئی عشرے گذر گئے، جب کہیں قوت محرکہ سے چلنے والے کرگھے سوت کی پیداوار کے اضافے کا ساتھ دے سکے جو کاتنے اور دھننے کے طریقوں کی اصلاح و ترقی سے ممکن ہوگئی تھی اور اس سے بھی زیادہ مدت کپڑے کی تیاری کے بعد کی منزلوں کو بہتر بنانے کے لئے صرف کرنا پڑی۔ ابتدائی اسٹیم انجنوں اور مشینوں کو ہاتھ سے بنایا جاتا تھا۔ اس لئے ان میں بہت سی خرابیاں رہتی تھیں اور وہ اکثر ٹوٹتی رہتی تھیں ۱۸۲۵ء میں کہیں جاکر مشین بنانے والے اوزاروں کی اہم ایجادیں ہوئیں اور انھوں نے مشین بنانے کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا کیا جس کی وجہ سے صحیح اور قابل اعتماد مشینوں کو بڑی تعداد میں بنایا جاسکا۔ مزدوروں کو مشینیں بنانے ان کی مرمت کرنے اور انھیں استعمال کرنے کی تربیت دینی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مشینوں کی ترقی ایک حد تک کوئلے کی کان کنی اور فولاد سازی کی صنعت کی ترقی پر بھی منحصر تھی۔ غرض اس پیچیدہ نظام پیدائش کے ماتحت کسی ایک شعبے میں ایجادوں سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ جب ساتھ ہی ساتھ دوسرے شعبوں میں بھی ترقیاں ہوں اور یہ بات آج بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی جب تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک شعبہ کی ترقیوں سے دوسرے شعبے کی ترقیوں کو تحریک ہوتی ہے اور انھیں ان سے امداد ملتی ہے اور یہ اپنی جگہ پھر اور نئی ترقیوں اور اصلاحوں کا موجب ہوتی ہیں۔ چنانچہ ترقی یافتہ کاتنے کی مشینوں نے لوگوں کو قوتِ محرکہ سے چلنے والے کرگھے ایجاد کرنے کی طرف مائل کیا۔ اسی طرح کوئلے کی کانوں سے پانی نکالنے کے لئے جب بھاپ کے انجنوں کو استعمال کیا گیا تو کوئلہ سستا ہوا اور کوئلے کے سستے ہونے کی وجہ سے بھاپ کے انجنوں کی لاگت کم ہوگئی اور ان کی مانگ

بڑھ گئی۔

مختلف شعبوں کی ترقی میں جو باہمی انحصار پایا جاتا ہے اس کی نہایت اہم مثال نقل وحمل کی ترقی میں نظر آتی ہے۔ شہروں کے درمیان تخصیص کار کو اس وقت تک زیادہ ترقی نہیں ہوسکتی جب تک کہ منڈی کا رقبہ، نقل وحمل کی لاگت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے محدود رہتا ہے۔ وہ شہر جو بعض چیزوں کو خود پیدا نہیں کرسکتے، ان کی کم مقداروں ہی کو دوسرے شہروں سے منگا سکیں گے کیونکہ نقل وحمل کے مصارف کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہوجائے گا۔ اکثر شہر جو انھیں پیدا کرسکیں گے پیدا کرنا جاری رکھیں گے۔ کیونکہ جن شہروں کو نسبتی فوائد اورکم تر مصارف اس وجہ سے ہوتے ہوں گے کہ ان کی آب وہوا یا زمین بعض پیداواروں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے یا جن کے یہاں کوئلہ یا خام لوہا یا دوسری معدنیات موجود ہیں یا جن کے یہاں ایک خاص صنعت مرکوز ہوچکی ہے —— ان کے ان فوائد کی تلافی خاصے فاصلوں پر منتقل کرنے کے مصارف کی زیادتی سے ہوجائے گی۔ اٹھارھویں صدی میں نقل وحمل کے مصارف بہت زیادہ تھے اور صرف بیش قیمت چیزوں ہی کو بڑے فاصلے پر خصوصاً خشکی کے راستے سے منتقل کرنے میں فائدہ تھا۔ لیکن میکاڈم اور دوسرے لوگوں نے سڑکوں کو ترقی دی نہریں بنائی گئیں۔ دریاؤں میں جہازرانی کا امکان پیدا کیا گیا اور سب سے بڑی تبدیلی ریلوں کی تعمیر کے ذریعے ہوئی۔ ۱۸۲۵ء میں پہلی بھاپ کی ریل (اسٹاکٹن اور ڈارلنگٹن ریلوے) بنائی گئی جس پر بھاپ سے چلنے والی گاڑی چلائی گئی۔ لیکن جب تک انیسویں صدی نصف کے قریب نہیں گذرچکی اس وقت تک انگلستان میں ریلوں کا جال نہیں بچھ سکا۔ اور دوسرے ترقی پسند ملکوں میں یہ ترقی اور بھی بعد میں ہوئی۔

ریلوں نے پورے براعظموں کو باہم منسلک کردیا۔ اب لوگ ساحلوں اور دریا کے کناروں پر آباد ہونے کی جگہ وسط ملک میں آباد ہوسکتے تھے۔ دوردراز منڈیوں

میں فروخت کرنے کے لئے فصلیں وسط ملک میں بوئی جاسکتی تھیں۔ ۱۸۲۲ء میں معاشیات کے ماہر میک کلاؤچ نے لکھا تھا کہ انگلستان میں زندہ مویشی اور نمک لگا ہوا گوشت سوائے ہیمبرگ کے کسی دوسرے مقام سے درآمد نہیں کیا جاسکتا اور وہاں سے بھی درآمد کی توقع زیادہ نہیں کی جاسکتی۔ اُس نے کہا تھا کہ جنوبی امریکہ سے ایک چھٹانک گوشت بھی نہیں آسکے گا۔ ۱۸۴۵ء میں کابڈن نے کہا تھا کہ انگلستان کے کسان کو عملاً غلّہ پر دس شلنگ فی کوارٹر کی تامین ملی ہوئی ہے کیونکہ ڈانزگ سے لندن تک غلّہ کو منتقل کرنے میں تقریباً دس شلنگ کے برابر لاگت آتی تھی۔ لیکن نقل وحمل کی تیز رفتار ترقی نے ان سب باتوں کو بدل ڈالا۔ امریکہ اور دوسرے سمندر پار ملکوں میں ریلوں کی تعمیر کی وجہ سے اور جہاز سازی کے فن تعمیر میں اصلاحات کی بنا پر ۱۸۸۰ء کے بعد غلّہ اور گوشت کا بڑی مقدار میں سمندر پار سے درآمد کرنا ممکن ہوگیا۔ نقل وحمل کے مصارف کی اسی مسلسل کمی نے انگلستان کے اور دوسرے ملکوں کے صنّاعوں کے لئے دنیا کی منڈی میں اپنا مال فروخت کرنے کا امکان پیدا کر دیا۔

ریلوں کی ترقی کو بڑی امداد ان مسلسل اصلاحوں سے ملی جو لوہے اور بعد میں فولاد کے پیدا کرنے میں کی جاتی رہیں۔ ریلوں اور ان کی گاڑیوں کے لئے لوہے اور فولاد کی بڑی مقداروں میں ضرورت ہوئی۔ اس زائد مانگ کی وجہ سے بڑے پیمانے کی کفائتیں حاصل کی جاسکیں جس کی وجہ سے ریلوں اور ان کی گاڑیوں کی قیمت اور کم ہوگئی۔ سستے نقل وحمل نے لوہے اور فولاد کو اس طرح بھی بڑھایا کہ ان کی وجہ سے مصنوعات کو ترقی دینے کا موقع ملا اور اُن کی ترقی نے ہر قسم کی مشینوں اور سامانوں کی مانگ پیدا کی۔ دوسری طرف اس کی وجہ سے لوہے اور فولاد کے کارخانوں کو کوئلہ اور خام لوہا، (اور بعد میں بیکار لوہا) پہلے کے مقابلے میں زیادہ دور سے اور زیادہ سستی قیمت پر مل سکا۔ غرض اس طرح لوہے اور فولاد کی صنعت نے ریلوں اور جہاز رانی کی ترقی میں مدد دی۔ اور خود انھوں نے لوہے اور فولاد کی صنعت کی ترقی میں۔

ف۔ بنہم

لیگی سیاست کے نئے میلانات

مسلم لیگ کی سیاست اس وقت نہایت نازک مرحلہ سے گذر رہی ہے۔ پنجاب کی لیگی وزارت ایک عرصہ ہوا ٹوٹ چکی ہے۔ سرحدی وزارت بھی حال میں ختم ہوگئی ہے اور اس کی جگہ کانگریسی وزارت نے لے لی ہے۔ بنگال میں دفعہ ۹۳ کا نفاذ ہو گیا ہے یعنی آئین کو معطل کرکے سب اختیارات گورنر نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت نے بہت سے پلٹے کھائے ہیں اور مختلف قسم کی مصالحتیں اس کو کرنا پڑی ہیں آسام کی لیگی وزارت اور وہاں کے لیگی عوام میں کشمکش جاری ہے۔ لیگ کی وزارتوں پر لوگ رشوت ستانی کی تہمتیں لگا رہے ہیں۔ ان کے خلوص اور وفاداری پر حرف زنی کر رہے ہیں۔ یو۔پی میں لیگ کے اندر سخت اختلافات رہ چکے ہیں۔ انھیں اب ایک حد تک سلجھا لیا گیا ہے۔ مسٹر جناح بیمار ہیں۔ ان کی علالت کی وجہ سے لیگ کا سالانہ اجلاس ملتوی کرنا پڑا ہے۔ وائسرائے انگلستان گئے ہوئے ہیں اور کانگریسی رہنما جیلوں سے رہا ہو رہے ہیں۔ ہر طرف چرچا ہے کہ حکومت کانگریس سے سمجھوتہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ سپرو کی مصالحتی کمیٹی نے جو تجویزیں شائع کی ہیں ان میں دور دور کہیں پاکستان کا گذر نہیں ہے۔ مہاتما گاندھی جس حد تک آگے بڑھ گئے تھے اس کے مقابلے میں یہ تجویزیں بہت رجعت پسند معلوم ہوتی ہیں کیا مسٹر جناح سے گاندھی جی کی ملاقات کو پاکستان کے مطالبے کا انتہائی نقطہ عروج سمجھا جائے؟ کیا اس کے بعد اب زوال ہی زوال ہے؟ یہ سوال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے لگے ہیں۔ غرض حالات کچھ ایسے جمع ہوگئے ہیں جن میں لیگ کا مستقبل واقعی تشویش ناک نظر آتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لیگ کے لئے آزمائش کا وقت خلافِ توقع بہت جلد آگیا ہے اور اس کے پہلے مرحلے میں مسلم لیگ نے اپنی طاقت کا کچھ اچھا ثبوت

نہیں دیا ہے۔

لیگ کے مخالف علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ لیگ جی حضوریوں اور جاہ پرستوں کی جماعت ہے اس میں نوابوں اور خطاب یافتہ لوگوں کا غلبہ ہے۔ اس کے سب کام سرکار کے اشارے پر ہوتے ہیں۔ جب کانگریس کو زک دینے کے لئے سرکار کو لیگ کو طاقتور رکھنے کی ضرورت تھی اس وقت تک لیگ میں خوب زندگی اور جوش و خروش تھا لیکن جب سرکار کو اس کی ضرورت نہیں رہی لیگ بھی ٹیں ٹیں فش ہوگئی۔ پاکستان کا مطالبہ اور لیگ ——— یہ صرف کانگریس کو منہ چڑھانے کی ترکیبیں تھیں ورنہ چند سر پھرے لوگوں کو چھوڑ کر، لیگ کے باقی تمام معزز رہنماؤں کو اس خرافات سے کیا مطلب۔ یہ سرکار پرست لوگ ٹھیرے۔ سرکار کا جدھر رُخ ہو وہی ان کا پاکستان ہے۔ پاکستان کے مطالبے کے لئے دل گردے کی ضرورت ہے یہاں تو ریڑھ کی ہڈی ہی سرے سے غائب ہے۔ سر سے پیر تک بلبلا گوشت اور بادی کا موٹاپا ہے۔ ان میں تو لچک ہی لچک ہے۔ یہ تو ایسی قلابازیاں کھا سکتے ہیں کہ بڑے بڑے نٹ ان کے کارنامے دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں۔ یہ بے چارے سرکار کی ٹیڑھی نظر کی کیا تاب لائیں گے ان کا عشق پھولوں کی سیج پر ہوتا ہے۔ اس کا اظہار سخن شناس قدردانوں کی محفلوں یا ڈنر کی میزوں پر غیر ملکی زبان کی خطابت و صحافت کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مجنوں کی صحرانوردی فرہاد کی تیشہ زنی۔ سلاسل و آہن اور زنجیر پا وغیرہ کو یہ آئین عشق اور آداب محبت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کا رقیب اگر اوچھے ہتھیاروں اور غیر پارلیمنٹری طریقوں پر اُتر آئے تو "استعفا میرا با حسرت و یاس" کہہ کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

پھبتی کے طور پر کہہ سکتے ہیں ؎

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

پاکستان کا مطالبہ جواں مردوں کو زیب دیتا ہے جو اس کے حاصل کرنے کے لئے جان و مال کی بازی لگانے کے لئے تیار ہوں۔ بوڑھے کھوسٹ جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور اپنی عمر بھر کی کمائی یا باپ دادا کی میراث کو سینے سے چپٹائے ہوئے ہیں یا جو سیاست کو بھی روپیہ کمانے کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ وہ کیا اس میدان میں کودنے کا حوصلہ کریں گے ابھی کیا ہے وائسرائے کو انگلستان سے لوٹ کر آنے دو جب وہ کانگریس سے مصالحت کے فیصلے کا باقاعدہ اعلان کریں۔ گے تو لیگ کی مقامی شاخوں میں جہاں سرکار پرست لوگوں کا غلبہ ہے پاکستان کے مطالبے کی جڑیں اس طرح کھوکھلی کی جائیں گی کہ مخلص رہنماؤں کو لیڈری کا پورا مزہ مل جائے گا۔

کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لیگ میں ایک دوسرا عنصر بھی آہستہ آہستہ نشو و نما پا رہا ہے جو لیگ کے پرانے رہنماؤں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوانوں چھوٹی حیثیت کے تاجروں، چھوٹی حیثیت کے زمینداروں اور دستکاروں اور خوش حال مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ دولت مندوں کا نہیں بلکہ بیدار اور باشعور عوام کا گروہ ہے۔ اس کے لئے سیاست، تفریحی مشغلہ یا بڑھاپے کا سہارا نہیں بلکہ عزت و آبرو کے ساتھ جینے اور مرنے کا سوال ہے۔ پاکستان اس کا روزہ اور نماز ہے۔ اس کی زبان و ادب ہے، اس کی تاریخ و تمدن ہے۔ اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہے اور اس کا کھانا اور پینا ہے۔ اس کی بے چین تمنائیں اظہار کی خواہش مند ہیں۔ اس کے بلند حوصلے میدان کی وسعت کے متلاشی ہیں۔ اس کی پوشیدہ طاقتیں مواقع کی منتظر ہیں۔ اس کو سرزمین وطن کی ضرورت ہے۔ اس کو اقتدار حکومت کی ضرورت ہے۔ اس کو آزادی اور خود مختاری چاہیئے۔ وہ اپنے من کی دنیا کو بنانا اور بسانا چاہتا ہے۔ وہ ہم آہنگی، یک دلی اور یک رنگی کو ڈھونڈتا ہے۔ اسے روز روز کے جھگڑوں

اور قضیوں سے نفرت ہے۔ وہ خود خوش رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" اس کا اصول ہے۔ تم اپنے گھر میں آزاد میں اپنے گھر میں آزاد ——— یہ اس کا مطالبہ ہے اور اپنے اس مطالبے میں وہ حق و انصاف کو اپنے ساتھ سمجھتا ہے۔

یہ عنصر موجود ہے۔ اس کو ترقی ہو رہی ہے۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن اس کی طاقت کتنی ہے۔ اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں اس کے بارے میں ابھی کوئی بات یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے پرانے رہنماؤں سے کئی جگہ ٹکر لی ہے۔ پنجاب، یو۔پی، بمبئی اور سندھ میں لیگ کے رہنماؤں کے اندر جو اختلافات رونما ہوئے ہمارے کمیونسٹ رفقا انھیں اسی عنصر کے ابھرنے کی کوشش پر محمول کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شوکت حیات خاں، غضنفر اللہ، قاضی عبدالحمید، جے، ایم، سید۔ اس نئے عنصر کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لاہور کے انگریزی اخبار "لائٹ" نے سرحد کی لیگی وزارت کی ناکامی کو مسلم لیگ کے نصب العین کی عدم مقبولیت پر محمول نہیں کیا، بلکہ اسے سرحد کے لیگی رہنماؤں کی ذاتی ناکامیابی پر محمول کیا ہے۔ بنگال میں عبدالہاشم صاحب سکریٹری بنگال پروونشل مسلم لیگ کو اس نئے میلان کا رہنما قرار دیا جاتا ہے ان بیانوں میں کس حد تک صداقت ہے اس کا کوئی قطعی ثبوت ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ پرانے رہنماؤں سے نئے رہنماؤں نے جو ٹکریں لی ہیں ان میں کسی جگہ بھی انھیں اتنی کامیابی نہیں مل سکی کہ وہ انھیں ان کی جگہ سے ہٹا سکتے اور اپنی مرضی کے مطابق کارروائی کر سکتے۔ ان کی تنظیم کی مضبوطی کی بھی کوئی شہادت ابھی تک فراہم نہیں ہوئی ہے۔ لاہور شہر میں لیگ کا جلاس منعقد کرانا بہت معمولی کام تھا۔ لیکن اس کام میں بھی کامیابی اور ناکامی کا ثبوت مسٹر جناح کے بیمار ہو جانے کی وجہ سے نہیں مل سکا ہے۔ آیندہ کے اسمبلیوں کے انتخابات سے شاید اس

کا کچھ پتہ چل سکے۔ لیکن صحیح آزمائش تو اس وقت ہوگی جب کسی مخالف حکمراں طاقت سے ٹکر لینے کے باوجود یہ اپنی تنظیم اور مقبولیت کو قائم رکھ سکیں گے سو اس کا وقت معلوم نہیں کب آئے۔ ان کی اضافہ پذیر اہمیت کا ایک ثبوت البتہ ملتا ہے اور وہ یہ کہ لیگ کے چوٹی کے رہنماؤں نے اس عنصر کے خیالات کی ترجمانی اپنی تقریروں اور تحریروں میں شروع کردی ہے لیکن اس ثبوت کی اہمیت کچھ زیادہ نہیں ہے کیونکہ زمانے کا رجحان ہی کچھ اس طرف ہے۔ حتیٰ کہ ایک کھرب کا منصوبہ بنانے والے سرمایہ دار بھی اپنے آپ کو اس رجحان کے اثرات سے آزاد نہیں رکھ سکے ہیں۔ اس لئے ان تمام باتوں کے پیش نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس عنصر کو اپنی اہمیت اور اپنے اثر و اقتدار اور اپنے پیرووں کی تعداد اور وفاداری کا ثبوت دینا ابھی باقی ہے۔

لیکن جہاں تک ان کے عزائم کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم ضرور گفتگو کرسکتے ہیں۔ کیونکہ پنجاب کی لیگ نے نومبر سنہ ۴۴ء میں اور بنگال کی لیگ نے اپریل سنہ ۴۵ء میں اپنے اپنے منشور شائع کئے ہیں۔ جن سے ان کے ارادوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

پنجاب کی مسلم لیگ کا ابتدا میں یونینسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد تھا اور دونوں مل کر صوبے کی حکومت کا کام سنبھالے ہوئے تھیں۔ پنجاب کے بہت سے مسلمان رہنما لیگ اور یونینسٹ پارٹی دونوں کے رکن تھے اور دونوں کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کے لئے دونوں کے ساتھ وفاداری کو نبھانا مشکل ہوگیا۔ یہ اتحاد ٹوٹا۔ کچھ مسلمان رہنما خالص یونینسٹ ہوگئے کچھ خالص لیگی۔ اکثریت یونینسٹ کی تھی اس لئے ان کی وزارت قائم رہی اور مسلم لیگ کو اسمبلی میں مخالف پارٹی کی حیثیت سے اپنی تنظیم کرنا پڑی۔ چنانچہ ان کے منشور میں یونینسٹ پارٹی کی مخالفت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ بنگال کی مسلم لیگ پارٹی کو چونکہ اس قسم کی کسی اندرونی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لئے ان کے منشور میں کسی دوسری

سیاسی پارٹی پر چوٹیں نہیں ہیں پنجاب کے منشور میں جزئیات اور تفصیلات بھی شامل ہیں لیکن بنگال کے منشور میں محض اصول بیان کر دئے گئے ہیں۔ پنجاب کا منشور طویل ہے اس میں کہیں کہیں ایک ہی بات کو کئی دفعہ دہرایا گیا ہے اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بنگال کا منشور نسبتاً مختصر ہے۔ منطقی ترتیب کے ساتھ اس میں نصب العین کو درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور تفصیلات اور جزئیات سے اجتناب کیا گیا ہے۔ پنجاب کا منشور نقش اول ہے اس لئے اس کے خیالات اور بیانات میں انضباط اور تنظیم کی کمی ہے۔ بنگال کا منشور نقش ثانی ہے اس لئے زیادہ منضبط اور محدود ہے۔ لیکن دونوں میں سب سے زیادہ اہم فرق یہ ہے کہ پنجاب کا منشور ایسے صوبے کے لئے تیار کیا گیا ہے جو سب سے آخر میں برطانیہ کی حکومت میں شامل ہوا جہاں جنگ جو نسلیں آباد ہیں۔ جہاں کی حکومت میں بہت زیادہ مطلق العنانی پائی جاتی ہے۔ جو فوجی بھرتی کا صوبہ ہے جہاں کے لوگ فوجی ہونے کی وجہ سے فوجی اطاعت اور وفاداری کے عادی ہیں اور جہاں اس اطاعت اور وفاداری کی معقول قیمت سرکار کی طرف سے ادا کی جاتی ہے۔ جہاں کے لوگ سرکار کے ساتھ صرف نمک حلالی کرنا جانتے ہیں۔ کیونکہ اس کا معاوضہ نقد کی صورت میں ملتا ہے اور باقی سب چیزوں کو مہمل اور خرافات سمجھتے ہیں۔ جہاں معاشی اور سیاسی میدان میں ہندو، مسلمان اور سکھ اس طرح مقابلہ کر رہے ہیں کہ کبھی سرکار ایک کو شہ دے کر آگے بڑھاتی ہے تو کبھی دوسرے کو۔ کبھی ایک کا زور کم کرتی ہے تو کبھی دوسرے کا اور طاقت کے اس توازن کو قائم رکھتے ہوئے اپنی مطلق العنان حکومت کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتی ہے۔ ایسے صوبے کے لئے جو منشور تیار کیا جائے گا اسے لازماً اس دوسرے صوبے سے مختلف ہونا چاہئے جہاں آزادی کی مختلف قسم کی تحریکیں آئینی تحریکوں سے لے کر دہشت انگیزی کی تحریک تک، ایک عرصے سے چل رہی ہیں

جہاں سرکار کا رعب اور ہیبت لوگوں کے دل سے نکل چکا ہے۔ جہاں کے لوگ عین اس وقت جب وہ ظاہری طور پر حکومت کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اپنے دل کے اندر دوسری وفاداریوں کو چھپائے رہتے ہیں۔

بہرحال دونوں منشوروں کے یہ اختلافات کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ بنیادی طور پر دونوں کے میلانات میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے جس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ برطانوی شہنشاہیت کی مخالفت اور اس کے اثر سے مکمل آزادی۔

۲۔ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور ان کی تحریک آزادی کے ساتھ ہمدردی و شراکت یعنی آزاد ہندوستان میں آزاد پاکستان کا نصب العین۔

۳۔ جمہوریت پسندی (یعنی شہری آزادی، عوام کو جواب دہی، عوام کے اقتدار اعلیٰ اور عوام کے مفاد میں حکومت)

۴۔ صنعتیت یعنی جدید طرز کی بڑے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی۔

۵۔ محنت کش عوام کے حقوق کا تحفظ۔

۶۔ مردوں، عورتوں، نابالغوں اور بالغوں سب کے لئے عام ابتدائی تعلیم اور فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم۔

۷۔ مفاد عامہ کے کاموں کی توسیع و ترقی۔

۸۔ معاشی وسائل کی ہمہ گیر ترقی خصوصاً زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعت وغیرہ کی ترقی۔

۹۔ سرکاری مالیات کی اصلاح تاکہ عوام پر محاصل کا بوجھ ہلکا کیا جاسکے اور عوام کے فائدہ کے لئے زیادہ روپیہ خرچ کیا جاسکے۔

۱۰۔ موجودہ انتظامات حکومت کی اصلاح تاکہ اس کے عہدہ دار عوام کی

فلاح و بہتری کو اپنا اول و آخر فریضہ سمجھنے لگیں۔

اس فہرست کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پروگرام میں مسلمانوں کے مخصوص مذہبی حقوق پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہے جتنا کہ ان کے شہری اور معاشی حقوق پر اور اس میں بھی توجہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رکھی گئی ہے بلکہ شمال مغربی اور شمال مشرقی پاکستان کی جتنی بھی آبادی ہے اس کے لئے بلا تفریق مذہب و نسل مشترکہ طور پر بہتر حالات پیدا کرنے کو نصب العین میں شامل کیا گیا ہے۔ ان علاقوں کی رہنمائی کو البتہ مسلمانوں کی کثرت تعداد کے پیش نظر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے اور ان کی تعلیمی اور معاشی پستی کا خیال کرتے ہوئے ان کے لئے کچھ تحفظات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بیت المال اور شریعت کا بھی ذکر آیا ہے لیکن وہ تبرکاً ہے ورنہ حقیقت میں دنیوی معاملات کو مذہب کی دخل اندازی سے الگ ہی رکھا گیا ہے۔

غرض ان منشوروں میں ترقی پسند غیر مسلم اور غیر لیگی عناصر اور محنت کش عوام کو مائل اور جذب کرنے کی خاصی صلاحیت موجود ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان کو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں عام طور پر مقبول بنانے کے لئے جس رہنمایانہ اہلیت اور اثر و نفوذ کی ضرورت ہے۔ وہ لیگ کے موجودہ رہنماؤں میں ہے یا نہیں۔ کانگریس کی کامیابی کا راز اس کے رہنماؤں کی قابلیت، ایثار، مستقل مزاجی، بیدار مغزی اور کثرت تعداد میں ہے۔ لیگ کو بھی اگر اسی پایہ کے رہنما خاصی کثیر تعداد میں مل گئے تو لیگ بھی ضرور پاکستانی علاقوں میں اپنے پروگرام کو ویسا ہی مقبول بنا سکے گی۔ جیسا کہ کانگریس ہندوستانی علاقوں میں اپنے پروگرام کو بنا چکی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے محض تمنا کرنا ہرگز کافی نہیں ہے بلکہ بہت جاں گسل اور صبر آزما محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔ کیا لیگ کو ایسے آدمی مل سکیں گے؟

ہمارا خون

یہ تباہی اور ہلاکت کا جنوں
یہ شکست و فتح کا مہلک فسوں
یہ مسلح فوجیوں کا طمطراق
یہ بلکتی ماؤں کا سوز فراق
آسماں سے موت کی یہ بارشیں
رات دن یہ قتل ہی کی سازشیں
یہ حصولِ برتری کے مشورے
اور یہ غارت گری کے منصوبے
یہ اچھوتی وضع کے آلاتِ جنگ
یہ تحیّر آفریں آلاتِ جنگ
کھیل ہے سارا ہمارے خون کا
ایک فوّارہ ہمارے خون کا !

اور وہ دورِ اماں، وہ عہدِ حسن
وہ تعیش کا سماں، وہ عہدِ امن
امن کی وہ برکتیں یادش بخیر
وہ سکوں، وہ راحتیں یادش بخیر
وہ ادب، وہ علم وہ تنقیدِ فن
وہ ثقافت، وہ سیاست وہ مدن

درسگاہوں میں علم و فن کا شعور
پھر معامل میں تجارب کا وہ زور
گفتگو وہ آرٹ پر، وہ ذکرِ شعر
وہ حسیں راتوں میں اکثر فکرِ شعر
شام کی وہ پر تکلف صحبتیں
وہ طرب خانوں کی رنگیں عشرتیں
برق پاروں کا وہ سیلِ بے کراں
شب کو بھی وہ روزِ روشن کا سماں
دل فریبی وہ تماشا گاہوں کی
دیدہ زیبی وہ تماشا گاہوں کی
گیت میں وہ لمبی تانوں کی بہار
رقص میں وہ ننگی رانوں کی بہار
مے کدوں میں وہ ہجومِ مرد و زن
وہ جمالِ ساقیانِ سیم تن
الغرض وہ عیش کی دنیا، وہ امن
جنگ سے پہلے جو قائم تھا، وہ امن

رنگ تھا کس چیز کا اُس امن میں؟
کیا ہمارا خون نہ تھا اس امن میں؟

اختر انصاری

حالات حاضرہ

کسی محفل سے لوگ اُٹھنے لگیں تو اس کی رونق جاتی رہتی ہے، چاہے محفل سپاہیوں یا سیاست دانوں کی کیوں نہ ہو۔ پریزیڈنٹ روز ولٹ سیاست دانوں کی محفل کے صدر تھے ان کے جانے سے محفل کا کچھ رنگ ہی بگڑ گیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سیاست کے جو مقاصد سب سے زیادہ نمایاں ہیں ان کی تشکیل کس حد تک پریزیڈنٹ روز ولٹ نے کی ہے اور کس حد تک دوسروں نے، لیکن ایٹلانٹک چارٹر انھیں کے خیالات کا عکس ہے اور جنگ کا اخلاقی پہلو بہت کمزور رہتا اگر ان کے خلوص نے اس میں ایک شان نہ پیدا کردی ہوتی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی صاف دلی اور بے تکلفی، مروّت اور صداقت نے جمہوری ملکوں کی بہت سی مشکلیں آسان کر دیں اور بہت سے لوگوں کو جن کی طبیعتیں مختلف یا مزاج تیز تھے ایسے اتحادِ عمل پر آمادہ کر لیا کہ جس میں ذاتی مصلحت کے علاوہ انسانیت کے مستقبل سے گہرا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اب جو پریزیڈنٹ روز ولٹ کی طرح سب کو سمجھانے اور سب کی پیٹھ ٹھونکنے والا کوئی نہیں رہ گیا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ اتفاق اور اتحاد پر بھی مخالفت کا گمان پیدا ہونا رہے، اور اتحادیوں کی سیاست میں یک جہتی کے باوجود اختلافات بڑھتے رہیں۔ اتحادیوں کی قوت اب اتنی ہے اور جرمنی اور جاپان کو اب انھوں نے اس طرح پچھاڑ لیا ہے کہ جنگ میں جلد اور پوری کامیابی ہونا یقینی ہو گیا ہے۔ لیکن دشمنوں کو شکست دینا بہرحال صرف ایک تمہید ہے۔ اس بین اقوامی نظام کی، جو جنگ کے بعد قائم ہوگا اور جس پر امن اور آسودگی کا مدار ہوگا۔ یہ نظام قائم نہ ہو سکا یا کافی مضبوط نہ ہوا تو جرمنی اور جاپان کی شکست کے علاوہ جنگ سے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اتحادیوں کے مقاصد بدل جائیں گے۔ پریزیڈنٹ روز ولٹ

کے جانشین پریزیڈنٹ ٹرومین نے یقین دلایا ہے کہ متحدہ ریاستوں کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور ہر طرح سے پریزیڈنٹ روزولٹ کی پیروی کریں گے۔ سان فرانسسکو میں جو بین اقوامی کانفرنس ہونے والی ہے وہ بھی ہوگی مگر ابھی یہ نہیں معلوم کہ پریزیڈنٹ ٹرومین میں مزاجوں کی گرمی دور کرنے اور مخالفوں کو جن بنیادی باتوں پر اتفاق ہوا انھیں واضح کرنے کی وہ خاص قابلیت ہے یا نہیں جس نے پریزیڈنٹ روزولٹ کو ممتاز اور ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ ممکن ہے کانفرنس میں اختلافات بہت زیادہ نمایاں ہوجائیں، ہر فریق اپنی رائے کو مبالغے کے ساتھ بیان کرے، اور کوئی ایسا موقع شناس مدبر موجود نہ ہو جو وقت پر سب کو سمجھا سکے کہ اختلافات کے مقابلے میں ان مسائل کی اہمیت بہت زیادہ ہے جن پر وہ متفق ہیں۔ کانفرنس میں برطانوی سلطنت کے تمام ارا کین شریک ہوں گے، روس نے مطالبہ کیا ہے کہ روسی وفاق کے دو ارا کین کو بھی جداگانہ نمائندگی دی جائے، اور اس مطالبے کو منظور کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ روس نے اس کا بھی مطالبہ کیا ہے کہ لبلن کی قومی کمیٹی یعنی پولستان کی اس حکومت کو جو روس کی سرپرستی میں قائم ہوئی ہے کانفرنس میں شرکت کا حق دیا جائے۔ مگر اتحادیوں نے ابھی اس حکومت کو حقدار تسلیم نہیں کیا ہے۔ روسی حکومت کے اس اعلان سے کہ کانفرنس میں اس کے وزیر خارجہ مسٹر مولوتوف شریک نہ ہوں گے لوگوں کے دلوں میں بہت سے اندیشے پیدا ہوگئے ہیں، روس کے دونوں مطالبے منظور نہ کئے گئے تو ممکن ہے وہ کانفرنس میں صرف تماشائی بن کر جائے۔ بحث میں حصہ لے اور بحث کے نتیجے سے بے تعلق رہے۔ اتحادیوں سے مل کر جو انتظام کیا جا سکے گا اس کے علاوہ روس نے اپنی حفاظت کے لئے الگ تدبیریں بھی کی ہیں۔ چکوسلواکیہ، فن لینڈ، پولینڈ اور ابھی حال میں یوگوسلاویہ سے اس کے الگ معاہدے ہوچکے ہیں۔ ایسے ہی معاہدے وہ رومانیہ اور بلغاریہ سے بھی کرے گا، اور ممکن ہے ترکی بھی اس معاہدے کی جگہ جسے روس نے ابھی ایک مہینہ ہوا منسوخ قرار دیا

تھا ایک نیا اور روس کے لئے بہتر معاہدہ کرنے پر مجبور ہو۔ کانفرنس میں ان دو فریقی معاہدوں پر بہت زیادہ اعتراض کیا گیا۔ یا دوسری ریاستوں نے ایسے معاہدے کرنے کا حق محفوظ رکھا تو کانفرنس بین اقوامی امن کے لئے کچھ بہت مفید ثابت نہ ہوگی۔

جنگ کا نقشہ بہت تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ اتحادی اور روسی فوجیں وسط جرمنی میں بہت جلد مل جائیں گی اور پھر صرف مدافعت کے چند مورچوں کو فتح کرنے کا خیال رہ جائے گا۔ ان میں سے ایک برلن ہوگا۔ دو چار شمالی جرمنی میں ہوں گے سب سے اہم ڈنمارک اور ناروے اور جنوبی جرمنی اور مغربی آسٹریا کے مورچے ہوں گے۔ ناروے میں جرمنوں نے اپنی ساری بحری قوت یک جا کرلی ہے اور فوجی قوت کا بیشتر حصہ جنوبی جرمنی اور مغربی آسٹریا کے مورچے میں جمع کیا گیا ہوگا۔ اس مورچے کے وجود پر پہلے شک کیا جاسکتا تھا، اب یہ دیکھتے ہوئے کہ جرمن وسط جرمنی میں اتحادی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں مگر جنوب مغربی جرمنی میں بہت جم کر لڑ رہے ہیں اس کا یقین ہوگیا ہے کہ وہ آخری مقابلہ یہیں پر کریں گے۔ ناروے بھی آبدوزوں کے لئے بہت موزوں ہے۔ اور آبدوزوں سے اتحادیوں کو جو خطرہ تھا وہ کچھ بہت کم نہیں ہوا ہے۔ اس لئے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ لڑائی کو کب ختم کیا جائے یا ختم سمجھا جائے۔ نازی پارٹی ہتھیار نہیں ڈالے گی، اس نے اپنے آدمیوں کو حکومت سے الگ کرلیا ہے، اور اس طرح اتحادی جن علاقوں پر قبضہ کر چکے ہیں یا آئندہ کریں گے ان کو دشمن کے حوالے کرنے کا الزام نازی پارٹی پر نہ آئے گا، اور وہ ان لوگوں کو جو اتحادیوں کی فرماں برداری کریں گے غدار کہہ کر قتل کرنے کی تدبیریں کرتی رہے گی۔ اتحادی یہ دیکھ کر کہ جرمنی کے بیشتر حصہ پر ان کا قبضہ ہوگیا ہے یا یہ کہہ کر کہ اب کوئی بڑی اور باضابطہ فوج میدان میں نہیں ہے اس کا اعلان کردیں کہ لڑائی ختم ہوگئی ہے تب بھی نازی لڑائی کو جاری رکھیں گے، اور اتحادیوں نے اپنے اعلان پر اعتبار کیا اور فوج اور جنگ کے سامان کے

بڑے حصے کو جرمنی سے ہٹا لیا تو نازیوں کو فساد کرنے کا بہت اچھا موقع مل جائے گا۔ جنرل آئزن ہاوئر نے پریزیڈنٹ روزولٹ کو ایک خط میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی تھی اور یہ کہا تھا کہ غالباً جنگ کو باضابطہ طریقے پر ختم کرنے کی نوبت نہ آئے گی اور ہمیں مناسب موقع پر اس کا اعلان کرنا ہوگا کہ وہ ختم ہو گئی ہے۔ لوگ اب جنگ سے اس قدر عاجز آگئے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ لڑائی ختم ہونے کا اعلان جلد سے جلد کر دیا جائے لیکن دوسری طرف اس کا اندیشہ بھی ہے کہ یہ اعلان قبل از وقت کر دیا گیا تو جنگ کے انتظامات میں بڑی دشواری پیدا ہو جائے گی اور اس کا ختم ہونا محض فرضی ہوگا۔ اس وجہ سے بعض محتاط لوگ بہتر سمجھتے ہیں کہ اعلان ملتوی کیا جائے گا جب تک کہ اس کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ واقعی جرمنوں میں لڑنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ ابھی تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔

(۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء)

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

کی

چند مطبوعات

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
جغرافیہ اندلس	صہ ۸/	مقدمات مابعد الطبیعیات	عمر/	اشیائے تعمیر	عہ ۱۲/
مفتاح المنطق	معہ/	طریق اور تفکرات	عہ ۶/	اندلس کا تاریخی جغرافیہ	صہ ۸/
نصاب ذیلی ریاضی	بے ۸/	اخلاق نقوماجس	عا ۸/	تاریخ ہند (اول، دوم، سوم)	عا/
قدیم قانون	بے ۸/	تنبیہ والاشراف	عا ۲/	مرقات	عہ ۸/
قانون ٹامٹ	بے ۱۲/	قسطنطین اعظم	بے ۸/	افادیت	عہ ۸/
تاریخ یونان قدیم (چہارم)	صہ/	تاریخ فلسفہ اسلام	عا/	اصول دھرم شاستر	عہ ۸/
ڈوپلے اور کلایو	عہ ۱۲/	نظریہ سلطنت	للعہ/	تاریخ سیاست	عا/
ٹیموس تھینز	بے ۸/	اسلامی فن تعمیر	عہ ۱۲/	نجاری	عہ ۱۲/
بدھ مت ہند	عا ۴/	تاریخ انگلستان	بے ۱۰/	مفتاح الفلسفہ	عا ۴/
ویدک ہند	بے ۸/	اساس نفسیات	بے ۱۲/	نظریہ مبادلات خارجہ	صہ ۸/
مادھوجی سندھیا	عا	طبیعیات عملی	ے/	خصوصی قانون روما	للعہ/

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
فیدرس لائیسس اور پروطاغورس (افلاطون)	عا ۸/	کارہائے موریات ومثلثیات	عہ ۸/
شخصی قانون بین الاقوام	للعہ ۱۲/	کتاب الخراج وصنعت الکتابت	عہ ۱۲/
سیاسی تاریخ ہند (جلد اول)	عہ ۱۲/	اصول معاشیات (جلد اول)	لعہ ۱۲/
" " " (" دوم)	عا ۱۲/	" " " دوم	لعہ ۱۲/
خلاصہ طبقات الارض ہند	عہ ۱/	امپیریل گزیٹر آف انڈیا	عمر/
رولز آف انڈیا (لارڈ کلایو)	عہ	جمہوریہ روماں (جلد پنجم)	بے ۸/

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

سجّاد حیدر یلدرم

ہما خانم | سجاد حیدر یلدرم کا نام اردو ادب میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے مدتوں ان کے طرز نگارش کی تقلید کی گئی اور ان کی کتاب "خیالستان" کو پڑھا گیا اور سر دُھنا گیا۔

"ہما خانم" میر حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ ہے سجاد حیدر یلدرم کے قلم نے اس میں کچھ خوبیوں کا ذرا اضافہ کر دیا ہے حجازی کے بانکپن اور یلدرم کی شوخی نے ہما خانم کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ قیمت مجلد عہ

خیالستان	سے ر	جلال الدین خوارزم شاہ	عہ/۱	حکایات و احتساسات	عہ/
ثالث بالخیر	۸ ر	لیلیٰ مجنوں	۴ ر	جنگ و جدال	۱۲ ر
آسیب اُلفت	۱۲ ر	پُرانا خواب	۱۰ ر	زہرہ	۱۰ ر

پرانا خواب اور دیگر افسانے عہ

ماہ نو | ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور کے "شِشو" کا ترجمہ۔ از جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی

ٹیگور فطرتِ انسانی کا باکمال مصور ہے۔ خصوصاً بچوں کے حسیات اور اُن کے خیالات کی جیسی سچی تصویریں اس نے کھینچی ہیں وہ اور کہیں نظر نہ آئیں گی۔ عہ ر

گیتان جلی	عہ ر	میرا لڑکپن	عہ ر	خاموش حسن	عہ ر
کون کسی کا	عہ ر	پھول اور کلیاں	۱۲ ر	الجھن	عہ ر
کمودنی	عہ ر	چوکھیروالی	سے ر	———	

چند اور کتابیں

وقارِ حیات ۔ نواب وقار الملک کی سوانح عمری ۔ مصنفہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ۔ صہ ر

کارنامہ پہلوی ۔ رضا شاہ پہلوی کے حالاتِ زندگی اور مملکتِ ایران کی داستان از سید محمد حسن صاحب بلگرامی للعہ ر

مناجات و نصائح ۔ خواجہ عبداللہ انصاری کا فارسی کلام جو بیس سال زیر و رنگ میں نہایت خوشنما چھپا ہے۔ عہ ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲



مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم-اے

سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸/	بابتہ ماہ مئی ۴۵ء	جلد ۴۰ نمبر ۸

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن - محبوب المطابع پریس - دہلی

رسالہ جامعہ اور جامعہ کی جوبلی

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمر ۲۵ سال کی ہو جائے گی۔ اس لئے مجلس جامعہ ملیہ نے طے کیا ہے کہ مارچ ۱۹۴۶ء کی آخری تاریخوں میں جامعہ کی سلور جوبلی منائی جائے، اور اس جشن کے موقع پر جامعہ کے ہر فرد اور شعبے اور جامعہ کے ہر ہمدرد اور بہی خواہ سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ جامعہ کی وساطت سے قوم کی خدمت میں کسی نہ کسی شکل میں، اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق، کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرے۔

رسالہ جامعہ کے ادارے کی یہ خواہش ہے کہ رسالہ جامعہ بھی اس موقع پر کوئی تحفہ پیش کرے۔ ظاہر ہے

"برگ سبز است تحفۂ درویش"

کے مصداق پر، رسالہ جامعہ کا تحفہ مضامین ہی کی صورت میں پیش کیا جا سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان مضامین کی نوعیت کیا ہو اور انھیں کس طرح اور کس موقع پر شائع کیا جائے۔

جامعہ کی چونکہ ابتدا سے یہ دلی تمنا رہی ہے کہ وہ ملک و ملت کے لئے ایک اصلاح و ترقی کی تحریک بن سکے، اس لئے رسالہ جامعہ کے لئے یہ بات موزوں معلوم ہوتی ہے کہ وہ قومی اصلاح و ترقی کی مختلف تحریکوں ہی کو اپنے مضامین کا موضوع بنائے۔ لیکن اس کا کوئی محدود مفہوم اپنے ذہن میں نہ رکھے، بلکہ سیاست و معیشت، تمدن و تاریخ، فلسفۂ مذہب، اخلاق و معاشرت، شعر و ادب، علم و فن کی جملہ ان تحریکات کو جن کا بلاواسطہ یا بالواسطہ، قریبی یا بعید ہی کوئی تعلق قومی اصلاح و ترقی سے نکل سکتا ہو ان سب کا احاطہ کرے۔ دوسری قوموں اور ملتوں کی کامیابیوں سے شوق و ہمت کو ابھارے اور ان کی ناکامیوں سے عبرت و انتباہ حاصل کرے۔ قومی زندگی کے مختلف شعبوں کی

اصلاح و ترقی کے لئے لائق عمل منصوبے تجویز کرے۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب تدبیریں اور مشورے پیش کرے

یہ کام اتنا وسیع ہے کہ رسالہ جامعہ کے کسی ایک شمارہ میں اس کو انجام تک نہیں پہنچایا جاسکتا ہرچند رسالہ جامعہ کا ایک جوبلی نمبر نکالنے کا ارادہ ہے اور اس کی ضخامت کو بھی اتنا بڑھانے کا قصد ہے جتنا کاغذ کی موجودہ قحط سالی کے زمانے میں آسانی کے ساتھ ممکن ہے اور اس رسالے کو ہم اس ہی کام کے لئے مخصوص بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن رسالہ جامعہ کے سامنے جو مقصد ہے اس کی تکمیل کے لئے اس کا محض ایک شمارہ کافی نظر نہیں آتا۔ اس لئے طے کیا گیا ہے کہ یکم اپریل ۱۹۷۰ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء تک یعنی انعقاد جوبلی سے ایک سال قبل کے دوران میں جتنے رسالے مرتب کئے جائیں ان میں اس قسم کے مضامین کی نشر و اشاعت کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ چنانچہ اس مہینے سے اس سلسلے کے کچھ مضامین کا آغاز کیا جارہا ہے۔

لیکن رسالہ جامعہ اپنی اس خواہش میں کامیاب تب ہی ہو سکے گا جب اس کے قلمی معاونین اور قدردانوں کا حلقہ خاص طور پر اور ملک کے ارباب فکر و نظر اور اہل قلم حضرات عام طور پر اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سارے کام اب تک جمہور قوم کے تعاون اور سرپرستی سے انجام تک پہنچتے رہے ہیں۔ انھی کی حوصلہ افزائی کی اُمید پر رسالہ جامعہ نے بھی اس مشکل کام کو اپنے ذمے لیا ہے اور جس طرح ہمیں اپنے دوسرے کاموں میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی ہے ہمیں یقین ہے کہ اس کام میں بھی ہمیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

جامعہ کی تحریک

خدا کا شکر و احسان ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کرلے گی۔ صدی کا چوتھائی حصہ، عددی اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے اور فنا و بقا کی اس مسلسل جنگ میں جو ہر لمحہ جاری ہے اگر کوئی چیز اپنے وجود کو اتنی طویل مدت تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ بات بلاشبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا جائے۔ اگر حالات خاص طور پر نامساعد رہے ہوں اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ہر قدم پر نہایت سخت جد وجہد کرنا پڑی ہو اور عزم و ہمت، استقلال و استقامت کا ثبوت دینا پڑا ہو تو یہ بات اور بھی زیادہ خوشی کا موجب ہوسکتی ہے۔ پھر اگر وہ چیز جو باقی رہی ہو ایک ایسا قومی ادارہ ہو جس کے ساتھ ملک کے قابل ترین اور مخلص ترین بزرگوں اور رہناؤں کی تمنائیں اور مرادیں وابستہ رہی ہوں، جو مشترکہ جد وجہد، مشترکہ عزم و ہمت، مشترکہ استقلال و استقامت، مشترکہ ایثار و محبت کا خلاصہ و نتیجہ ہو تو اس کا قیام یقیناً ملکی اور قومی فتح و کامرانی کا نشان سمجھا جاسکتا ہے۔

۱۹۲۰ء میں قوم کے کچھ سربرآوردہ رہناؤں نے اس چیز کا ساتھ دینے کے لئے جسے وہ حق و انصاف سمجھتے تھے، ان قوتوں سے ٹکر لی جنھیں وہ نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کے کاموں میں شریک سمجھتے تھے۔ انھوں نے قوم کے نونہالوں سے اپیل کی کہ وہ اس جہاد حق میں ان کا ساتھ دیں۔ ان کے مقصد میں خلوص تھا، ان کی آواز میں اثر تھا۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس آواز پر لبیک کہی، ان کی تحریک نہایت زور شور سے چلی۔ کچھ عرصے کے لئے روپیہ، عزت، شہرت، سب چیزوں نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ جدھر جاتے تھے فاتحوں کی طرح ان کے جلوس نکالے جاتے تھے، لوگ پروانو

کی طرح ان پر نثار ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس وقت جیل جانے، سختی اُٹھانے، ظلم سہنے میں مزہ تھا۔ انتہاپسندی میں ایک نشہ تھا۔ امید کی شعاعوں سے دل منور تھے۔ کامیابی کی منزل سامنے نظر آتی تھی۔ لیکن یہ حالت زیادہ دن قائم نہیں رہی۔ واقعات نے پلٹا کھایا عوام میں تحریک کی مقبولیت کم ہونا شروع ہوئی۔ خانگی جھگڑے اور فسادات شروع ہوئے جو لوگ معبود بنے ہوئے تھے وہ مردود ہوگئے۔ چندے وصول ہونا بند ہوئے۔ گمنامی بلکہ بدنامی کا سلسلہ شروع ہوا۔ آبرو سنبھالنا مشکل ہوگئی۔ ایک بڑی تعداد نے جو کامیابی کے زمانے میں آگے آگے تھی۔ آزمائش کے زمانے میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا اور کھسکنا شروع کیا۔ بزرگ رہنما ذاتی اُلجھنوں اور پریشانیوں میں پھنس گئے یا ناوقت فوت ہوگئے۔ ذمے داری کا سارا بوجھ چھوٹوں کے کم زور اور ناتجربہ کار کاندھوں پر آن پڑا سخت نازک وقت تھا۔ انتہائی آزمائش کا موقع تھا، نہایت اہم اور نتیجہ خیز فیصلے کرنا تھے۔ انھیں ہر چیز کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا اور اپنے پورے طرز عمل کا سختی سے محاسبہ کرنا پڑا، انھیں فرع و اصل، عرض و جوہر، جسم و روح میں امتیاز کرنا پڑا، انھوں نے اصل، جوہر اور روح کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ لیکن فرع، عرض اور جسم میں ضرورت اور مصلحت کے مطابق قطع و برید کو جائز سمجھا بہر حال بنیادی معاملات میں اٹل رہے۔ سختیاں جھیلیں۔ تکلیفیں اُٹھائیں۔ اپنے کم اہل ساتھیوں کو عزت، شہرت اور دولت کے بلند ترین مرتبوں پر پہنچتے دیکھا۔ لیکن اپنے بزرگوں سے جو قول و قرار کیا تھا اور جو آخری فیصلہ کر چکے تھے۔ اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹے۔ وہ قوم کی آبرو کے امین تھے، وہ قوم کی آن کے نگہبان تھے۔ انھیں ایک محاذ پر کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ حکم دینے والے ختم ہوگئے تھے لیکن ان کی وصیت باقی تھی۔ وہ اپنے فرض کی ادائی سے منہ نہیں موڑ سکتے تھے وہ اپنا مورچہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ آندھیاں اُٹھیں، طوفان آئے، بجلیاں کوندیں زلزلوں نے زمین کو زیر و زبر کیا۔ اُن کی جمعیت کم ہوتی رہی۔ اُن کا گھر ویران ہوتا رہا۔

اپنی مادرِ علمی سے وہ بہت دور پھینک دے گئے۔ اُن کا آشیانہ تنکوں کا ایک ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اُنھوں نے ایک ایک تنکا پھر اٹھا لیا۔ دعوتِ مژگاں کے لئے دل صد پارہ کو پھر جمع کیا تو جوانوں نے جب ان کی طرف سے بے رُخی اختیار کی تو اُنھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کا دل لبھایا اور انھیں اپنے ساتھ ملایا۔ کالج میں طلبہ کم ہو گئے۔ اُنھوں نے اس کی تلافی ابتدائی مدرسہ قائم کرکے کی۔ تصنیف و تالیف اور اشاعت و فروخت کتب کا سلسلہ شروع کیا۔ تعلیم بالغان کی ابتدا کی لیکن قوم کے پیچھے پڑے رہے۔ ایک نغمہ کی طرف ذوق کی کمی دیکھی، دوسرا نغمہ شروع کیا۔ لیکن اپنے فرض سے نہیں ہٹے اپنا کہنا برابر جاری رکھا اور قوم کو اپنے حال کی طرف متوجہ رکھا۔ آخر آزمائش کا زمانہ بھی ختم ہوا۔ قوم نے غفلت برتنا ترک کی۔ دوست تو دوست دشمنوں نے خلوص و استقامت کا اعتراف کیا۔ ان لوگوں کو جنھوں نے خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں زندگی شروع کی تھی۔ زمینیں اور عالی شان عمارتیں ملیں اور الطاف و اکرام کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ غرض جامعہ ملیہ اسلامیہ، زندگی کے اس اٹل قانون کا ایک واضح اور بین ثبوت ہے کہ خلوص و استقامت کبھی رائگاں نہیں جاتے۔

لیکن صدی کا چوتھائی حصہ ایک بڑی طویل مدت ہوتی ہے۔ خصوصاً تیز رفتاری کے موجودہ دور میں جبکہ برسوں کی منزلیں گھنٹوں میں طے کی جانے لگی ہیں اور مقام و وقت کے فاصلے بہت زیادہ مختصر ہو گئے ہیں ۲۵ سال کی مدت کو ہرگز کم نہیں کہا جا سکتا۔ اس مدت میں دنیا کی دوسری قوموں اور دوسرے رہنماؤں نے جو زبردست کام انجام دئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جب ہم اپنے حقیر کاموں پر نظر ڈالتے ہیں تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے باہر کی دنیا میں صرف روس کے رہنماؤں اور اُن کے جانباز ساتھیوں کے کاموں کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ہمت و حوصلہ کے مالکوں نے ریگستانوں کو گلزار، ویرانوں کو شہر اور ایک پس ماندہ ملک کو صفِ اوّل کے صنعتی ملکوں میں تبدیل کر دیا۔ خود ہمارے ملک میں بھی ہمارے برادرانِ وطن کے بہت سے

ادارے ہیں جن کے کام ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ قابل تعریف رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے مطمئن اور قانع ہو جانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ہمیں آیندہ کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو شروع کرنا ہی۔ قوم نے جو اعتبار ہم پر کیا ہے اور جس توجہ اور عنایت کا ہمیں مستحق سمجھا ہے اس کا جواب ہمیں اس طرح دینا ہی کہ اپنی خامیوں کو جو ہم میں ابھی تک بہت زیادہ باقی ہیں دور کرنے کی انتہائی کوشش کریں۔ جامعہ کو جہاں اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کرنے کی خوشی ہے۔ وہاں اپنے کاموں کی کمی کا بھی زبردست احساس ہی۔ اس نے مارچ ۱۹۴۶ء میں جوبلی منانے کا فیصلہ کیا ہی۔ لیکن یہ فیصلہ محض خوشی کے جشن منعقد کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ پرانے کام کا جائزہ لینے اور نئے کام کا منصوبہ بنانے کے لئے ہے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے اس سلسلے میں جو اپیل شائع فرمائی ہی اس کے مندرجہ ذیل الفاظ خصوصیت کے ساتھ توجہ کے مستحق ہیں:-

"جامعہ کے قدیم طلبار، ہمدردان جامعہ اور وہ سب حضرات جو تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں جمع ہو کر جامعہ کے موجودہ اداروں اور شعبوں کا معائنہ کریں، ان کی اصلاح و ترقی کی تدبیریں بتائیں۔ اور ان کی ان تجویزوں پر جو جامعہ کے کام کی توسیع کے لئے پیش کی جا رہی ہیں غور فرمائیں۔ کچھ کام جو ہو رہے ہیں انھیں مکمل کیا جائے، اور کچھ جو کرنے ہیں انھیں شروع کیا جائے:-

اے خوشا وہ قوم مستقبل ہو جس کا شاندار
کل سے بہتر آج ہو اور آج سی بہتر ہو کل

مسلمانانِ ہند کی معاشی حالت کا جائزہ

(میں نے سنہ ۶۲ء اور سنہ ۶۳ء میں مسلمانانِ ہند کی معاشی حالت کا جائزہ لینے کے لئے ادارہ تحقیقات علی گڑھ، سہارنپور اور دہلی میں شروع کی تھی، جہاں مجھے کچھ سہولتیں حاصل تھیں۔ اس سلسلے میں میں نے کئی سوال نامے جاری کئے تھے جن کے جواب واقف کار حضرات سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی ان میں سے ایک سوال نامہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو برادریوں کی حالت سے متعلق ہے اس سوال نامے کے جوابات بہت سی برادریوں کے بارے میں حاصل کئے گئے تھے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر سوال نامے کے بعد اس جواب کو درج کر رہا ہوں جو دہلی کی لاہوری برادری کے بارے میں میرے رفیق کار مختار احمد صاحب جامعی نے نہایت محنت تحقیق اور ادیبانہ قابلیت کے ساتھ تیار کیا ہے مختار احمد صاحب کا اس برادری سے ذاتی تعلق ہے اور وہ اپنی برادری کی اصلاح و ترقی کا ایک درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

مسلم برادریوں کے بارے میں عام سوال نامہ

(الف)

۱۔ آپ کی برادری کی مختصر تاریخ، کس طرح ابتدا ہوئی۔ مختلف تاریخی دوروں میں کیا حالت رہی۔ خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے کن کن شہروں میں اس برادری کے لوگ بسے چلے آتے ہیں؟

۲۔ آپ کے شہر کے کن کن محلوں اور علاقوں میں آپ کی برادری کے لوگ آباد ہیں کون سے محلے پورے ان کے ہیں، کن میں اکثریت ہے۔ کن میں اقلیت میں ہیں۔ برادری کی

کوئی پنچایت یا انجمن وغیرہ ہے ؟

۳۔ برادری میں شادی بیاہ صرف آپس کے لوگوں میں ہوتا ہے یا برادری سے باہر بھی کرلیا جاتا ہے ؟

۴۔ محلوں اور گھروں کی صفائی کا کیسا انتظام ہے ؟

۵۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کی تندرستی کی کیا حالت ہے ؟

۶۔ مردوں اور عورتوں کی تعلیمی حالت کیسی ہے۔ ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ، فنی سب طرح کی تعلیم۔

۷۔ کسی قسم کی بری عادتیں تو عام طور پر نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً شراب نوشی، عیاشی جوا وغیرہ۔

۸۔ کون کون سے کاروبار اور پیشوں سے برادری کے لوگ زیادہ تر روزی حاصل کرتے ہیں اور ان کاموں میں زیادہ تر کے لوگ ...کے حصہ کی اہمیت کتنی ہے اور کیا تناسب ہے؟

۹۔ برادری کے لوگ کتنے مختلف درجوں کے سرکاری ملازم ہیں۔ آئی سی ایس۔ پی سی ایس۔ فوجی افسر۔ پولیس افسر۔ دوسری امپیریل اور پراونشل اور لوکل سروسز سیکریٹیریٹ۔ سوپیریر اور انفیریر سروس۔ جج۔ منصف۔ تحصیلدار وغیرہ کتنے وکیل ہیں۔ کتنے ڈاکٹر۔ انجینیر۔ پروفیسر۔ اہل علم۔ اہل تصنیف۔ اہل صحافت۔ کتنے میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ صوبہ اور مرکزی کونسل کے ممبر ہیں۔ کتنے سیاسی لیڈر ہیں۔ کس سیاسی پارٹی سے زیادہ تعلق ہے۔ کتنے اور کس قسم کے سرکاری خطاب یافتہ ہیں ؟

۱۰۔ پیدائش سے موت تک کی تمام تقریبوں پر، برادری کے مختلف حیثیت کے لوگوں کا اوسطاً کیا خرچ رہتا ہے ؟

۱۱۔ برادری کے مختلف حیثیت کے لوگوں کا خرچ اوسطاً مندرجہ ذیل چیزوں پر کیا رہتا ہے : کھانا، کپڑا، کرایہ مکان، سنگار کے سامان، زیور، مکان کے سازوسامان،

بچوں کی تعلیم، سواری، تفریح، خیر خیرات، چندہ، دعوت، ضیافت، مہمانداری، حج، زیارت، نذر و نیاز، عید بقر عید، ملازم، پہرے دار، خدمت گار وغیرہ، شکار، سینما، ناچ رنگ، خرید کتب و رسائل، تعمیر مسجد، مسافر خانہ، مدرسہ، کتب خانہ، فقیر و پیر پرستی، علماء پرستی، فن پروری، علم دوستی وغیرہ۔

(ب)

۱۲۔ برادری میں کتنے کروڑپتی ہیں؟ یعنی جن کی کل جائداد کی مالیت ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ ہے۔ ان کے نام مع پتہ اور کاروباری زندگی کی تاریخ، ان کی جائداد اور آمدنی کے بارے میں حسب ذیل تفصیلات :۔

(i) صحرائی جائداد کتنی اور کس قسم کی ہے، اس کی مالیت بصورتِ سرمایہ کیا ہے اور اس سے سالانہ خالص آمدنی کتنی حاصل ہوتی ہے؟

(ii) سکنائی جائداد کتنی اور کس قسم کی ہے۔ اس کی مالیت بصورت سرمایہ کیا ہے اور اس سے سالانہ خالص آمدنی کتنی حاصل ہوتی ہے؟

(iii) فیکٹری یا کارخانے کتنے اور کس کس قسم کے ہیں۔ ان کی زمین، عمارت، مشین اور سامان میں اور روزمرہ کے کام چلانے کے لئے کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اور اس سے سالانہ خالص منافع کتنا ہے؟

(iv) تجارتی کوٹھیاں اور دکانیں کتنی اور کس قسم کی ہیں۔ ان کے سامان میں کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے اور ان سے کتنا سالانہ خالص منافع ہے؟

(v) کتنا روپیہ لوگوں یا فرموں کو قرض دے رکھا ہے یا ان سے واجب الوصول ہے یا بنکوں میں جمع کر رکھا ہے اور اس سے کتنا سود ملتا ہے؟

(vi) کمپنیوں کے حصّوں اور تمسکات میں، سرکاری تمسکات وغیرہ میں کتنا روپیہ لگا ہوا ہے۔ اس سے سالانہ آمدنی ؟۔

(vii) کس کس قسم کے ٹھیکے لے رکھے ہیں۔ ان میں کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے، اور سالانہ آمدنی کتنی ہوتی ہے؟

(viii) سرمایہ اور کن کن دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے اور ان سے کتنی آمدنی ہوتی ہے؟

(ix) مینیجنگ ایجنٹ، یا ڈائرکٹر کمپنی یا منیجر یا سرکاری یا نجی ملازم یا دلال ہونے کی حیثیت سے کتنی تنخواہ، فیس یا کمیشن سالانہ مل جاتا ہے؟

(x) کوئی دوسرا مسلسل یا غیر مسلسل ذریعہ آمدنی ہے یا نہیں ہے؟

(xi) کتنا قرضہ دوسرے لوگوں، بنکوں، فرموں، وغیرہ کا واجب الادا ہے اور اس کا سالانہ سود کتنا ہوتا ہے؟

(xii) سونا، چاندی، گنّی اشرفی، ہیرے، جواہرات اور ان کی مالیت

(xiii) موٹر اور دوسری سواریاں، اور اُن کی مالیت

(xiv) قیمتی پوشاکیں اور ان کی مالیت

(xv) مکان کا ساز و سامان یعنی سونے، چاندی، تانبے، پیتل، چینی شیشے تام چینی اور مٹی کے چھوٹے بڑے برتن۔ دری، فرش، گدّے، گاؤ تکیے، جانمازیں، قالین غالیچے۔ پردے، جھاڑ، فانوس، بجلی کے سامان، میز، کرسی، صوفے، غسل خانے اور سنگار کے سامان گھڑیاں، گھنٹے، تصویریں۔ صناعی کے جملہ نوادرات۔ قلمی اور نادر کتابیں۔ آلاتِ موسیقی، ہتھیار، بندوق وغیرہ اور ان سب کی مالیت

۱۳- برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان ہے۔ ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۴- برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۱۰ لاکھ اور ۵۰ لاکھ کے درمیان ہے ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۵۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ایک لاکھ اور ۱۰ لاکھ کے درمیان ہے۔ ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۶۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۵۰ ہزار اور ۱ لاکھ کے درمیان ہے۔ ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۷۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۱۰ ہزار سے ۵۰ ہزار کے درمیان ہے ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۸۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ایک ہزار اور ۱۰ ہزار کے درمیان ہے ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

(۱۹) برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ایک ہزار سے کم ہے اور ان کے گذر اوقات کے ذرائع کی تفصیل۔

(ج)

۲۰۔ برادری کے مختلف طبقوں میں سرمایۂ دولت اور آمدنی میں ترقی ہو رہی ہے یا تنزل ہو رہا ہے۔ یا حالت بدستور ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ کون سے نئے کام ہاتھ میں آ رہے ہیں۔ کون سے ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ کیا نئے حالات پیدا ہوگئے ہیں۔ کن لوگوں سے مقابلہ ہے وغیرہ۔

۲۱۔ کاروبار کے چلانے کے لئے اگر روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے کون پورا کرتا ہے بنک، ساہوکار یا برادری کے خوش حال لوگ۔

۲۲۔ (۱) تھوک کام اور آڑت کا کام عام طور پر برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے یا غیر لوگوں کے، تھوک تاجروں یا آڑتیوں کی روپے کے لئے وقتی ضرورت کو کون پورا کرتا ہے۔ مثلاً ایک تھوک تاجر نے جہاز سے مال خریدا۔ مال کا بیجک بنک کی معرفت آیا۔ تو کیا بنک تھوک فروش کو روپیہ قرض دے کر اس کے دام ادا کرتا اور مال کو اپنے گودام

میں منگوا کر رکھ لیتا ہے اور جب تھوک فروش سہولت کے ساتھ دام ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے، مال اس کے حوالے کر دیتا ہے یا تھوک فروش کو فوراً سب روپیہ خود ہی فراہم اور ادا کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر کیا شرح سود ادا کرنا پڑتی ہے ؟

(۲) برادری کے جو لوگ خوردہ فروشی کا کام کرتے ہیں ان کو فوراً پورے دام تھوک آڑتیہ کو ادا کرنا ہوتے ہیں یا وہ انھیں موقع دیتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اُسے دام ادا کر دیں، شرح سود کیا ہوتی ہے ؟

(۳) برادری کے جو لوگ صنعتوں کو بڑے یا متوسط یا چھوٹے پیمانے پر چلا رہے ہیں یا چلانا چاہتے ہیں۔ انھیں سرمایے کی فراہمی میں تو دقت نہیں ہوتی اور عام شرح سود کیا رہتی ہے ؟

دلّی کی لاہوری برادری

تعارف :-

دلّی میں ہنرمندوں کی ایک جماعت ہے جو ایک چھوٹی سی برادری کی شکل میں ہے او
اس کا نام " لاہوری برادری " ہے۔ اسی برادری کے لوگ سینکڑوں برس سے صنعت و
حرفت کی بہت سی شاخوں میں باکمال کاری گر رہے ہیں اور جیسا کہ آگے کے بیان سے
معلوم ہوگا۔ ہندوستان میں مغلوں کے پرشوکت زمانے کی فنّی ترقیوں اور شاندار صنعتی
کارناموں میں اس برادری کے لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالات کی تبدیلی نے اس برادری
کی صنعتی شہرت کا اب خاتمہ کر دیا ہے لیکن جڑاؤ زیور بنانے کی مشہور نفیس صنعت اب بھی
اس برادری میں موجود ہے اور اس کے زیادہ تر لوگ اسی کام کو اختیار کئے
ہوئے ہیں جڑاؤ زیور بنانے کے کام کو سادہ کاری کہتے ہیں۔ سادہ کاری جیسی بڑی
اور اہم صنعت کے تعلق کی وجہ سے بعض لوگ اسے سادہ کار برادری کہتے ہیں۔ لیکن
اس برادری کا صحیح نام لاہوری برادری ہے۔ چنانچہ ہم اُسے اسی نام سے پکاریں گے۔

لاہوری کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں

لاہوری کے لفظ سے اتنا تو ثابت ہے کہ دہلی میں یہ لوگ لاہور سے آئے،
لیکن ہماری پہنچ کسی ایسی تاریخ یا قدیم تذکرے تک نہیں ہو سکی
جس میں ان لوگوں کی اصل اور خاندان کے بارے میں کوئی صراحت کی گئی ہو۔ خود
لاہوری بزرگوں سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ اُن کے مختلف بیانوں کو ملانے سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عراق سے مغلوں کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان آئے
اس بیان کی تصدیق اسلامی تاریخ سے ہوتی ہے۔ خلافتِ عباسیہ کے عہد میں
مسلمانوں کی علمی اور صنعتی ترقی اعلیٰ درجے پر تھی۔ خلافت کی سرپرستی سے اسلامی دنیا

کے اچھے عالم اور ہنرمند بغداد میں جمع تھے۔

لاہوریوں کا قدیم مرکز بغداد

عباسیہ کے زوال کے بعد بغداد کی علمی اور فنی مرکزیت ختم ہوگئی۔ سب اہل کمال منتشر ہوگئے، چنانچہ مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی تمدنی ترقی کی شہرت سے کچھ اہل کمال ہندوستان آئے اُنھوں نے ملتان اور لاہور میں، کہ یہ شہر اس زمانے میں تمدن کے بڑے مرکزوں میں تھے۔ قیام کیا۔ لاہوری برادری کے بزرگوں نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ صنّاعوں کی وہ جماعت جو عراق سے ہندوستان آئی۔ کسی ایک برادری کی شکل میں نہیں تھی۔

لاہوری کوئی ایک برادری نہ رکھتے تھے ہندوستان میں آنے کا زمانہ

مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے لوگ تھے سترھویں صدی کے شروع میں جب لاہور جہانگیر کا پایۂ تخت بنا تو یہ لوگ ایک مرکز پر آگئے اور ان میں میل جول بڑھ گیا۔ یہ سب کے سب کسی ایک پیشے کے نہیں تھے۔ لیکن صنعت سب میں ایک مشترک چیز تھی، یعنی ان میں مصور، مرصع کار، مُہرکن، لوہار، نجّار، معمار، مہندس سب پیشوں کے آدمی تھے اس لئے ایک صنعت پیشہ برادری کا بن جانا قدرتی بات تھی۔

لاہوری برادری کا بننا

اس طرح عراق کے صنّاعوں کا یہ قافلہ جس میں عرب، شام عراق، مصر، ایران، سبھی قومیت کے آدمی رہے ہوں گے، لاہور پہنچ کر ایک برادری بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کا نام لاہوری برادری نہ تھا۔ جہاں گیر کے عہد حکومت تک یہ ہنرمند پیشہ برادری لاہور میں ہندوستان کی تمدنی ترقی کا عنصر بنی رہی۔

لاہوری برادری دہلی کو

۱۶۳۸ء میں جب شاہ جہاں نے دہلی کو دار الخلافہ بنایا تو صناعوں کی یہ چھوٹی سی نئی آبادی لاہور سے دہلی منتقل ہوگئی۔ چراغ کہیں ہو، پروانے ساتھ رہتے ہیں۔

لاہوری برادری کی وجہ تسمیہ کافی عرصے تک یہ برادری لاہور میں رہ چکی تھی اور اسے حق تھا کہ دہلی پہنچ کر وہ اپنے آپ کو لاہوری کہتی، لیکن ہمارا خیال ہے کہ پہلے پہل دہلی کے قدیم باشندوں نے نووارد جماعت کو لاہوری کہہ کر پکارا ہوگا اور جیسے تیموری، ترک ہندوستان والوں کے دئے ہوئے خطاب مغل پر راضی ہوگئے، یہ لوگ بھی لاہوری نام پر راضی ہوگئے۔ یہاں تک کہ برادری کا نام بھی لاہوری رکھ لیا۔ یہ نام پھر اس برادری کا طرۂ امتیاز اور اظہار فخر کا ایک وسیلہ بن گیا۔ آج بھی برادری کے لوگ اپنے سوا دہلی کی اور برادریوں کی کسی رسم، کسی وضع، کسی بات پر نام دھرنا چاہتے ہیں تو یہ کہتے ہیں "ہندوستانیوں کی ہے"۔ پنجاب کے لوگ اب بھی دہلی اور یوپی والوں کو 'ہندوستانی' کہتے ہیں۔ معلوم نہیں لاہوری برادری کی زبان پر لفظ 'ہندوستانی' کا یہ استعمال لاہور میں کچھ برس قیام کا اثر ہے یا یہ لوگ عراق سے آکر اپنے آپ کو ولایتی اور دوسروں کو ہندوستانی کہتے تھے؟

دہلی میں لاہوریوں کی ابتدائی بستی لاہوری برادری دلی میں آکر معاشرتی ضرورتوں کے اعتبار سے شہر کے مختلف حصوں میں بس گئی۔ دارالخلافہ بن جانے کی وجہ سے شہر میں عمارتوں کی نئی طرح ڈالی جارہی تھی، جامع مسجد، قلعہ اور مختلف سرکاری عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ ان تعمیرات کے نگراں لاہوری برادری کے استادانِ فن تھے۔ اس لئے ماہرینِ تعمیرات جدید حصۂ شہر میں تھے۔ جوہری، سادہ کار، مصور، شہر کے مرکز میں رہتے تھے۔ خانم کا بازار جو جامع مسجد کے قریب تھا اور سوتی بازار لاہوریوں کے خاص صنعتی مرکز تھے۔ لاہوریوں کی ابتدائی بستی فتح پوری کے قریب تھی۔ آج بھی اس گلی میں جو باغ دیوار سے ورے ہے میونسپل کمیٹی کا بورڈ لگا ہے: "لاہوریوں کی گلی"؛ لیکن وہاں اب کوئی لاہوری نہیں رہتا۔

مغلوں کی شاندار عمارتوں کے معمار لاہوری تھے دنیا کی سب سے حسین عمارت تاج، دلی کے

لال قلعے اور نادر روزگار جامع مسجد کے مہندس اور معمار اعلیٰ استا احمد[1] لاہوری اور استا حامد لاہوری تھے۔ احمد اور حامد کے بارے میں مشہور ہے کہ دونوں بھائی تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ استا حامد کا نام لاہوری برادری میں جامع مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں بار بار آتا ہے تاریخ میں ان کا ذکر مجمل ملتا ہے۔ علمیت اور خاندان کی تفصیل نہیں ملتی۔ [illegible] جامع مسجد کے شمال رُخ رہٹ کے کنوئیں کی گلی سے آگے کوچہ [illegible] تک ہے۔ اس گلی میں سب گھر لاہوری برادری کہتے ہیں۔

لاہوریوں کے قدیم مہندس اور معمار خاندان: استا حامد | استا احمد کا حال تفصیل سے [illegible] بن یوسف ابن حسین ابن عبداللطیف ہے۔ [illegible] کے بڑے عالم، مہندس اور ماہر تعمیرات تھے۔ صرف ان کے نام کے ساتھ [illegible] شاہجہانی' لکھا ہوا ملتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ انھیں سرکاری تعلق اور خصوصیت حاصل تھی۔ ان کے تین بیٹے تھے جو علم و ہنر میں باپ کی طرح نامور تھے۔

عطاء اللہ رشیدی | (۱) عطاء اللہ رشیدی۔ فن تعمیر کے ماہر اور ریاضی کے عالم تھے دو کتابیں اُن سے یادگار ہیں۔ الجبرا اور خلاصۃ الحساب۔

لطف اللہ مہندس | (۲) لطف اللہ۔ یہ بھی مہندس تھے۔ شاعر تھے اور پیشے کی مناسبت سے مہندس تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان شعر ان کی تصانیف سے ہے۔ دیوان سے بہت سی کارآمد تاریخی معلومات ملتی ہے۔

---

[1] دلی میں خصوصاً لاہوری برادری میں اُستا احمد اور استا حامد کہتے ہیں یعنی استاد کی دال نہیں بولتے اور حامد کے میم پر زبر دیتے ہیں۔ استاد میں سے د کا حذف فارسی قاعدے سے جائز ہے لیکن حامد میں میم پر زبر دلی والوں کی تراش ہے۔ صحیح تلفظ کے مطابق حامِد کہئے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ دلی والے نہیں ہیں۔

مولانا نور اللہ | یہ خطاط تھے ، جامع مسجد کی محرابوں کے اوپر خط ریحان میں کتابت کی عبارت انھی کے بے مثال پاکیزہ خط کا نمونہ ہے۔ مولانا نور اللہ کا مزار پریڈ گراؤنڈ دہلی میں لال قلعہ کے قریب ہے۔ اور ان کے بائیں ان کے گرامی قدر صاحب زادے حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادیؒ کا مزار ہے۔ شاہ کلیم اللہؒ فقر و طریقت میں جو پایہ رکھتے ہیں وہی رتبہ ظاہری علم میں حاصل ہے۔ بہت سی اعلیٰ درجے کی علمی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ شاہ کلیم اللہ ثابت کرتے ہیں کہ لاہوری برادری نے جو نام ہنرمندی اور صناعی میں حاصل کیا ہے وہی درجہ اس کے بزرگوں نے علم ظاہر و باطن میں حاصل کیا ہے۔

لاہوری برادری کے اس طلائی سلسلے کی دو کڑیاں اور ہیں ، یہ استا حامد کے پوتے اور لطف اللہ کے پوتے ہیں۔

۱۔ امام الدین ریاضی | یہ مہندس اور ریاضی داں تھے۔ علم ریاضی پر کئی کتابیں ان سے یادگار ہیں۔

۲۔ خیر اللہ مہندس | خیر اللہ ، ماہر فلکیات اور مہندس تھے۔ راجہ جے پال سنگھ والی جے پور نے ان کی مہندسی میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی اور اس کا نام زیچ محمد شاہی رکھا۔ یہ رصدگاہ شکستہ حالت میں نئی دہلی میں اب بھی موجود ہے اور جنتر منتر کے نام سے مشہور ہے۔

لاہور کی صنعتیں

ہیرا تراشی ، منبت کاری ، مرصع کاری ، مصوری ، مُہر کنی ، خطاطی ، نقاشی یہ سب فن تعمیر کی متعلقہ صنعتیں یا تمدن کے بلند تر فنون ہیں۔ شخصی حکومت کے زمانے میں شاہی سرپرستی سے یہ صنعتیں پھلتی پھولتی ہیں ، لازماً ان کے ماہرین کے لئے سازگار فضا قلعے اور امرا کے محل ہوتے ہیں۔ ان صنعتوں کے ماہرین سب لاہوری برادری کے افراد تھے ، نقاشی ، خطاطی ، مصوری ، منبت کاری کے کچھ دھندلے نقوش دلّی کے لال قلعے میں اب تک مل سکے

ہیں۔ فولادسازی کے سلسلے میں دلّی کے لاہوری کاری گروں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی تھی ان کی شمشیر سازی کے نمونے اب بھی عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ جواہرات اور زیورات کے کام میں لاہوریوں کی نادرہ کاری اور نفاستِ ذوق کی گواہی اُمرا کے محلات شاید اب تک دے سکیں گے۔ مصوری میں پچھلی صدی کی لٹی کھُٹی دلّی کے یگانۂ روزگار محمد فضل مصور کا ذکر اب تک لاہوری برادری والے کرتے ہیں کہ اُن کی قلم ایک لاکھ روپے کی مشہور تھی۔ اسی زمانے کے بدرالدین مُہرکن کے چرچے اب تک شہروں میں ہیں جو ہیرا تراشی اور مہرکنی میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ دلی میں اُن کے لاہوری شاگرد مُہرکنوں کا سلسلہ اب تک چلا جاتا ہے اور استاد کے نام کو عزت دیتا ہے۔

موجودہ لاہوریوں کا حال | یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دلّی کی وہ برادری جو اتنا شان دار تاریخی پس منظر رکھتی ہے، اب کس حال میں ہے۔ ہم اس کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

تعداد

لاہوریوں کی آخری مردم شماری برادری کے انتظام کے ماتحت ۱۹۳۳ء میں کی گئی تھی۔ اس کی اطلاع کے مطابق لاہوریوں کی کل تعداد بیس ہزار ہے۔ اس میں سے ۲۵۰۰ افراد کاروبار کے سلسلے میں باہر کے شہروں میں ہیں اور ۱۷۵۰۰ افراد دہلی میں ہیں۔

بیرونجات کے ان شہروں میں لاہوری برادری کے لوگ ہیں:۔

ریاستیں:۔ الور۔ اودے پور۔ بھوپال۔ جے پور۔ حیدر آباد دکن۔ رامپور۔

پنجاب:۔ امرتسر۔ انبالہ۔ جالندھر، شملہ، لاہور۔

یوپی:۔ الہ آباد۔ علی گڑھ۔ فیروزآباد۔ لکھنؤ۔

دیگر:۔ بمبئی۔ مرشد آباد۔ کلکتہ۔ رنگون۔

دہلی سے باہر گئے ہوئے لاہوریوں کا حال | لاہوریوں کے بعض گھرانے مذکورہ بالا شہروں میں

مستقل طور پر بس گئے ہیں۔ انھوں نے وہیں رشتہ داریاں کرلی ہیں۔ کچھ گھرانے ایسے ہیں جو تجارت کے سلسلے میں ہر سال دہلی آتے ہیں اور رشتہ داری کا زیادہ تر تعلق دہلی میں رکھتے ہیں۔ ریاستوں میں صرف الور اور رامپور کا تعلق سرکاری ہے الور کا تعلق زیادہ قدیم ہے۔ مشہور لاہوری شمشیر ساز خاندان الور سرکار سے متعلق ہے۔ الور والے لاہوری سب سے زیادہ بااثر ہیں۔ وہ لاہوری شرع کے سخت پابند ہیں۔ ہمیشہ مرکز سے متعلق رہتے ہیں اور بیاہ شادی کا تعلق دہلی میں برادری کے سوا کہیں نہیں کرتے۔

دہلی میں لاہوری محلے | دہلی میں لاہوریوں کے کم و بیش ۳۵۰ گھر ہیں۔ جو عموماً ان محلوں اور علاقوں میں ہیں:-

بارہ دری شیر افگن (دہلی ماران) باڑہ ہندو راو۔ بتاشوں والی گلی۔ پہاڑی املی، پہاڑ گنج تراہا بیرم خاں۔ چوڑی والان حویلی اعظم خاں۔ رہٹ کا کنواں۔ کٹرہ شیخ چاند۔ کشمیری دروازہ۔ کوچہ استا حامد۔ کوچہ پنڈت۔ کوچہ رائے مان۔ کوچہ میر عاشق کوچہ نٹواں۔ گلی امام۔ گلی برنا۔ گلی میر جملہ۔ مسجد تہور خاں۔ ملیا محل ——— جن علاقوں میں لاہوریوں کے ایک دو گھر ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہی محلے اور علاقے لکھے گئے ہیں جن میں لاہوریوں کے گھر کثرت سے ہیں۔ ان میں بھی کوچہ استا حامد۔ کوچہ رائے مان کوچہ نٹواں بشیش محل۔ صدر بازار اور پہاڑ گنج کے کئی بڑے محلے لاہوریوں کے خاص مرکز ہیں۔ لاہوریوں کے صنعتی کارخانے انھی محلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ زیورات کے کچھ خاص اور نامی کاری گروں کے ٹھکانے چاندنی چوک اور دریبہ کلاں اور موتی بازار کے مرکزوں پر ہیں۔ کیونکہ زیورات کی تجارت کا مرکز شہر کا یہی حصہ ہے۔

لاہوریوں کی تمدنی حالت

رسمیں | مولوی سید احمد کی تالیف رسوم دہلی میں جو شادی غمی کی بے شمار ہندوانہ رسمیں دلی کے مسلمانوں میں جاری دکھائی گئی ہیں ان میں سے تھوڑی بہت لاہوریوں میں برتی جاتی ہیں

مثلاً بری - دہیز - (جہیز) کھانا - پینڈیاں - چوتھی - منگنی اور تہواروں پر بہت خرچیلا لین دین - چھٹی - ختنہ - گھوڑچڑھی - بسم اللہ - روزہ کی یہ رسمیں کبھی کبھی برتی جاتی ہیں - غمی میں پھول - جمعرات - چالیسواں - برسی کی رسمیں بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

لباس | لباس میں انگرکھا، دوپلی ٹوپی، تنگ، مہری یا ایک برکا پاجامہ کبھی کا ختم ہوا۔ کبھی پرانی وضعداری کا پابند لاہوری یوں نظر آجاتا ہے جیسے پت جھڑ کے بعد درخت پر کوئی سوکھا زرد پتہ بچ رہے - کچھ برسوں پہلے سیدھا پاجامہ، نازک تراش کا کرتا، صدری اور ترکی ٹوپی لاہوریوں کا نشان تھی - ترکی ٹوپی کچھ باقی ہے - ورنہ نوجوان اب ہمہ رنگ فیشن برتتے ہیں - ہر چیز پر ایک تیز رو تمدن کی اضطراری حالت طاری ہے۔ سچ یہ ہے آج کی دنیا میں جہاں حالات بجلی کی تیزی سے بدلتے ہیں - تمدن میں استقلال یا گہرائی کی تلاش مایوس کن ہے - پھر بھی لاہوریوں کے اوسط طبقے کے گھروں میں سادگی اور خوش سلیقگی دیکھنے میں آتی ہے۔

تفریحات | لاہوری تفریحات کے بہت دلدادہ ہیں - آئے دن سیر و شکار کی تقریبیں دیکھئے - ناچ رنگ کی محفلیں جم رہی ہیں، پتنگ بازی، پیراکی، گلی ڈنڈا، چوسر، شطرنج کبڈی کے میچ ہو رہے ہیں - شب برات کے سلسلے میں بائیسویں کے میلے پر آتش بازی میں کمال فن کے مظاہرے - عرس، قوالیاں، بسنت، پھول والوں کی سیر، سترھویں ان سب میلوں میں لاہوری نوجوان پیش پیش ہیں۔

صناعوں کا ایک خاص تہوار | ان سب کے علاوہ آخری بدھ کی تقریب خاص ہے جو دلی کے مزدوروں اور صناعوں کا جشن بہار معلوم ہوتا ہے لطف یہ کہ یہ کوئی تہوار قومی یا مذہبی نہیں، دلی کے سب کاری گر اور صنعتی طبقے اس دن چھٹی کرتے ہیں - پھولوں اور مٹھائیوں کے تحفے کاری گروں کو ملتے ہیں - اس طرح یہ خالص مزدوروں کا 'تہوار' بن جاتا ہے۔ آخری بدھ کی رنگینی اس سے ظاہر ہے کہ یہ رسم مزدوروں سے گذر کر امراء اور قلعے تک جا پہنچی

تھی ـــــ غالب کا وہ قطعہ ملاحظہ ہو جس کا پہلا شعر ہے

ہے چہار شنبہ آخر ماہ صفر، چلو ـــــ رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے، مشک بو کی ناند !

برسات میں باغوں کی سیریں، گرمی میں فالیز کی سیر۔ غرض زندہ دلی کے ہر مظاہرے کی روح رواں لاہوری رہے کبھی جب وقت ساز گار تھا یہ ادائیں بری نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ وقت بدل گیا لیکن لاہوری اپنی تفریحات میں نہ بدلے۔ انھوں نے اس سے قومی نقصان اُٹھایا، لیکن وقت کا زبردست دھارا جو ہر خشک و تر کو بہا لے جاتا ہے انھیں اور مہلت نہ دے سکتا تھا، انجام کار خوش دلی اور زائد بے فکری اقتصادی بدحالی اور افسردگی سے بدل گئی۔

زبان | زبان کے معاملے میں لاہوریوں کے کئی طبقے ہیں۔ ادنیٰ طبقہ جو پیتل اور چاندی کے بہت معمولی کارخانوں میں لگا ہوا ہے۔ اکثر وہ زبان بولتا ہے جسے دلّی کی کرخنداری بولی کہتے ہیں۔ لیکن یہ لحاظ رکھا جائے کہ جب سے جہل و افلاس بڑھتا گیا اور لاہوریوں نے اپنے صنعت گھروں میں دلّی کے بہت ادنیٰ طبقے کو شاگردی میں داخل کیا تو نہ صرف زبان متاثر ہوئی بلکہ اخلاق بھی بگڑ گئے۔ کارخانوں کی زبان بلکہ پورا ماحول کہیں کہیں ایسا ہو گیا جیسا رندوں اور اوباشوں کے تکیوں کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کی ذمہ دار تعلیم کی کمی ہے۔ پھر بھی لاہوری برادری کا کاریگر دلّی کی دوسری برادریوں کے کاریگر کے مقابلے میں سنبھلی ہوئی زبان استعمال کرتا ہے، یعنی صرف چند لفظوں کی بگڑی ہوئی یا پرانی صورت استعمال کرتا ہے۔ مثلاً جلدی کو زلدی، سرہانے کو سریانے اُس کے بجائے دِس یا دِن۔ کہاں کے لئے کیاں (بہ کسر کاف و اعلان ی) ہے کے لئے ہے گا، کسی، آگے۔ پیچھے کو کسو، آگو، پیچھو بولتا ہے۔ لاہوریوں کا اوسط اور اعلیٰ طبقہ ٹکسالی اور شستہ زبان بولتا ہے۔ عورتوں کی زبان بھی اسی طرح مختلف ہے۔ کسی گھر میں قدیم اور متروک الفاظ کی کثرت سے دلی دکنی کے زمانے کا سماں بندھ

جاتا ہے۔ سبزی منڈی کے لاہوری گھروں کے عورتیں ارائیوں کی ہم سائیگی کے اثر سے "عورتیں آئی تھیں" کو "عورتاں آئیاں تھیاں" بولتی ہیں —— لیکن بعض گھروں میں الفاظ کی شستگی اور سلاست اور لہجے کی پاکیزگی سے غالب کے خطوط کی بے ساختہ تحریر یاد آجاتی ہے۔

لاہوری برادری۔ لاہوری قوم

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لاہوری لوگ ایک آدھ موقع کے سوا اپنے لئے کبھی برادری کا لفظ استعمال نہیں کرتے بلکہ قوم کہتے ہیں یعنی لاہوریوں کی قوم یا قوم لاہوریاں اس لئے راقم سطور بھی اب کہیں کہیں اسے قوم کے نام سے پکارے گا۔

قدیم پنچایتی نظام | لاہوری قوم میں شروع سے پنچایتی نظام چلا آیا ہے۔ لاہوریوں کے کسی بھی جھگڑے کے لئے پنچ فیصلہ ناطق فیصلہ ہوتا تھا۔ قوم کا چودھری جو حکم دیتا اس سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ دو گھروں میں شادی کا رشتہ تجویز ہوتا تو چودھری سے اس کی منظوری لینی ضروری تھی۔ دونوں گھروں کی حالت دیکھ کر زیور، کپڑے، مہر، جہیز اور دعوت ولیمہ کی مقدار وہ خود مقرر کرتا تھا جس میں شرعی احکام کی پوری رعایت رکھی جاتی تھی۔ سب سے بڑا چودھری قوم میں ایک ہوتا تھا جو قوم کی بڑی پنچایت کا حاکم ہوتا اور چھوٹے چودھری کے فیصلوں کی اپیل اس کے ہاں کی جا سکتی تھی۔ یہ چھوٹے چودھری معمولی جھگڑوں کا فیصلہ خود لوگوں کے گھر پہنچ کر چکا دیا کرتے۔ یوں محلے میں اُن کی حیثیت ہر گھر کے سرپرست کی ہوتی تھی۔

پنچایتی نظام کا ٹوٹ جانا | یہ پنچایتی نظام اب صرف روایتاً باقی ہے اور قوم میں لائق چودھری موجود ہیں۔ لیکن اُن کے پاس قانون نہیں ہے نہ اُن کے فیصلوں میں نفاذ کی طاقت ہے نہ وہ کسی لاہوری پر قومی یا اخلاقی قانون توڑنے پر قوم کی طرف سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ پہلے غیر قوم میں رشتہ کرنے کی بڑی مناہی تھی۔ لیکن اب نہ صرف دوسری قوم کی

بیٹی لا سکتے ہیں۔ بلکہ لاہوری بیٹی دوسری قوم کو دی جا سکتی ہے، گو ایسا کرنے پر قوم کے لوگ اپنے بن لکھے قانون کی خلاف ورزی کا احساس کرتے ہیں اور اُسے معیوب خیال کرتے ہیں اب کوئی لاہوری اپنی بیوی سے بدسلوکی کرے یا بلا وجہ اُسے نہ بسائے تو چودھری میں یہ طاقت نہیں ہے کہ قوم کی طرف سے وہ اُسے کوئی اخلاقی سزا دے سکے

پنچائتی نظام کا یوں بکھر جانا لاہوری قوم کی شدید زبوں حالی اور انتشار کو ظاہر کرتا ہے

تعلیم لاہوریوں کے علم و فن کا کمال، شخصی بادشاہت کی قدردانی سے جتنا محروم ہوتا گیا اتنا ہی ان کا علمی ذوق کم ہوتا گیا۔ آخر میں وہ اسی تعلیمی نظام کے پابند ہو گئے جو دلی میں رائج تھا۔ وہ پابندی سے بچوں کو قرآن حفظ یا کم از کم ناظرہ پڑھاتے اور فارسی کے دو ایک ابتدائی رسالے پڑھا کر تعلیم ختم کرا دیتے۔ لکھنا اُن کی پڑھائی کا دوسرا حصہ نہیں تھا۔ یہی انداز لڑکیوں کی تعلیم کا تھا جس کی ذمہ دار ماں یا گھر کی کوئی اور بڑی ہوتی تھی۔ لیکن آج کل یہ نظام تعلیم بھی باقی نہیں ہے۔ لاہوریوں کے بعض طبقوں میں صرف قرآن ناظرہ پڑھانے کی پابندی مذہبی اہمیت کے پیش نظر جاری رہی ہے۔ کہیں قرآن کے ساتھ اسکولی تعلیم کا رواج بھی ہوتا جاتا ہے۔ لیکن افلاس کی وجہ سے اور اکثر اس لئے کہ اسکول کی تعلیم کے نتائج سرپرست کو صنعتی پیشے کے لئے نہ صرف غیر مفید بلکہ مُضر نظر آتے ہیں، وہ بچوں کو اسکول کی پوری تعلیم بھی نہیں دلواتا۔ لیکن چونکہ پیشے میں آگے چل کر تعلیم کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے اس لئے برادری کا ایک حصہ کام چلانے کے لئے تھوڑا سا لکھنا پڑھنا سیکھ لیتا ہے۔ ذیل کے تخمینی اعداد و شمار سے لاہوری برادری کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہو سکے گا:

دوسری جماعت کا معیار	پانچویں جماعت کا معیار	میٹرک یا مساوی معیار	کالج کے درجے
۴۰ فی صدی	۲۰ فی صدی	۱ فی صدی	۱ر فی صدی

صرف قرآن	بالکل بے پڑھے لکھے
۷۰ فی صدی	۱۸ فی صدی

لاہور برادری کی عورتیں عورتوں کو اس تخمینے میں شامل نہیں کیا گیا ہے اندازہ یہ ہے کہ ستّر فی صدی لڑکیاں مکتب میں یا گھریلو طور پر پورا یا کم قرآن پڑھ لیتی ہیں۔ دس فی صدی لڑکیاں قرآن کے ساتھ معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتی ہیں۔ پانچ فی صدی لڑکیاں اسکول جاتی ہیں اور عموماً پانچویں درجے تک پڑھتی ہیں۔ ۲۵ فی صدی لڑکیاں کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کرتیں جہاں تک تربیت سلیقے اور ہنر مندی کا تعلق ہے لاہوری برادری کی عورتیں مستثنیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں اکثر سینے پرونے کاڑھنے اور گھریلو ہنر مندیوں میں اتنی ہی اچھی ہیں جتنا صنعتی کاموں میں اُن کے مرد۔ پکانے، ریندھنے میں دلّی کی دوسری برادریوں میں لاہوری عورتوں کا لوہا مانا جاتا ہے۔ راقم سطور کی معلومات کے مطابق لاہوری برادری کی عورتیں کھانا پکانے کے ہنر میں شاید سارے ہندوستان کی عورتوں سے آگے ہیں اور ہماری یہ رائے مسلسل ذاتی ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے کہ کھانے پینے کے معاملے میں لاہوریوں کا مبالغہ پسند ذوق ان کے اقتصادی زوال کا بہت بڑا سبب ہے۔

اقتصادی حالت

لاہوری خوش حال نہیں ہیں | لاہوری برادری کو خوش حال نہیں کہا جا سکتا۔ اس برادری کا دولت مند ہونا تو مشکل ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر اس کا تعلق مزدور طبقے سے ہے صنعت اس کے ہاتھ میں ہے لیکن اس صنعت کا تجارتی فائدہ جو دولت مندی کے لئے لازمی ہے اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تاہم صنعتیں، جس میں زیور سازی کی صنعت سب سے نمایاں ہے۔ مالی اعتبار سے اُسے مطمئن ضرور کر سکتی ہیں لیکن یہ برادری مطمئن بھی نہیں ہے اسباب کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ یہاں ہم کچھ سرسری اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جن سے مجموعی طور پر برادری کی مالیات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور تین خانگی میزانیے (فیملی بجٹ) دیتے ہیں جس سے انفرادی حالت سامنے آسکے گی۔

عام مالی حالت

(۱) لاہوری برادری میں کسی کی مالی حیثیت دس لاکھ سے زیادہ کی نہیں ہے۔

(۲) ۱ لاکھ اور ۱۰ لاکھ کے درمیان ۲۰ افراد

(۳) ۵۰ ہزار اور ۱ لاکھ کے درمیان ۴۰ ״

(۴) ۱۰ ہزار اور ۵۰ ہزار کے درمیان ۵۰۰ ״

(۵) ۱ ہزار اور ۱۰ ہزار کے درمیان ۵۰۰۰ ״

مختلف مدات میں برادری کے لگے ہوئے مجموعی سرمایہ کا تناسب

کم از کم دس ہزار کی حیثیت کے آدمی کو دولت مند مان کر مختلف مدات میں برادری کی مجموعی دولت کے صرف کا تناسب حسب ذیل ہے۔

صحرائی جائداد	۵	فی صد	روپیہ	لگا	ہوا ہے
شہری جائداد (مکان، دکان)	۵۵	״	״	״	״
کارخانے (برادری کے مختلف پیشے)	۱۰	״	״	״	״
ملوں کے حصے اور سرکاری قرضے	...		...		...
سودی کاروبار	...		...		...
زیور، نقد، قیمتی کپڑے اور دیگر اشیاء	۲۰	فی صد	روپیہ	لگا	ہوا ہے
مکان کا سامان۔ فرنیچر، برتن	۱۰	״	״	״	״
موٹر، سواری	...		...		...

(باقی)

مختار احمد صاحب جامعی

حکومتِ ہند کی طرف سے صنعتی پالیسی کا اعلان

جنگ کے بعد حکومتِ ہند کی صنعتی پالیسی کیا ہوگی - اس بات کو معلوم کرنے کے لئے وہ لوگ بہت منتظر تھے جو جنگ کے بعد نئی صنعتوں کو جاری کرنے اور پرانی صنعتوں کو وسعت دینے یا قائم رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ واضح الفاظ میں اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کردے۔ چنانچہ حکومت ہند نے ۲۲ اپریل کو ایک اعلان شایع کیا ہے۔ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے حکومتِ ہند نے اپنی صنعتی پالیسی کے بارے میں اعلان شایع کرنے کے وجوہ کو بیان کیا ہے۔ یہ دو ہیں۔ اول یہ کہ حکومت کی عام پالیسی کا صنعتی ترقی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ منصوبہ بندی ترقی کرکے اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ مربوط اور ہم آہنگ ترقی کے لئے کچھ صنعتوں کا مرکزی نگرانی کے ماتحت لایا جانا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔

جن صنعتوں کو مرکزی نگرانی کے ماتحت لانا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔ لوہا اور فولاد۔ انجن سازی۔ موٹر۔ ٹریکٹر اور ٹرک۔ ہوائی جہاز، جہاز سازی اور جہاز رانی سے متعلق انجن سازی بجلی کی مشین، وزنی مشینیں۔ مثلاً کپڑے، شکر، کاغذ، کان کنی، سمنٹ اور کیمیاوی اشیاء تیار کرنے والی مشینیں، مشین بنانے کے اوزار، وزنی اور ہلکی کیمیاوی اشیا، کیمیاوی رنگ کھاد اور دوائیں، کیمیاوی برقی صنعت۔ روئی اور اون کے کپڑے، سمنٹ، قوت محرکہ کے طور پر استعمال ہونے والے الکوحل، شکر۔ موٹر کے لئے اور ہوا بازی کے لئے ایندھن، ربڑ سازی، غیر آہنی دھاتوں کی صنعت۔ بجلی کی قوت۔ کوئلہ، ریڈیو کی مشین سازی۔

۲۔ موجودہ دستور ہند میں اگرچہ صنعتی ترقی کا کام صوبوں کی حکومت کو سپرد کیا گیا

ہے لیکن حکومت ہند کو مفاد عامہ اور مصلحت ملکی کے پیش نظر اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے قانون بنائے جن کے ذریعے بعض خاص صنعتوں کی ترقی کا کام اس کے ہاتھ میں آجائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک قانون، مرکزی مجلس قانون ساز میں جلد ہی منظور کرایا جائے گا لیکن یہ قانون زیادہ دن کے لئے نہیں ہوگا بلکہ جب تک موجودہ دستور باقی رہے گا اس وقت تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہے گا۔

۴۔ سرکار کے نزدیک صنعتی ترقی کے حسب ذیل تین بنیادی مقصد ہوں گے:۔

(۱) ملک کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے کر ملک کی دولت کو بڑھانا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مادی اور انسانی وسائل خاصی بڑی مقدار میں موجود ہیں جن سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ اس لئے حکومت کی پالیسی یہ ہوگی کہ ان سے پورا پورا اور موثر ترین فائدہ اٹھایا جائے۔

(۲) ملک کو مدافعت کے لئے زیادہ بہتر طریقے پر تیار کرنا۔ گذشتہ دو جنگوں کے تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مدافعت کے لئے جو اشیاء اہمیت رکھتی ہیں ان کی فراہمی کے لئے دوسرے ملکوں پر انحصار کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

(۳) روزگار اور مصروفیت کا ایک بلند تر اور زیادہ مستحکم معیار حاصل کرنا۔ موجودہ زمانے میں صنعتی پیشہ سے لوگوں کو مقابلتہً بہت کم روزگار ملتا ہے لیکن جب ملک کے صنعتی وسائل کو زیادہ سے زیادہ امکانی ترقی دی جائے گی تو صنعتی پیشوں نیز اس کے ضمنی اور امدادی پیشوں اور علمی خدمتوں کے ذریعے ملک میں بہت سے لوگ روزگار سے لگ جائیں گے

حکومت کی اس پالیسی سے یہ بات ایک بدیہی حقیقت کے طور پر اخذ کی جاسکتی ہے کہ صنعتی ترقی کی وجہ سے جو زائد دولت پیدا ہوگی اس کی تقسیم کا کام بھی منصفانہ بنیاد پر کیا جائے گا۔

حکومت کا خیال ہے کہ جنگ کے بعد جو حالات پیدا ہوں گے ان میں حکومت ہند کی موجودہ پالیسی سے مابعد جنگ کی ترقیات کا کام نہیں لیا جاسکے گا۔ اگرچہ ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ہندوستان کی حالت زیادہ مستحکم ہوگی لیکن پھر بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان کی حیثیت ادنےٰ تر ہوگی۔ دوسرے ملکوں میں مشین کی بہت زبردست ترقی ہوگئی ہے۔ اور موجودہ جنگ کی نوعیت کی وجہ سے ماہر صنعتی مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اگر ہندوستان کو بھی بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرنا ہے تو یہ لازمی ہے کہ ہندوستان بھی زور شور کے ساتھ اور مسلسل کوشش کرے اور اس کام میں سرکاری اور نجی صنعتیں دونوں حصہ لیں۔

اس لئے حکومت نے آیندہ کے لئے صنعتوں کی زیادہ سے زیادہ امکانی ترقی اور ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اور ان صنعتوں کی ترقی کو خصوصیت کے ساتھ اہم سمجھتی ہے جن پر موجودہ صنعتی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت، وزنی مشینیں بنانے والی صنعت، مشین سازی کے اوزار بنانے والی صنعت، وزنی کیمیاوی صنعت وغیرہ۔

اگرچہ ان صنعتوں کی ترقی کو بہت زیادہ ترجیح دی جائے گی لیکن پھر بھی توازن کو قائم رکھا جائے گا اور استعمال کی چیزوں کو بھی ترقی کے پروگرام میں ان کی مناسب جگہ دی جائے گی۔

ظاہر ہے اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہوگی جب نجی صنعت کا پورا اشتراک عمل حاصل ہوگا۔ اس لئے اس اشتراک کے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

(۲) صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے محاصل درآمد و برآمد کی ایسی پالیسی مقرر کرنے پر بھی غور کیا جارہا ہے جو مابعد جنگ کی ضروریات اور حالات کے مطابق ہو، جو صنعتیں جنگ کے زمانے میں قائم ہوئی ہیں یا جنھیں اس زمانے میں ترقی دی گئی ہے ان کی حالت بھی توجہ

کی محتاج ہے۔ ان میں سے کچھ کو سنہ ۱۹۴۵ء کے اعلان کے ذریعے اطمینان دلایا جاچکا ہے کہ جنگ کے بعد ان کی حفاظت کی جائے گی۔ لیکن ان کے علاوہ دوسری صنعتوں نے بھی اس غیر معمولی زمانے میں قومی معیشت کو سہارا دینے میں بہت حصہ لیا ہے۔

عبوری زمانے میں ایسی صنعتوں کی امداد یا حفاظت جنھیں تندرست بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے فوری اہمیت اختیار کرلے گی۔ حکومت بلا توقف ان صنعتوں کی امداد یا حفاظت کے بارے میں تحقیقات کرنے کا انتظام کرنے والی ہے۔ یہ چھوٹی مدت کی کارروائی ہوگی۔ اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک محصول درآمد دبرآمد کے سلسلے میں زیادہ لانبی مدت کی پالیسی نہیں بن جائے گی۔

(۶) حکومتِ ہند نے صنعتوں کے انتظام و انصرام کے بارے میں حسب ذیل فیصلے کئے ہیں:-

(الف) فوجی سامان تیار کرنے والے کارخانے، مفادِ عامہ کی صنعتیں اور ریلیں اس وقت بھی حکومتِ ہند کی ملکیت اور انتظام میں ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ جہاں تک ہوسکے گا بڑی مقدار میں بجلی کی فراہمی کی صنعت کو بھی حکومت ہی کے ہاتھ میں رکھا جائے گا۔

(ب) ان کے علاوہ بنیادی صنعتیں جنھیں قومی اہمیت حاصل ہے جیسے جہاز، موٹر اور ٹریکٹر، کیمیاوی اشیا، لوہا اور فولاد، انجن مشین بنانے کے اوزار، بجلی کی مشینیں وغیرہ تیار کرنے والی صنعتیں، انھیں بھی قومی ملکیت میں لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان کے لئے نجی سرمایہ کافی مقدار میں فراہم نہ ہوتا ہو اور ان کی ترقی کو ملکی مفاد میں ضروری سمجھا جائے۔

(ج) حکومت ایسی صنعتوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے جن میں نفع کے مقابلے میں محصول کا عنصر زیادہ غالب نظر آتا ہے اور حکومت کو ان صنعتوں کو ہاتھ میں

لینا آسان اور ضروری نظر آتا ہے۔ پچھلے زمانے میں اس کی مثال میں نمک کی صنعت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

(د) باقی تمام صنعتوں کو نجی ہاتھوں میں رہنے دیا جائے گا۔ لیکن ان پر حکومت کی طرف سے بھی نگرانی قائم رہے گی۔ جس کے مدارج مختلف ہوں گے جو صنعتیں ایسی ہوں گی جو معمولی استعمال کی چیزیں تیار کرتی ہوں گی اور جن میں آزاد مقابلہ جاری ہوگا ان پر تو صرف اتنی نگرانی رکھی جائے گی جتنی کہ مزدوروں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرانے کے لئے ضروری سمجھی جائے گی۔ لیکن جو صنعتیں ایسی ہوں گی جن کی نوعیت نیم اجارہ کی سی ہوگی یا جن کے قبضہ و تصرف میں ایسے صنعتی وسائل ہوں گے جن کی رسد قلیل ہے تو ان پر زیادہ کڑی نگرانی رکھی جائے گی۔ رہا معاملہ کوئلہ کا تو اس کے بارے میں علیحدہ طور پر غور اور فیصلہ کیا جائے گا۔

(ہ) اوپر کی فہرست میں جن صنعتوں کو حکومت کے ہاتھ میں رکھنا جائز قرار دیا گیا ہے ان کے بارے میں اس سوال کا تصفیہ کہ آیا موجودہ کارخانوں پر جن کی ملکیت اس وقت نجی افراد کے ہاتھ میں ہے حکومت کو قبضہ کرلینا چاہیے یا نہیں، ہر انفرادی صنعت کے مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔

(و) قومی لحاظ سے اہمیت رکھنے والی کچھ ایسی صنعتیں بھی ہیں۔ مثلاً جہاز سازی کی صنعت اور ریل کے انجن اور بائلر بنانے کی صنعت جنھیں سرکار اور نجی سرمایہ دار دونوں کے ہاتھ میں رکھا جاسکتا ہے۔

(ز) جو صنعتیں سرکار کے ہاتھ میں ہوں گی اُن کا انتظام عام طور پر تو حکومت خود کرے گی۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محدود مدت کے لئے حکومت ان کا انتظام کسی نجی ایجنسی یا پبلک کمپنی کے حوالے کردے۔ اس میں مصلحت یہ ہوگی کہ ان کمپنیوں کے ذریعے حکومت انتظامی تجربہ حاصل کرے۔

۶۔ صنعتوں کی امداد دینے کے لئے حکومتِ ہند نے حسب ذیل تجویزیں پیش کی ہیں:۔

(الف) ملک میں صنعتی ترقی کی بنیاد رکھنے کے لئے حکومتِ ہند اپنی ذمے داری کو اس طرح پورا کرے گی کہ

(۱) معدنی وسائل کے ایک بہت اچھے جائزہ کا بندوبست کرے گی

(۱۱) سائنس کی ترقی، صنعتی تحقیقات اور اعلیٰ فنی تعلیم کا انتظام کرے گی۔

(ب) جو صنعتیں ملک کی ترقی کے لئے اہم ہوں گی اور جن کے لئے نجی سرمایہ کافی مقدار میں فراہم نہیں ہوتا ہوگا ان کو سرکار یا تو سرمایہ قرض دے گی یا اُن کے سرمایے میں حصہ دار ہو جائے گی۔

(ج) ظاہر ہے جن صنعتوں کو اس قسم کی امداد ملے گی ان پر حکومت کی نگرانی بھی زاید ہوگی جس کی صورت مثلاً یہ ہو سکتی ہے کہ ان کی مجلس انتظامیہ میں سرکاری نمایندگی کا مطالبہ کیا جائے گا۔

(د) خاص صورتوں میں صنعتی اقدام کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے سرمایے پر کمترین منافع کی بھی ضمانت کی جا سکتی ہے یا مقررہ سالوں کے لئے اس کے خساروں کی تلافی کی ذمے داری لی جا سکتی ہے۔ لیکن اس امداد کے لئے لازمی شرطیں یہ ہوں گی کہ انتظام میں حکومت کا بھی دخل ہو اور سرمایے کے معاوضے کی ایک انتہائی حد مقرر کردی جائے۔

(ہ) سرکار کی امداد کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ منظم صنعتوں کی انجمنوں کی طرف سے تحقیقات علمی کے جو ادارے قائم کئے جائیں اور یونیورسٹیوں کی طرف سے منظور شدہ اسکیموں کے لئے تحقیقات علمی کا جو کام کیا جائے انھیں سرکار کی طرف سے کافی مالی امداد دی جائے۔ یہ امداد اس خرچ کے علاوہ ہوگی جو سرکار براہ راست اپنے تحقیقاتی اداروں مثلاً سائنس اور صنعتی تحقیقات کی کونسل کی معرفت کر رہی ہوگی۔

(د) اس بلا واسطہ مالی امداد کے علاوہ سرکار اس بات کی معقول ضمانت کر لینے کے بعد کہ مال کی ترکیب اور قیمتیں ٹھیک ہیں۔ موجودہ زمانے کی طرح آئندہ بھی ہندوستان کی صنعت کی حوصلہ افزائی دوسروں کے مقابلے میں اس کا مال خریدکر کرتی رہے گی۔

(ز) محصول کے نظام پر بھی وقتاً فوقتاً اس نقطۂ نگاہ سے غور کیا جاتا رہے گا کہ جہاں وہ ایک طرف عدل و مساوات کے اصول اور قومی میزانیہ کی مصلحتوں کو پورا کر رہا ہے وہاں دوسری طرف اس کا اثر صنعت کی ترقی پر تو خراب نہیں پڑ رہا ہے۔

(ح) جن اشیاء دولت آفریں کی صنعتو کو ضرورت ہوگی اُن کی فراہمی میں بھی امداد دی جائے گی اور اس کام کے لئے سلطنتِ متحدہ برطانیہ اور امریکہ میں دفاتر قائم کئے جائیں گے۔

(ط) جن صنعتوں کے لئے ماہروں کا مشورہ خاص طور پر لازمی ہوگا، اُن کے لئے سرکار ماہروں کی خدمات فراہم کرنے میں بھی امداد دے گی۔

۷۔ خاص خاص علاقوں میں صنعت کو مجتمع کر دینے کی وجہ سے جو ناپسندیدہ معاشی معاشرتی اور فوجی مصلحت کے خلاف نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے رفع کرنے کو بھی تجویز میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی ذمّے داری اکثر صورتوں میں صنعت کی اس ترقی پر ڈالی جاسکتی ہے جسے محض اتفاقی اور من مانے طریقے پر ایک خاص شہر کے ساتھ مخصوص کردیا جاتا ہے۔

۸۔ اس کے علاوہ صنعت کے منافع میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک اور زراعت کے ساتھ اس کا رابطہ قائم کرنے کے لئے بھی حکومت صنعت کی ترقی کو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلانا چاہتی ہے۔

۹۔ سرمایہ داروں کی فوری نفع طلبی کی ذہنیت کی وجہ سے موجودہ بے منصوبہ انتظام میں صنعتی ترقی میں جو عدم توازن پیدا ہوتا رہتا ہے اُسے دور کرنے کے لئے بھی حکومت

ہر صنعت کی ترقی کے انتہائی حدود پہلے سے مقرر کردے گی اور پھر ان کی تقسیم علاقہ وار طریقے پر کر دے گی۔

۱۰- سرکار اس کا قانون بنا دے گی کہ ہر نئی فیکٹری کو قائم کرنے اور پرانی فیکٹری کو وسیع کرنے کے لئے لائسنس حاصل کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر منصوبہ کے مطابق صنعتی ترقی کو جاری نہیں رکھا جا سکے گا۔

۱۱- اس مقصد کے پیش نظر کہ حکومت کی تجاویز کو عوام کی حمایت حاصل ہو اور دیسی ریاستوں کو اس بات کی شکایت نہ ہو کہ اپنی ریاستوں میں صنعتوں کو ترقی دینے کی جو جائز خواہش ان کے اندر موجود ہے اسے نا واجب طریقے پر پامال کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسے بالادست بورڈ کو مقرر کرنے کی تجویز زیر غور ہے جو مرکزی حکومت کو ان صنعتوں کے بارے میں جنھیں مرکزی نگرانی کے ماتحت لانے کا ارادہ ہے برابر مشورہ دیتا ہے اس کے فرائض اور دیگر معاملات کا بعد میں تصفیہ کیا جائے گا۔

۱۲- اس کے علاوہ دوسری نگرانیاں بھی مندرجہ ذیل مقاصد کو حل کرنے کے لئے تجویز کی گئی ہیں:-

(الف) صنعت، زراعت اور اجتماعی خدمات میں جو سرمایہ لگایا جائے اس میں توازن ہو۔

(ب) صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کو اجرت انصاف کے مطابق ملے اور ان کی رہائش کے لئے مہذب انتظامات کئے جائیں۔

(ج) نجی سرمایہ داروں کے بہت زیادہ منافعوں کا سد باب کیا جائے۔

(د) صنعتی مال کی نوعیت کو ملکی اور غیر ملکی منڈیوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بہتر رکھنے کی ضمانت کی جائے۔

(ہ) چند افراد یا کسی خاص فرقے کے ہاتھ میں سرمایے کا غیر صحت مند اجتماع نہ ہو۔
مندرجہ بالا مقاصد میں سے پہلے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کے اجراء کی

نگرانی رکھی جائے گی ۔ دوسرے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مزدوروں کے واسطے مناسب قوانین بنائے جائیں گے ۔ تیسرے مقصد کے لئے ایسے کاروبار کے منافع کو جن میں آزاد مقابلہ جاری ہوگا ۔ غیر مناسب طریقے پر کم کرکے لوگوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی جائے گی ۔لیکن جہاں آزاد مقابلہ نہ ہوگا اور اس بنا پر غیر معمولی منافع حاصل کئے جاتے ہوں گے وہاں البتہ ضرورت کے مطابق کارروائی اختیار کی جائے گی ۔ چوتھے مقصد کے لئے مال کی معیار بندی کر دی جائے گی اور اس معیار بندی کو نافذ کرنے کے لئے خاص انتظامات کئے جائیں گے ۔ پانچویں مقصد کے لئے مناسب کارروائیاں کی جائیں گی مثلاً سرمایہ کے اجرار پر کنٹرول اور صنعت کی علاقہ وار تقسیم کے لئے لائسنس دینے والا محکمہ ۔

حکومت ہند کو یہ بھروسہ ہے کہ صوبوں اور دیسی ریاستوں کے مشورہ سے ایسا انتظام کیا جاسکے گا کہ دوستانہ اشتراک عمل کے ساتھ ایک متفقہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہوگا ۔ غرض یہ حکومت ہند کی صنعتی پالیسی کا خلاصہ ہے ۔

جمعیّۃ العلما اور مسلم لیگ

رسالہ جامعہ کا کوئی مخصوص سیاسی مسلک نہیں ہے۔ اس لئے اس میں ہر مسلک کے خیالات شائع کئے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ سنجیدگی اور معقولیت کے معیار پر پورے اُتریں۔ (مدیر)

مسلمانوں میں جو جماعتیں اس وقت کل ہند پیمانہ پر سیاسی کام کر رہی ہیں ان میں ممتاز حسب ذیل ہیں:۔

مسلم لیگ، جمعیۃ العلما، مجلس احرار۔ خاکسار، آل انڈیا مومن کانفرنس، آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور کل ہند مسلم مجلس (جس میں آزاد مسلم کانفرنس بھی ضم ہو گئی ہے۔

ان جماعتوں میں کل ہند مسلم مجلس ابھی نئی قائم ہوئی ہے اور اپنی تنظیم کا کام بڑے پیمانے پر شروع نہیں کر سکی ہے۔ اس کے وجود کا علم صرف ان بیانات سے ہوتا ہے جو اس کے محترم صدر کبھی کبھی شائع فرماتے رہتے ہیں۔ یہی حال تقریباً آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا مومن کانفرنس کا بھی سمجھنا چاہیے۔ لیکن بقیہ چار سیاسی جماعتیں فعال اور منظم سیاسی وجود رکھتی ہیں۔

ہندوستان میں جہاں غیر ملکی حکمرانوں کا تسلط و اقتدار ابھی تک مضبوطی کے ساتھ قائم ہے کسی سیاسی پارٹی کے فعّال ہونے کی یہ پہچان ہے کہ وہ حکومت کی اٹل چٹان سے اپنا سر ٹکراتی رہے۔ ان چار جماعتوں میں سے خاکسار جماعت نے ابھی تک صرف ایک بڑی ٹکر لی ہے۔ لیکن احرار اور جمعیۃ العلماء کے وجود کو مسلسل ٹکر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ البتہ مسلم لیگ نے حکومت سے ابھی تک کوئی غیر آئینی جنگ نہیں کی ہے۔ اگرچہ آئینی میدان میں یہ حکومت سے برابر دست و گریبان رہتی ہے۔

خاکسار جماعت کا زور حکومت سے آخری ٹکر کے بعد بہت گھٹ گیا ہے۔ مجلس احرار کے اندر صرف گنے چنے اونچے درجے کے پڑھے لکھے رہنما ہیں۔ باقی لوگوں کا تعلق زیادہ تر ناخواندہ عوام کی جماعت سے ہے اور اگرچہ اس کا اثر ان مقامات کے عوام میں جہاں اس کی باقاعدہ شاخیں ہیں بہت خاصا ہے۔ لیکن بصورت مجموعی اس کی تنہا آواز کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتی، گو مقامی معاملوں اور مسئلوں میں یہ کبھی کبھی بہت زور دکھاتی رہتی ہے۔

اس لئے لے دے کر مسلمانوں میں دو بڑی سیاسی جماعتیں رہ جاتی ہیں: مسلم لیگ اور جمعیتہ العلماء۔ آیئے انھی دونوں جماعتوں کی نسبتی اہمیت اور خصوصیات کا تجزیہ کریں۔

یہ دونوں جماعتیں ہماری معاشری زندگی کی دو اہم اور بنیادی طور پر مختلف تحریکوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مسلم لیگ سیاسی میدان میں، علی گڑھ کی ترجمان ہے اور جمعیتہ العلماء دیوبندی تحریک کی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال اور برطانوی حکومت کے عروج کے وقت مسلمانانِ ہند کو ایک نہایت شدید انقلابی دور سے گذرنا پڑا۔ اس انقلاب میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور امارت و قیادت کی بلند ارفع جگہوں سے مسلمان بے دخل کئے گئے۔ نہ صرف معاشی حیثیت سے وہ بے بس اور حقیر ہو گئے بلکہ معاشرتی، مذہبی اور تمدنی حیثیت سے بھی اُن کا وجود خطرہ میں پڑگیا۔ ان کی زبان اُن کا ادب، ان کی تاریخ، اُن کا مذہب ان کے رسم و رواج اور معاشرت و تمدن سب کو مغربی حکومت، خیالات اور تہذیب نے مٹانا شروع کر دیا۔ نوجوانوں کو اپنے آباو اجداد کا ترکہ ذلیل اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ نظر آنے لگا۔ انھیں اپنی ہر چیز بُری اور غیروں کی ہر چیز اچھی نظر آنے لگی۔ وہ اپنی محکومی اور بے بسی کا ذمے دار اپنی قدامت پسندی کو قرار دینے لگے اور ان میں سے بہت سے روایتی طریقوں کو چھوڑ کر حکمراں طاقت کے تمدن کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔

یہ حالات تھے جب ایک ہی سرچشمہ فیض سے سیراب کئے ہوئے دو دریاؤں نے نجات کے دو مختلف راستے دکھلائے۔ سر سیّد نے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا راستہ دکھایا اور مغربی علوم و فنون کو سیکھنے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا سبق دیا اور مولانا محمد قاسم صاحب نے پُرانے علوم کے تحفظ اور ان کی بقا کی پر زور دیا۔ سر سیّد نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم کیا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب نے دار العلوم دیوبند۔ ایک کو نیچریت اور جدّت پسندی کا گہوارہ سمجھا جانے لگا اور دوسرے کو سنّت و طریقت کا مخزن۔

سر سیّد اور مولانا محمد قاسم صاحب دونوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے تھے اور ان کے جانشینوں اور مریدوں نے جو اصلاح و جہاد کی تحریکیں چلائی تھیں ان کے اثرات کو دونوں نے قبول کیا تھا۔ لیکن استعداد و صلاحیت، فہم و تمیز اور حالات و مواقع کے اختلاف نے دونوں کی طبیعتوں پر ان چیزوں کا بالکل متضاد اثر ڈالا تھا۔ سر سیّد جدید علم کلام وضع کرنے کی طرف مائل ہوئے اور انھوں نے اپنی وہ تفسیر مرتب کی جس نے انھیں نیچری اور دہریہ کا لقب دلوایا اور مولانا محمد قاسم صاحب نے قدیم طریق سنت اور اتباع آثار سلف کی تجدید شروع کی جس نے انھیں محافظ دین کے خطاب سے سرفراز کیا۔

سر سیّد کا مقصد انگریزوں اور مسلمانوں۔ اسلام اور عیسائیت میں مصالحت پیدا کرانا تھا۔ وہ مسلمانوں کی اصلاح و ترقی چاہتے تھے، لیکن انگریزی روش اور طرزِ خیال کو قبول کر کے۔ وہ اسلام اور عیسائیت، مسلم محکومی اور برطانوی شہنشاہی کو ناقابل مصالحت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ دونوں کے اشتراک عمل کے قائل تھے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزوں کے وجود کو نہ صرف اٹل بلکہ مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ ان کے مٹانے اور ختم کرنے کی کوششوں

وزری خام خیالی سمجھتے تھے۔

لیکن مولانا محمد قاسم صاحب عیسائیت اور انگریزوں کے ساتھ مصالحت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے وہ اپنے جسم پر انگریزوں کی حکومت کو بجبر و اکراہ گوارا کر تے لیکن اپنے دل پر ان کی حکومت کو قبول کرنے کے لئے کسی شرط پر تیار نہیں تھے وہ اپنے دین اور اسلامی تمدن کو اپنی اصلی حالت پر زندہ اور قائم دیکھنا چاہتے تھے۔

دونوں نے اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کا ذریعہ تعلیمی کوششوں کو قرار دیا۔ سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ بنایا، مولانا محمد قاسم صاحب نے دیوبند میں۔

سرسید چونکہ انگریزوں سے مصالحت کے قائل تھے اس لئے ان سے میل جول کے مواقع بڑھاتے تھے۔ دفتر میں، کونسل چیمبر میں، عدالت میں، ہسپتال میں، کلب میں ڈنر کی میز پر، بنک اور دوکان میں، کلاس کے کمرہ میں غرض ہر موقع پر سرسید ان کے رفقا اور اُن کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء انگریزوں سے گفتگو اور ملاقات کرتے تھے۔ ان کی بات سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور حاکم و محکوم کے درمیان جو بُعد ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ انگریزی زبان، ادب اور علوم سیکھتے تھے تاکہ وہ حاکم انگریز سے زیادہ سے زیادہ قریب آسکیں اور اس کا اعتماد حاصل کر سکیں۔

لیکن دیوبند کے اساتذہ اور طلبار اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ علی گڑھ کی طرح گورنر اور وائسرائے کی سرپرستی اور حکومت کی مالی امداد کے خواہش مند نہیں تھے۔ عقیدت مند عوام کی مالی پیش کش، نذر، زکوٰۃ، صدقات کو اپنے لئے کافی سمجھتے تھے۔ وہ انگریز سے مصالحت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں صرف اپنی چیز بچانے کی فکر تھی۔ انھیں اگر کبھی اتفاق سے انگریز سے ملنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو جبر و کراہیت کے ساتھ ملتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں بُعد اور بیگانگی

قائم رہی

علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبار کو انگریزی سرکار نے اپنی ملازمت میں لیا۔ اپنی عدالتوں میں وکیل، اپنے شفاخانوں میں ڈاکٹر، اپنے مدرسوں میں معلّم بنایا۔ سرکاری ٹھیکے دیئے۔ برطانوی تجارت خانوں نے انھیں اپنی ایجنسیاں دیں، صحافت اور دوسرے علمی پیشوں میں خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے مواقع مہیا کیے جس کی وجہ سے ان کی وفاداری اور ربط و تعلّق انگریزوں کے ساتھ بڑھتا رہا اور بڑی حد تک دونوں کے مفاد میں اشتراک پیدا ہوگیا۔ لیکن دیوبند کے طلبار ان تمام مواقع سے محروم رہے ان کا کام عوام کے سامنے وعظ و ارشاد اور ان کی امامت در مذہبی تعلیم رہا اور اسی میں وہ لگے رہے۔ اس لئے انگریز حاکم سے ان کی دوری قائم یا بڑھتی رہی۔

علی گڑھ تحریک کے حلقۂ اثر میں وہ تمام مسلمان آگئے جو سرکار سے فائدے کے متوقع رہتے تھے اور دیوبندی تحریک میں وہ مسلمان شامل ہوئے جو بڑی حد تک سرکار سے آزاد رہ کر اپنا گذر کرتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے پیروؤں کو دنیوی مفاد کا رشتہ باہم منسلک کیے ہوئے تھا۔ دیوبندی تحریک کے حامیوں کو آخرت کے مفاد کا رشتہ۔

ہندوستان میں جب سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور یہاں کے لوگوں نے سیاسی حقوق و اختیارات کے خواب دیکھنے شروع کئے یعنی ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو علی گڑھ تحریک کے پیروؤں کو جو مسلم انگریزی اشتراک مفاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے، یہ بات خطرناک نظر آئی۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کی تائید اور ہندوؤں کی مخالفت میں ۱۸۸۸ء میں محبان وطن کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ شروع میں یہ انگریز پرست ہندو مسلمانوں کی متحدہ جماعت تھی لیکن ۱۸۹۳ء میں اس نے خالص مسلمانوں کی جماعت کی شکل اختیار کر لی اور تقسیم بنگالہ

کے ہنگامہ پرور زمانے میں اس جماعت نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا نام اختیار کر لیا
لیکن سیاسی بیداری کی لہریں ان مسلمان حلقوں میں بھی پہنچیں جو علی گڑھ تحریک کے اثر سے باہر تھے۔ ان میں سے کچھ برادرانِ وطن کی تحریکوں میں محض ہندوستانی کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت کو یہ شرکت مطمئن نہیں کر سکی۔ وہ ایک آزاد اسلامی سیاسی تحریک کے منتظر رہے۔ اس قسم کی تحریک غیر منظم طور پر ہندوستان میں عرصے سے موجود تھی۔ اس کا سلسلہ سید احمد صاحب بریلوی کی تحریک جہاد سے ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا غدر بھی اسی تحریک کا ایک ماحصل تھا۔ جمال الدین افغانی اور سلطان حمید کی اتحاد اسلامی کی تحریک کو بھی اسی ذیل میں لایا جا سکتا ہے۔ دیوبند میں اس تحریک کو وہاں کے اولین طالب علم حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنایا اور اس وقت سے دیوبند کی تحریک نے ایک سیاسی پہلو بھی اختیار کر لیا۔

اسی دوران میں تقسیم بنگالہ کی منسوخی، تحریک اتحاد اسلامی کی ترقی اور مسلمانوں میں سیاسی شعور اور بیداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی پڑھے ہوئے طبقے میں بھی ترکی کی واحد آزاد اسلامی سلطنت کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی اور انگریزوں اور مسلمانوں کے مفاد کے مختلف ہونے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفاد کے مشترک ہونے کا احساس ترقی پانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں مسٹر جناح کی قیادت میں کانگریس لیگ پیکٹ ہوا اور انگریزوں کے سامنے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہوم رول کا ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا۔ ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان کو ذمہ دار حکومت عطا کرنے کا وعدہ کیا اور مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ جنگ کے بعد خلافت اور مقامات مقدسہ کا حکومت برطانیہ پورا احترام کرے گی۔ لیکن جنگ کے بعد حکومت نے نہ صرف یہ کہ اپنا وعدہ پورا نہیں کیا بلکہ پنجاب میں نہایت ہولناک مظالم کو روا رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اس موقع پر دیوبند کی تحریک کے سیاسی پہلو نے جمعیۃ العلماء ہند

کی صورت میں اپنی رہنمائی کو منظم کیا اور اپنے گرد ان تمام علماء کو جمع کرنا شروع کر دیا جو مذہبی بنیاد پر انگریزوں کی حکومت کے مخالف اور آزادی ہند کی تحریک کے حامی تھے۔

لیکن عامۃ المسلمین جس جھنڈے کے گرد اکٹھے ہوئے وہ خلافت کا جھنڈا تھا اور اس نے علی گڑھ اور دیوبند دونوں کو یکجا کر دیا۔ لیکن اس یکجائی میں دیوبند نے علی گڑھ کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھایا بلکہ علی گڑھ نے دیوبند کی قیادت کو قبول کیا۔ علی گڑھ کے نیچریوں اور یورپ زدہ لوگوں نے مغربی لباس، انگریزی زبان اور مغربی معاشرت کو ترک کرکے دیوبندی شکل وصورت بنائی اور خود کو مسٹر کی جگہ مولانا کہلوانا شروع کر دیا۔ غرض آکسفورڈ اور کیمبرج، برلن اور پیرس، کولمبیا اور فلاڈلفیا کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے یورپ کے تمدن پر لعنت بھیجی اور علماء ہند کی پیروی کو شرف وسعادت سمجھا۔ اس نے ان کی طاقت کو حیرت انگیز طریقے پر بڑھا دیا۔ پہلے وہ حکومت کے محتاج اور دست نگر تھے۔ اب وہ آزادی اور اختیار کے مالک ہوگئے۔ وہ براہ راست طاقت کے خزانہ یعنی عوام تک پہنچ گئے اور اس خزانے کو انھوں نے مذہبی اپیل کی کنجی سے کھول کر اپنے مقاصد کے پورا کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ عوام نے انھیں محکومیت کی پستی سے نکال کر حکمرانی کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچا دیا۔ لیکن یہ کامیابی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ سید احمد بریلوی اور غدر کے جہاد بالسیف کی طرح یہ عدم تشدد پر مبنی جہاد بھی محض جذبات اور تخیلات پر قائم تھا۔ اور ٹھوس حقائق کی طرف سے اس میں طفلانہ لاعلمی اور بیگانگی پائی جاتی تھی۔ اس کے رہنما برطانوی سلطنت کے برقی لیمپ کو محض پھونکوں کی کثرت سے بجھا دینے کی تمنا کر رہے تھے۔ لیمپ تو خیر کیا بجھتا، پھونکوں کی یک رخی بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی اور اس کی وجہ سے جو زبردست جھاگ اور بلبلے اٹھے تھے وہ بھی کچھ عرصے کے بعد بیٹھ گئے۔

خلافت کی تحریک اب ختم ہوگئی۔ علی گڑھ اور دیوبند کا ازدواجی رشتہ ٹوٹ گیا

البتہ اس رشتہ کی ایک یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ ابھی تک موجود ہے۔ اور اپنے اندر زندگی اور ترقی کے بے شمار سوتوں کو چھپائے ہوئے ہے۔

بہرحال تحریک خلافت جب ختم ہوئی تو مسلم لیگ جو اس کے عروج کے زمانے میں کمزور اور جاں بلب ہوگئی تھی دوبارہ طاقتور ہونا شروع ہوئی۔ وہ ہماری معاشری زندگی کی ایک واقعی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی پر امن اور آئینی تحریک کی علمبردار تھی، جو انگریزوں کے ساتھ مصالحت کرکے ہندوؤں کے مقابلے میں ہمارے انگریزی پڑھے لکھے اور دولت مند طبقے کے حقوق اور مفاد کا تحفظ اور حکومت کے کاروبار میں مسلمانوں کی خاطر خواہ نمائندگی کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں اس نے اپنا نصب العین حصول آزادی قرار دے لیا تھا، لیکن وہ ایک انقلابی جماعت نہیں تھی۔ انقلابیوں کی طرح اس کی نظر محض مستقبل پر نہیں تھی یعنی جب انقلاب مکمل ہو جائے گا بلکہ وہ فوری فوائد کے حصول کو مساوی اہمیت دیتی تھی۔ وہ لوگوں کو ملازمتیں، اعلیٰ عہدے، تجارتی فوائد اور دیگر سہولتیں فی الوقت بہم پہنچاتی اور ان کی شکایتوں اور تکلیفوں سے حکمرانوں کو روشناس کراتی تھی۔ اس کی یہ خدمتیں کسی غیر یقینی مستقبل یا آیندہ نسلوں کے لئے نہیں بلکہ موجودہ زمانہ اور اپنے معینہ حلقہ کے لئے تھیں۔ مسلم لیگ کے رہنما، مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس قانون ساز۔ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اجلاسوں، عصرانوں، لنچوں اور ڈنروں کے موقع پر سرکاری حکام سے ملتے جلتے تھے۔ اور انھیں اپنے حلقے کے مطالبوں کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وہ اپنے ووٹ، اپنے پلیٹ فارم اور پریس کا دباؤ ڈال کر اپنی بات منواتے تھے۔ اس لئے ان کا وجود فیض بخش تھا اور ان کی مقبولیت ان کے حلقے میں لازمی تھی۔ سرکار بھی انھیں خطرناک نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ کبھی انھیں ناراض اور کبھی ممنون کرکے وہ انھیں اپنا طرفدار بنا سکتی تھی۔ ان سے مول تول، گفتگوئے مصالحت کرنے کا موقع تھا۔ غرض ان وجوہ کی بنا پر مسلم لیگ کو ایک آئینی سیاسی جماعت کی

حیثیت سے دوبارہ ترقی ہوئی

لیکن انگریزی لکھے پڑھے اور دولت مند طبقے کے علاوہ مسلمانوں میں ایک کثیر التعداد ایسا طبقہ بھی موجود تھا جس کو اپنے درد کا کوئی مداوا ۔ اپنی تکلیف و پریشانی کا کوئی علاج لیگ میں نہ ملتا تھا۔ یہ اپنے دبے ہوئے غم وغصہ ، اپنی ٹھکرائی ہوئی تمناؤں اپنی پوشیدہ آرزوؤں کو ظاہر کرنا چاہتے تھے ، ان کو بھی ایک پلیٹ فارم ، پریس اور اپنے خیالات کے وکیلوں اور نمائندوں کی ضرورت تھی۔ کانگریس یا ملک کی دوسری غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کی وکالت ان کے جذبات کی تسکین کے لئے کافی نہیں تھی۔ یہ چھوٹے تاجروں ، چھوٹے زمینداروں ، کاریگروں اور صناعوں اور مزدوروں کی جماعت تھی۔ ان کی نمائندگی کا کام جمعیتہ العلما (اور مجلس احرار نے جسے جمعیتہ العلماء ہی کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے) نے انجام دیا۔ لیکن اسے سرکاری افسروں سے بعد اور بیگانگی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ حکام کی انفرادی رعائتیں اس کی تشنگی رفع کرنے سے قاصر تھیں۔ اس لئے اُسے ایک انقلابی جماعت ہی بننا پڑا۔ اُس نے اپنا نصب العین آزادی کامل قرار دیا اور جملہ فوائد کو اس کے حصول پر منحصر رکھا۔ آزادی کامل کا نصب العین ایک مبہم ، غیر یقینی اور آئندہ کا مقصد تھا۔ لیکن اس کو اختیار کرنے کی وجہ سے جمعیتہ العلماء کو اپنے حلقے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی مذہبی اپیلیں جن میں بڑی سے بڑی ریاضت اور قربانی کے لئے دعوت دی جاتی تھی عموماً آخرت اور دوسری دنیا کے منافع کے لئے ہوا کرتی تھیں جیسا ن پر لبیک کہنے کے لئے لوگ تیار تھے تو ان کے مقابلے میں اسی دُنیا کے منافع کے لئے اپیل کرنا (اگرچہ وہ فوراً ممکن الحصول نہیں تھے) کہیں زیادہ آسان کام تھا۔

بہر حال جمعیتہ العلما ـــــ اور اس بات میں خاکسار اور احرار بھی اس کے ساتھ شریک کئے جاسکتے ہیں ـــــ خالص سیاسی جماعت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ

مذہبی عقیدت، وابستگی اور وفاداری شامل ہیں۔ اس کی اپیل عموماً مذہبی اپیل ہوتی ہے
اس کے رہنماؤں کی عزت مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ یہ مذہب کی تہدیدا
قوت سے اپنی بات منواتی ہے۔ یہ خدا اور رسول، قرآن و حدیث، فقہ و شریعت
کو درمیان میں لاتی ہے۔ چودہ سو سال کی روایتی مذہبی تنظیم کی پناہ اور حفظ و امان میں اور
اسی کی امداد اور تقویت کے ساتھ وہ اپنے سیاسی کام کرتی ہے۔ جمعیتہ العلمار
کی بذاتِ خود کوئی اچھی تنظیم نہیں ہے اس کی شاخیں کوئی مستقل دفتر اور مقامی مرکز نہیں
رکھتیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ایک مخصوص پلیٹ فارم ہے، ایک وسیع حلقۂ اثر
ہے اور یہ ہندوستان کے طول وعرض میں اپنی دعوت پر بڑی سے بڑی قربانیوں
کے لئے مسلمان مردوں اور عورتوں کو آمادہ کر سکتی ہے۔

لیکن سیاسی بصیرت، آئینی واقفیت، موقع شناس معاملت اور جدید زمانے
کے حالات، مطالبات اور طریقہ ہائے کار سے آگاہی اور دنیوی زندگی کے فوری فوائد
کے حصول پر توجہ کو مرکوز کرنے کے معاملے میں جمعیتہ العلمار بہت پیچھے ہے۔ سیاسی
اعتبار سے نہ یہ ایک اچھی انقلابی پارٹی بن سکتی ہے نہ آئینی اور پارلیمنٹری پارٹی۔ ان
معاملوں میں یہ علی گڑھ سے استمداد لینے اور مسلم لیگ سے اشتراک عمل کرنے
کے لئے بالکل مجبور ہے۔

خوش قسمتی سے اس استمداد اور اشتراک عمل کے مواقع پہلے کی بہ نسبت اب بہت
زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ علی گڑھ کے حلقہ اور مسلم لیگ دونوں میں ایک ترقی پسند عنصر
موجود ہے۔ رسالہ جامعہ کے پچھلے شمارہ میں "لیگی سیاست کے نئے میلانات" کے عنوان
سے جو مضمون میں نے لکھا تھا اس میں لیگ کے اندر اس عنصر کی ترقی اور نشو و نما کو دکھلایا
گیا تھا۔ جمعیتہ العلمار کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا مشورہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود شناسی
کے ساتھ اپنے حدود کا احساس کرے۔ ان معاملوں میں جن میں علی گڑھ کی استمداد ضروری

ہے وہ اس کا اشتراک عمل حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی پوری قوت سے مسلم لیگ کے ترقی پسند عنصر کو کامیاب بنانے میں امداد دے۔ لیگ کے پاکستانی نصب العین سے جمعیتہ العلمار کو ہرگز نہ بھڑکنا چاہیئے۔ یہ نصب العین ہمارے ملک کی بنیادی حقیقتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی شکل میں باقی رہنے والا ہے۔ خود کانگریس کے بیدار مغز اور ترقی پسند عناصر نے اس بات کا اعتراف کرلیا ہے۔ لیکن اگر جمعیتہ العلمار کی امداد کے باوجود لیگ کے ترقی پسند عنصر کو لیگ کے اندر پنپنے کا کوئی موقع نہیں ملتا تو اُسے پھر مجبوراً لیگ سے باہر آنا پڑے گا۔ اس وقت اس کے لئے مناسب ہوگا کہ جمعیتہ العلمار کے اشتراک عمل سے ایک نئی مسلم لیگ بنائے جس کے لئے ایک موزوں نام پہلے سے رکھا جاچکا ہے یعنی کل ہند مسلم مجلس۔

حالاتِ حاضرہ

۳۰ اپریل کو ہامبرگ ریڈیو نے اعلان کیا کہ جرمنی لڑائی میں ہار گیا ہے یہ شکست کا پہلا اعتراف تھا جو جرمن حکومت کی طرف سے کیا گیا۔ پہلی مئی کو ہر ہٹلر کے انتقال کی خبر دی گئی، اور یہ کہا گیا کہ مرنے سے پہلے وہ امیر البحر ڈونٹز کو اپنا جانشین مقرر کر گئے ہیں۔ اس وقت تک اتحادیوں نے مغرب کی طرف سے بڑھتے بڑھتے دریائے الب کے کناروں تک قبضہ کر لیا تھا، اور جرمن فوجیں جگہ جگہ ہتھیار ڈال رہی تھیں۔ آخر اپریل میں ہملر نے کوشش کی تھی کہ صرف ایک فریق یعنی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے کام چل جائے، مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ پھر بھی جرمن فوجوں نے ہتھیار اس طرح ڈالے کہ گویا ہملر کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔ روسیوں کے ساتھ لڑائی جس طریقے اور پیمانے پر بھی ممکن تھا چند روز تک جاری رہی اور ادھر شمالی اٹلی اور وسطی اور شمالی جرمنی کی جرمن فوجوں نے دو تین دن کے اندر ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح سے شکست کا اعتراف بھی پروگرام کے مطابق ہوا، اور اس پالیسی کی تکمیل کی گئی کہ جرمنی کا کم سے کم حصہ روسیوں کے قبضے میں آئے اور زیادہ سے زیادہ اتحادیوں کے۔ آخر میں ۷ مئی کو ڈونٹز نے ایک ساتھ اتحادیوں اور روسیوں سے لڑائی بند کرنے کی درخواست کی، اور برلن میں رات کو ٹھیک بارہ بجے جرمنی کی طرف سے فوج کے سپہ سالار فون کائتل، امیر البحر فون فریڈبرگ اور ہوائی بیڑے کے افسر اعلیٰ فون شٹمف نے اتحادیوں کے شرائط نامے پر دستخط کر دیے۔ یہ شرطیں صرف لڑائی بند کرنے کے متعلق ہیں، ان کے بعد روسی اور اتحادی جرمنی کے ساتھ جو برتاؤ مناسب سمجھیں کریں گے، گویا جرمنی کے لئے صلح کی شرطیں احکامات کی شکل میں ہوں گی جن کی تعمیل سے گریز کرنے کا موقع یا حق نہ ہوگا۔

روسی اور اتحادی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے، مگر لڑائی بند ہوتے ہی دل میں وسوسے بھی پیدا ہونے لگے جرمنی کے وزیر خارجہ شویرین فون کروسک اور ڈوئنٹز نے اپنی آخری تقریروں میں نازی پارٹی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ آخر وقت میں فیصلہ کرنے کا اختیار جرمن ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں آگیا، گویا وہی قوم اور ملک کو دشمنوں سے بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اسی نے جرمنی کو سلامت رکھنے کی آخری تدبیر کی۔ یہ قومی زندگی میں اس کے مرتبے اور استقلال کا ایک ثبوت ہے، اور اس طرح اتحادیوں کا یہ ارادہ کہ وہ جرمن ہائی کمانڈ، اس کے ماتحت اداروں اور ان روایات کا جن پر اس کے اقتدار کی بنیاد رکھی گئی ہے بالکل خاتمہ کر دیں گے جسب منشار پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ نازی پارٹی مر مٹی ہے، اس کی قدر کرنے والا اب کوئی نہ رہے گا، اور بہت ممکن ہے کہ ہر غلطی، اور ہر مصیبت کا الزام اسی پر لگایا جائے۔ لیکن ہٹلر کی شخصیت، اُن کے حوصلے، ان کی مردانہ موت ایک داستان بنائی جائے گی۔ ہائی کمانڈ سے ان کی جو مخالفتیں ہوئیں ان پر پردہ ڈال دیا جائے گا اور یہ دکھایا جائے گا کہ لیڈر کی موت کے بعد جرمنی کا سہارا اور قومی عزت اور آبرو کا نگہبان وہی تھا۔

اتحادیوں اور روسیوں نے ضمناً ڈوئنٹز کو جرمنی کا حاکم تسلیم کر لیا ہے۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ جرمنی میں اپنی فوجی عملداری قائم کریں لیکن معلوم نہیں یہ عملداری براہ راست ہوگی یا کسی باضابطہ جرمن حکومت کے وسیلے سے کام لیا جائے گا۔ لڑائی بند ہونے کے بعد ڈوئنٹز کو فوراً عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا۔ فلنز برگ کا جرمن ریڈیو قوم کو اس طرح مخاطب کرتا رہا کہ گویا اطلاعات کا سرکاری ذریعہ وہی ہے، اور اس پر اخباروں کے نامہ نگاروں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ غالباً جرمنی کی حکومت کا مسئلہ طے نہ ہو سکے گا جب تک اتحادی یہ نہ دیکھ لیں کہ روسی کیا کرتے ہیں۔ آسٹریا میں روسیوں نے اپنی سرپرستی میں ایک عارضی حکومت قائم کر دی ہے، اگرچہ یالٹا میں یہ سمجھوتہ ہوا تھا کہ

میں آسٹریا کے مختلف حصوں میں روس، برطانیہ، فرانس اور متحدہ ریاستوں کی فوجی حکومت قائم ہونا قرار پایا تھا۔ چکوسلوواکیہ کی جلا وطن حکومت سے روسیوں نے ۱۹۴۳ء کے آخر میں معاہدہ کیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ چکوسلوواکیہ کا محافظ روس ہوگا۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روسی چکوسلوواکیہ کی سابق حکومت کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے، اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ معاہدہ بحال رہے مگر چکوسلوواکیہ کی حکومت نئے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جن کا روس سے تعلق صرف مصلحت پر مبنی نہ ہوگا۔ جرمنی کا دارالسلطنت روسیوں کے قبضے میں ہے، اور کیا تعجب ہے کہ وہ کسی فوری ضرورت کا بہانہ کر کے جرمنی میں ایک عارضی حکومت قائم کر دیں جو ان کی سرپرستی کو ان تمام فائدوں پر ترجیح دے جو اتحادیوں کی خوشنودی جرمن قوم کو پہنچا سکتی ہے۔ مارشل سٹالن نے اپنی یکم مئی کی تقریر میں پھر کہا تھا کہ روس، جرمنی کی عام آبادی پر کسی قسم کی سختی نہ کرے گا اگر وہ احکامات کی تعمیل کرتی رہے، کہ روس کی لڑائی صرف نازیوں سے ہے، اور وہ صرف نازیوں اور اُن کی تعلیم کو مٹانا چاہتا ہے۔ بعض شہروں میں جن پر روسیوں کا قبضہ ہے آبادی سے کہا گیا ہے کہ وہ شہر کے منتظم (یعنی میریا بُرگ ماسٹر کو خود منتخب کرے، حالانکہ اتحادیوں نے ہر جگہ شہریوں کی رائے لئے بغیر کسی شخص کو بطور منتظم نامزد کر دیا ہے۔ اتحادی سپہ سالاروں نے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ جرمنوں سے کسی قسم کا میل جول نہ رکھیں۔ روسی ایسی تصویریں چھاپ رہے ہیں جن میں روسی سپاہی جرمن بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ یہ طرز عمل جن سیاسی چالوں کی تمہید ہے ان کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف روسی جرمنی میں ایک عارضی حکومت قائم کریں اور اتحادیوں کو اُسے حق دار تسلیم کرنے کی دعوت دیں اور دوسری طرف اتحادی ڈونٹز یا کسی ایسی شخصیت کو جو آزاد جمہوری حکومت اور سرمایہ داری کے نظام کو قائم کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ روسیوں کی بنائی ہوئی عارضی حکومت کے مقابلے پر لائیں۔ جرمنی نے ہتھیار ڈونٹز کے کہنے پر ڈالے

اور جرمنی میں جو نئی حکومت قائم ہو اُسے ڈونٹز کی حکومت کا قانونی وارث اور صلح کی شرطوں پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ جرمنی کے بیشتر شہروں میں زندگی کے بنیادی انتظامات جیسے کہ غذا، پانی اور روشنی کی فراہمی اور آمد و رفت کے ذرائع بالکل برباد ہو گئے ہیں انھیں بحال کرنا اور آبادی کی دوسری ضروریات پوری کرنا اتحادیوں کی مدد سے ہی ممکن ہے لیکن یہ کام بڑی مشکل سے اور آہستہ آہستہ انجام پا سکیں گے، اور اتحادیوں کے حق میں بہتر ہوگا کہ ان کے اور جرمن آبادی کے درمیان جرمنوں کا بنایا ہوا اپنا کوئی نظام حائل رہے۔ جرمنی اور یورپ کی تاریخ میں وہ تدبیریں فیصلہ کن ہوں گی جو اس وقت روسی اور اتحادی اختیار کریں گے۔ اور ان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ان تدبیروں کے متعلق روسیوں اور اتحادیوں کے درمیان اختلاف ہو۔ روسی حکومت پر یہ ذمے داری نہیں کہ وہ اپنے ہر فیصلے کی تصدیق قوم سے کرائے۔ اور وہ اپنی آزادی سے پورا فائدہ اُٹھائے گی۔ اتحادیوں میں وہ یک جہتی جو جنگ کے دوران میں تھی قائم نہ رہے گی۔ ان کے مشوروں میں دیر لگے گی اور مسٹر چرچل جیسے لیڈر، جو جنگ کے دوران میں قومی سیاست پر بالکل حاوی تھے۔ ہر فیصلہ اپنی صواب دید کے مطابق نہ کر سکیں گے۔ اب تک روسی بعض معاملات میں مشورہ کرتے رہے ہیں تو بعض معاملات میں خود فیصلہ کر کے اُنھوں نے اتحادیوں کو اسے تسلیم کرنے کی دعوت دی ہے، اور جن معاملات کا روس کے تحفظ سے تعلق تھا ان میں انھوں نے بحث اور اظہار رائے کو بھی بے جا مداخلت قرار دیا چنانچہ بحر بالٹک کی ساحلی ریاستوں، یعنی لیتھوئینیا، لیتویہ اور استھونیا کے مستقبل پر انھوں نے کوئی گفتگو نہیں ہونے دی اور اتحادیوں کو اس بارے میں کوئی باضابطہ اطلاع نہیں ہے کہ روسی رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ملک اتحادیوں کے لئے اس طرح بند ہیں جیسے کہ جنگ کے زمانے میں تھے، کیونکہ روسی، اتحادی ملکوں کے ان لوگوں کو جو یہاں سے نکالے نہیں جا سکتے بڑی سخت نگرانی میں رکھتے ہیں

اور دوسروں کو آنے نہیں دیتے۔ جنگ کے دوران میں اتحادیوں نے روسیوں کی اس حقیقت کو گوارا کیا کہ وہ ان معاملات کے سوا جن سے خود ان کو مطلب ہے اور کسی مسئلے پر گفتگو نہیں کرتے اور مشوروں میں چاہے جو کچھ طے پائے، عمل میں صرف اپنی مصلحت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ جنگ ختم ہو گئی ہے تو اتحادیوں کا رویہ کچھ نہ کچھ بدلے گا لیکن وہ اس بات سے مجبور ہوں گے کہ روسیوں کو جو کچھ کرنا تھا انھوں نے کر لیا ہے۔ پولینڈ کا مسئلہ اس کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ روسیوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کرزن لائن کو پولینڈ کی مشرقی سرحد بنائیں گے اور انھوں نے طے کر لیا تھا کہ پولینڈ کی عارضی حکومت انھی سیاست دانوں پر مشتمل ہو گی جن پر وہ اعتبار کر سکیں، اور اب یالٹا کانفرنس کے فیصلے کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے ہیں۔ اب تک ایسا بھی نہیں ہوا ہے کہ وہ بحث میں قائل ہو کر اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں۔ یا رویے کو بدلیں دیکھنا یہ ہے کہ جرمنی میں وہ کیا کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں، کیونکہ تحفظ کی جو تدبیریں انھوں نے اب تک کی ہیں ان کی کامیابی اسی پر منحصر ہے۔

دراصل ان قوموں کو جن میں اپنی سیاست کو آزاد رکھنے کی طاقت ہو کسی خاص طرز عمل کا پابند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ غالباً تہران کانفرنس میں مارشل سٹالن کو اس بات پر اصرار تھا کہ یورپ مختلف حلقوں میں تقسیم کیا جائے اور روسی اور اتحادی اپنے اپنے حلقے میں امن قائم رکھنے کے ذمے دار ہوں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے بیان کیا ہو گا کہ پولینڈ، چیکوسلوواکیہ، ہنگری، یوگوسلاویہ، بلغاریہ اور رومانیہ کو روس کے حلقۂ اثر میں ہونا چاہیے۔ اس موقع پر پریزیڈنٹ روزولٹ نے، جن کی بدولت یہ کانفرنس ہوئی تھی، یہ ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو گا کہ یورپ کی یہ تقسیم کسی اطمینان بخش بین اقوامی نظام میں کھپائی نہیں جا سکتی لیکن انھوں نے مارشل سٹالن کی تائید بھی نہ کی ہو گی۔ یالٹا کانفرنس میں انھوں نے مارشل سٹالن کو تھوڑا بہت راضی کر لیا، مگر اس کے باوجود روس کا رویہ نہیں بدلا، اور مسٹر چرچل سے

کانفرنس کا یہ فیصلہ کہ پولینڈ کے مسئلے کا حل کرنا مارشل ستالن مسٹر چرچل اور پریزیڈنٹ ٹرومین پر چھوڑ دیا جائے گویا اس کا اعتراف ہے کہ ان معاملات میں جن کا روس، برطانیہ یا متحدہ ریاستوں کے مفاد سے قریبی تعلق ہے۔ بین الاقوامی مجلس اپنی رائے کو تسلیم کرانے کی بہت زیادہ کوشش نہ کرے گی۔

سین فرنسسکو کانفرنس اپنی قسم کی ہر کانفرنس کی طرح تقریروں سے شروع ہوئی جو اکثر نامہ نگاروں کی رائے میں بہت پھیکی تھیں۔ مسٹر مولوتوف نے صدارت کے معاملے میں متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی مخالفت کی اور کامیاب ہوئے۔ لیکن اُن کے اصرار کے باوجود کانفرنس اس پر راضی نہیں ہوئی کہ پولینڈ کی عارضی حکومت کو شرکت کی دعوت دی جائے اور ارجنٹینا کو نہ دی جائے۔ مسٹر مولوتوف نے جو ہنگامے برپا کیے۔ ان کے باوجود کانفرنس کا کام جاری رہا، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنے فیصلے شائع کردے گی۔ ان کی بدولت وہ بین اقوامی نظام قائم ہو جائے گا جس کا خاکہ ڈمبارٹن اوکس کانفرنس میں بتایا گیا تھا۔ یہ بین اقوامی نظام ایک کاؤنسل، ایک اسمبلی اور ایک سکریٹریٹ پر مشتمل ہوگا۔ غالباً کاؤنسل کے ارکین گیارہ ہوں گے، اگرچہ ایک تجویز ہے کہ اس کے ارکین کی تعداد کچھ بڑھادی جائے۔ ارکین میں سے پانچ یعنی متحدہ ریاستیں، برطانیہ، فرانس، روس اور چین مستقل ہوں گے، باقی مخصوص مدت کے لئے منتخب ہوں گے۔ کاؤنسل بین اقوامی اسمبلی کی کارکن جماعت ہوگی، اور یہ بیشتر معاملات میں صرف اسمبلی کے فیصلوں کو نافذ کرے گی تو بعض معاملات میں جن کا تعلق دنیا کے امن اور مختلف قوموں کی سیاست کو ہم آہنگ رکھنے سے زیادہ تعلق ہوگا یہ خود فیصلہ کرے گی۔ ابھی یہ فیصلہ زیر بحث ہے کہ تجاویز کو منظور کرنے کے لئے کاؤنسل کے مستقل ارکین کی کل تعداد کا متفق ہونا لازمی مانا جائے یا صرف اکثریت کا، لیکن میلان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ جس ریاست کا کسی معاملے سے مخصوص تعلق

ہو اس کی مرضی کے خلاف کاؤنسل میں فیصلہ نہ کیا جائے۔ جنوبی امریکہ کی ریاستیں روس اور کومیونزم کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن ان کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ بین اقوامی نظام میں ان کے براعظم کو جدا گانہ سیاسی حیثیت دی جائے اور ان کے آپس کے جھگڑے کاؤنسل میں اُن کی رضامندی کے بغیر پیش نہ ہوں۔ یہ خواہش پوری کی گئی تو گویا اس رویے کی تصدیق کردی جائے گی جو روس نے اختیار کیا ہے۔

م۔م

۱۶ مئی ۱۹۴۵ء

۱ جنوری

سجّاد حیدر یلدرم

ہما خانم | سجاد حیدر یلدرم کا نام اردو ادب میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے مدتوں ان کے طرز نگارش کی تقلید کی گئی اور ان کی کتاب "خیالستان" کو پڑھا گیا اور سر دُھنا گیا۔

"ہما خانم" میر حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ ہے سجاد حیدر یلدرم کے قلم نے اس میں کچھ خوبیوں کا اور اضافہ کر دیا ہے حجازی کے بانکپن اور یلدرم کی شوخی نے ہما خانم کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ قیمت مجلد ۲/

خیالستان	۱/	جلال الدین خوارزم شاہ	۱۲/	حکایات و احتساسات	۱۲/
ثالث بالخیر	۸/	لیلیٰ مجنوں	۴/	جنگ و جدال	۱۲/
اسباب الفت	۱۲	پرانا خواب	۱۰/	زہرہ	۱۰/

پرانا خواب اور دیگر افسانے ۱۲/

ماہ نو | ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے "ششو" کا ترجمہ۔ از جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی

ٹیگور فطرت انسانی کا باکمال مصور ہے۔ خصوصاً بچوں کے حسیات اور ان کے خیالات کی جیسی سچی تصویریں اس نے کھینچی ہیں وہ اور کہیں نظر نہ آئیں گی۔ ۱۲/

گیتانجلی	۱۲/	میرا لڑکپن	۱۲/	خاموشی حسن	۱۲/
کون کسی کا	۱۲/	پھول اور کلیاں	۱۲/	الجھن	۱۲/
کمودنی	۱۲/	چوکھیر والی	۱/		

چند اور کتابیں

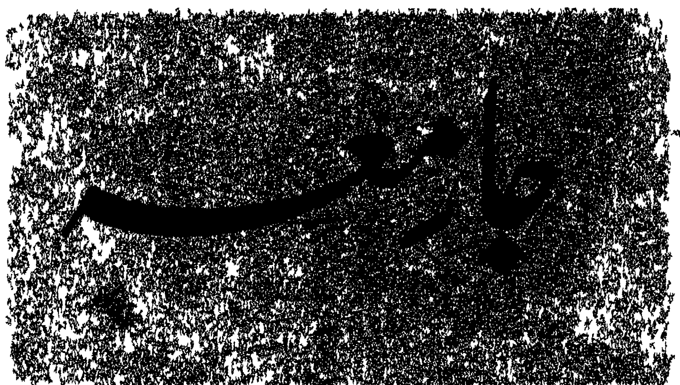
وقار حیات ۔ نواب وقار الملک کی سوانح عمری۔ مصنفہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ۲/

کارنامہ پہلوی ۔ رضا شاہ پہلوی کے حالات زندگی اور مملکت ایران کی داستان۔ از سید محمد حسن صاحب بلرامی ۱۲/

مناجات و نصائح ۔ خواجہ عبد اللہ انصاری کا فارسی کلام مع ترجمہ اردو۔ رنگ میں نہایت خوشنما چھپا ہے۔ ۱۲/

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲



مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴ نمبر ۹ | بابتہ ماہ جون سنہ ۴۵ء | سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن، محبوب المطابع پریس دہلی

غذا کی اصلاح و ترقی

ہندوستان کے جاہل اور ناواقف غریبوں کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ اُن کی تومالی مجبوریاں ہی اس بات کی اجازت نہیں دیتیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ یہاں کے پڑھے لکھے اور خوش حال بھی اپنی غذا کی اصلاح و بہتری کے لئے وہ کوشش نہیں کرتے جو ضروری ہے۔ صحت توانائی اور خوش مزاجی کا مدار بڑی حد تک غذا کے ٹھیک ہونے پر ہے۔ جس گروہ کی غذا صحت بخش اور غذائیت کے جملہ اصول کے لحاظ سے مکمل ہے اس کی کارکردگی کی اہلیت بھی اعلیٰ ترین ہوگی اور دوسرے گروہوں کے مقابلے میں اس کی کامیابی کے مواقع بھی نسبتاً زیادہ ہوں گے۔ ہندوستان کے بعض مؤرخوں نے اس ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی کامیابی کا ایک سبب اُن کی بہتر غذا کو قرار دیا ہے۔ اسی طرح بعض معاشیین نے مختلف گروہوں کی اہلیت کارکردگی کا موازنہ کرتے وقت، غذا کے فرق کو، کارکردگی کے فرق کا ایک اہم سبب قرار دیا ہے۔ اس لئے قوم کی اصلاح و ترقی کی تمام تحریکوں میں غذا کی اصلاح و ترقی کی بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہیے۔ خصوصاً ہماری تعلیم گاہوں میں جہاں تعلیم کے اور دوسرے بہت سے تجربے کئے جاتے ہیں اور تعلیم کے ترقی یافتہ طریقوں کو سوچ کر نکالا جاتا ہے وہاں اُن کے دارالاقاموں میں غذا کے بارے میں تجربوں کو بھی امتیازی حیثیت حاصل ہونی چاہیے اور صدر مدرسہ کو یہ کام یا تو خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے یا اپنے کسی دوسرے نہایت قابل اور معتمد رفیق کے سپرد کرنا چاہیے۔ اصلاح رسوم و معاشرت کی جہاں اور دوسری بہت سی تحریکیں ملک و قوم میں چلائی جاتی ہیں وہاں اصلاح غذا کی تحریک بھی نہایت زور شور کے ساتھ چلانی چاہیے۔

اس بیان کی تائید میں اعداد و شمار تو موجود نہیں ہیں، لیکن خاصے وسیع مشاہدہ

ہے اس قسم کا ایک عام اثر ضرور قبول کیا جا سکتا ہے کہ شہر میں رہنے والے مسلمانوں کا معیارِ صحت اپنی ہمسایہ اقوام کے مقابلے میں تیزی کے ساتھ گرتا چلا جا رہا ہے۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے جتنے جاندار، چھیلے اور ورزشی جوان مسلمانوں میں نظر آیا کرتے تھے اب نظر نہیں آتے اور اس زوال کا ذمہ دار بہت بڑی حد تک ان کی غذا کی خرابی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاص کر شہر کی مسلمان عورتوں میں تپ دق اور دوسری ضعف آور بیماریوں میں جو ترقی ہو رہی ہے اس میں ناقص غذا کا بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں سے قطع نظر ہندوستان کی عام آبادی کے بارے میں ماہر ڈاکٹروں کے کمیشن تحقیقات کر چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ تحقیقاتوں کے نتائج ابھی درج کئے جائیں گے۔ لیکن اس مسئلے کے بہت سے دوسرے پہلو ابھی تک تحقیقات طلب ہیں اور غذا کی اصلاحی تحریک چلانے والے لوگوں کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ وہ علمی تلاش و تحقیق کے ذریعے ان تاریک پہلوؤں کو روشنی میں لائیں۔

غذا کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن چیزوں کو غذا میں شامل کیا جائے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کس مقدار، تناسب شکل اور اوقات میں ان مختلف اشیاء کو استعمال کیا جائے۔ تیسرا سوال اُن کے پکانے سے متعلق ہے اور پکانے کے ساتھ ایک ضمنی سوال ایندھن اور اس کے طریقۂ استعمال کا بھی ہے۔ چوتھا پکانے اور کھانے کی جگہوں، برتنوں اور کھانا پکانے والوں کی صفائی اور ستھرائی سے متعلق ہے پانچواں کھانے کے برتنوں کی نوعیت اور تعداد سے۔ چھٹا کھانے کو سلیقہ اور خوش مذاقی کے ساتھ چننے اور تقسیم کرنے سے اور آخر میں سب سے اہم لاگت اور مصارف کا ہے یعنی "کم خرچ اور بالانشیں" بننے کا ——— یہ سب باتیں توجہ اور ترقی کی مستحق ہیں اور قوم کو مہذب اور شائستہ بنانے کے لئے ان سب کی تہذیب و درستگی ضروری ہے۔

غذا کی اصلاح و ترقی ہی سے متعلق لیکن اوپر درج کئے ہوئے تمام مسئلوں سے

زیادہ بنیادی ایک اور مسئلہ ہے یعنی زمین و آبادی کے باہمی توازن کا مسئلہ یعنی یہ سوال کہ زمین کے اندر، آبادی کے لئے غذا کی مختلف چیزوں کو فراہم کرنے کی صلاحیت کتنی اس وقت موجود ہے اور اسے کتنا اور کس طرح اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب پر بقیہ اور تمام سوالوں کا جواب منحصر ہے۔ کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آبادی کی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ زمین کے اندر وسائل غذا کو وسیع کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس وقت تک یہ توقع قائم کرنا کہ کسی ملک کی آبادی کے لئے بہتر اور مکمل غذا مہیا کی جا سکے گی۔ فضول ہے۔

اس مختصر مضمون میں ان تمام مسئلوں پر تفصیلی بحث کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں اور اپنے قارئین کے اشتراک عمل سے ممکن ہے ہم اس موضوع کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے خیال کو بھی پیش کر سکیں۔ لیکن آج کی صحبت میں ہم صرف چند بنیادی امور کو پیش کریں گے۔

کچھ عرصہ ہوا ہندوستان کے اعلیٰ ترین طبی افسر، سر جان میگا کی زیر نگرانی چھ سو ڈاکٹروں نے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نمونہ کے زراعتی دیہاتوں میں بسے ہوئے تھے، ایک مفصل تحقیقات اس بات کی کی تھی کہ ہندوستان میں غذا کی کمی کی صورت حال کیا ہے؟ ان کی اس تحقیقات کے نتائج کو ذیل کی جدول کی صورت میں درج کیا جاتا ہے۔

صوبہ	زیر بحث مجموعی تعداد	مزروعہ ایکڑ اول کی تعداد کا اوسط فی خاندان	ارکان کی تعداد کا اوسط فی خاندان۔	تناسب فی صد جنھیں اچھی طرح خوراک مل رہی تھی۔	تناسب فی صد جنھیں کم خوراک مل رہی تھی۔	تناسب فی صد جنھیں بہت خراب خوراک مل رہی تھی۔	دودھ کے استعمال کا اوسط فی بالغ شخص اونسوں میں۔	بچوں کی شرح اموات پہلے سال کے دوران میں فی ہزار نومولود	زچگی کی شرح اموات فی ہزار نومولود
آسام	۲۲ ہزار ۵۵۲	۶٫۹	۵٫۶	۵۳	۳۸	۹	۲٫۳	۲۵۰	۲۶٫۴
یو پی	۲۵ ہزار ۵۵	۱٫۶	۵٫۴	۴۰	۳۹	۲۱	۵٫۰	۳۰۳	۱۸٫۰
سی پی	۸۵ ہزار ۱۰۳	۱۶٫۵	۵٫۰	۳۲	۵۰	۱۸	۰٫۸	۲۹۶	۸٫۲
مدراس	۲ لاکھ ۸۰ ہزار ۳۷۷	۶٫۳	۵٫۰	۴۶	۳۶	۱۸	۱٫۷	۱۹۸	۱۳٫۲
بنگال	۹۴ ہزار ۹۲۱	۵٫۰	۵٫۵	۲۲	۴۷	۳۱	۲٫۰	۱۸۹	۲۹٫۲
برما	۳۵ ہزار ۸۴۷	۵٫۷	۵٫۸	۴۲	۴۰	۱۸	۳٫۰	۲۴۲	۲۶٫۶
پنجاب	۱ لاکھ ۸ ہزار ۸۱۳	۱۷٫۳	۶٫۲	۴۲	۳۸	۲۰	۱۰٫۰	۲۰۶	۱۸٫۷
بمبئی	۴۸ ہزار ۷۰۰	۱۳٫۸	۵٫۲	۴۵	۴۴	۱۱	۴٫۰	۲۱۴	۲۰٫۱
برطانوی ہندوستان	.. ..	۸٫۴	۵٫۳	۳۹	۴۱	۲۰	۳٫۵	۲۳۲	۲۴٫۵

اس تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ۳۹ فی صد آدمیوں کو کافی غذا مل رہی تھی۔ ۴۱ فی صد کو کم غذا مل رہی تھی اور فی صد ایسے تھے جن کو بہت خراب غذا مل رہی تھی۔ بنگال کا تناسب سب سے خراب تھا یعنی علی الترتیب ۲۲ فی صد، ۴۷ فی صد اور ۳۱ فی صد۔ اس رپورٹ کے خاص خاص نتائج کا خلاصہ یہ تھا کہ (۱) تقریباً ۴۰ فی صد دیہات میں آبادی غذا کی رسد کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کو بہت کم خوراک مل پاتی ہے (۲) عمر طبعی کا اوسط اس اوسط کے مقابلے میں جو ممکن ہے نصف ہے۔ (۳) غذا کی قلت یا قحط کے زمانے ہر دسویں سال ہر پانچ دیہات میں سے ایک نہ ایک میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں کوئی غیر معمولی امساک باراں واقع نہیں ہوتا (۴) شرح اموات کے بہت زیادہ ہونے کے باوجود آبادی میں غذا اور دوسری اشیاء کی پیداوار کے مقابلے میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی صورت حال کے تشویش ناک ہونے کا ثبوت زائد آبادی کی دوسری مشہور و معروف بالواسطہ علامتوں سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً لوگوں کا ڈیل ڈول کم ہونا، ان کی شرح اموات کا زیادہ ہونا۔ شیر خوارگی اور زچگی کی اموات کا زیادہ ہونا۔ افلاس کی وجہ سے پیدا ہونے والے امراض کا وسیع طور پر پھیلا ہوا ہونا، قحط سالی اور وباؤں کی وجہ سے بہت زیادہ جانوں کا تلف ہونا، ہندوستان میں متوقع عمر کا اوسط انگلستان کے مقابلے میں نصف ہے، شرح اموات دگنی سے زیادہ ہے۔ شیر خوارگی کی اموات تقریباً تین گنا ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے کئی ملکوں نے گذشتہ ۶۰ سال میں اپنی متوقع عمر کے اوسط کو بارہ سال بڑھا کر ۶۲ کر لیا ہے، بعض ملکوں میں اسے تقریباً دوگنا کر لیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اسی دوران میں ترقی صرف ایک سال کی ہوئی ہے، یعنی ۲۵ سے ۲۶ سال کی۔

ناقص تغذیہ | تغذیہ اور صحت کے نقطۂ نگاہ سے جس قدر غذا کی مقدار اہمیت رکھتی ہے اتنی ہی اس کی نوعیت کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اس معاملے میں بھی ہندوستان کے حالات ناقابلِ اطمینان نظر آتے ہیں۔ کیونکہ جو محدود غذا مل سکتی ہے وہ اپنی غذائیت کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہے۔ زمین کی زرخیزی تدریجی طور پر ختم ہوتی جا رہی ہے۔ نو توڑ زمینیں ادنےٰ درجے کی ہیں اور رقبہ زیر جوت برابر مختصر اور منتشر ہوتا جا رہا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کم سے کم غذائیت رکھنے والے اناجوں مثلاً جوار، باجرہ مکّی کی کاشت زیادہ غذائیت رکھنے والے اناجوں مثلاً گیہوں اور چاول کے مقابلے میں بڑھائی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ۱۹۱۰ء کو بنیادی سال قرار دیا جائے تو جو کی پیداوار کا اشاریہ ۱۹۳۸ء کے لئے ۱۵۷ ہوتا تھا، جوار کے لئے ۲۱۰۰ لیکن چاول کے لئے صرف ۱۰۳ر۵ اور گیہوں کا (۱۹۳۵ء میں ۹۷ر۸ تک گھٹنے کے بعد) ۱۰۴ر۲ تک بڑھ گیا تھا۔ اس صورت حال میں اور زیادہ خرابی اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسی ترکاریوں، حیوانی غذاؤں اور دودھ کی پیداوار کا استعمال جن میں حیاتیں اور پروٹین (لحمیہ اجزاء) ہوتے ہیں کم کیا جاتا ہے۔ پھلوں اور ترکاریوں کا رقبہ جس میں مصالحوں کا رقبہ بھی شامل ہے کل بوئے ہوئے رقبہ کا صرف ۳ فی صدی ہوتا ہے۔ اس ملک میں دودھ کا استعمال فی کس صرف ۷ آونس ہے۔ درآں حالیکہ برطانیہ میں یہ ۳۹ ۵، ڈنمارک میں ۴۰، نیوزی لینڈ میں ۵۷، فن لینڈ میں ۶۳، آونس ہوتا ہے۔ ذیل کے نقشے میں ڈاکٹر آکیرائڈ نے ایک عام غیر متوازن غذا کو اور اس کے بالمقابل ایک متوازن غذا کو جسے اس کی جگہ استعمال کرانا چاہیے پیش کیا ہے:-

	آونس فی یوم	
	عام غیر متوازن غذا	مجوزہ متوازن غذا
اناج	۲۰	۱۵
دال	۱	۳
ترکاری :-		
سبز پتوں والی	۲	۴
بغیر پتوں والی	۲	۶
چکنائی اور تیل	۰ر۵	۲
پھل	۰۰	۲
دودھ	۲	۸

سرجان میگا اور ڈاکٹر ائیکرائیڈ کی تحقیقاتوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہمارے جثہ وجسامت کے معیار کا پست ہونا اور بیماری اور موت کا آسانی سے شکار بن جانا دراصل غذا کی کمی اور اس کی خرابی کا نتیجہ ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ اور دوسری جنگ عظیم کی ابتدار کے درمیانی زمانے میں برطانیہ عظمیٰ میں حفاظتی غذاؤں کا استعمال تقریباً ۸۰ فی صد بڑھ گیا تھا اور ۱۹۳۸ء میں جو لڑکے اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوکر نکل رہے تھے وہ اپنے والدین کے مقابلے میں جب ان کی عمر بھی اتنی ہی تھی، دو یا تین انچ زیادہ لانبے تھے ہندوستان میں اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ یہاں بھی اس قسم کی ترقی ہوئی ہے۔ بلکہ عام مشاہدہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے بالکل برعکس رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً دودھ کا استعمال برطانیہ عظمے میں ۱۹۳۸ء میں ۷۵۴ ملین گیلن تھا جو ۱۹۴۱ء میں ۹۴۵ ملین گیلن ہوگیا یعنی ۲۵ فی صدی

بڑھ گیا۔ لیکن دودھ کی فروخت کے بارے میں جو تازہ ترین رپورٹ شائع ہوئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان ہندوستان میں دودھ کا استعمال فی کس ۱۲ فی صدی گھٹ کر ۵٫۸ آؤنس رہ گیا تھا۔

ہندوستان کی قومی صحت اور کارگذاری کا مسئلہ بنیادی طور پر معاشی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر آئیکرائیڈ کے بیان کے مطابق اُن کی مجوزہ متوازن غذا کے مصارف جنگ سے قبل کی قیمتوں کے حساب سے پانچ سے چھ روپئے ماہانہ فی کس ہوتے تھے اس کے مقابلے میں دیہات کی موجودہ غیر متوازن غذا کے مصارف ڈھائی روپیہ ہوتے تھے اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام کی قوتِ خرید جب تک کم سے کم دوگنی نہ ہو اس وقت تک وہ بیش قیمت متوازن غذا کا استعمال نہیں کرسکتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہندوستان کے دیہات کے اوسط درجے کے خاندان میں دو بالغ اور تین بچے ہوتے ہیں تو متوازن غذا کا معیار حاصل کرنے کے لئے دو سو بیس روپے سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ڈاکٹر راؤ نے ہندوستان کے لئے سالانہ آمدنی کا تخمینہ فی کارکن صرف ۱۸۰ روپے کیا ہے اور دیہات کے کارکن کے لئے ان کا تخمینہ اور بھی کم یعنی ۱۳۵ روپیہ ہے۔ غرض نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی کثیر تعداد کی آمدنی اتنی کم ہے کہ وہ متوازن اور کافی غذا کا انتظام کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

اس لئے ہندوستان میں غذا کی مقدار کو بڑھانا اور اس کی نوعیت کو بہتر کرنا دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ہماری کوشش صرف موجودہ رسد میں اضافہ کرنے تک محدود نہ رہنا چاہیے۔ بلکہ اس کے اندر تنوع، غذائیت اور فارغ لبالی بھی پیدا کرنا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ غذا پیدا کرنے کی ایک دلیرانہ اور ہمہ گیر پالیسی اختیار کی جائے اور اس میں خاصی توجہ اِن اناجوں، ترکاریوں اور حیوانی غذاؤں کی طرف کی جائے جن میں غذائیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً گیہوں

دودھ، انڈا، گوشت، مچھلی وغیرہ جو تندرستی اور کارگزاری کے بہتر بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ پیدائش کی اس مہم کے ساتھ عوام کو حسب ذیل امور کے بارے میں بھی تعلیم دینا ضروری ہوگی کہ مختلف غذاؤں میں کتنی غذائیت پائی جاتی ہے۔ کھانے پکانے کے بہترین طریقے کیا ہیں اور تندرستی اور صحت میں باہم کیا تعلق ہے

اس ذیل میں ہم اپنے قارئین کی توجہ ان پمفلٹوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو کونور کی تحقیقات تغذیہ کے معمل کی طرف سے شائع کیے گئے ہیں

ان کے ہیلتھ بلیٹن نمبر ۲۳ کے صفحہ ۱۱ پر حسب ذیل عبارت درج کی گئی ہے۔

انسانوں خصوصاً بچوں کی بہترین نشو و نما کسی ایسی غذا سے نہیں ہو سکتی جو زیادہ تر اناجوں مثلاً چاول جوار باجرہ وغیرہ پر مشتمل ہو اور جس میں دوسری غذاؤں کا اضافہ ناکافی طریقے پر کیا جائے۔ اس قسم کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے انھیں دودھ سبزترکاری، انڈے اور پھل وغیرہ کی خاصی مقدار استعمال کرنا چاہیئے۔ ان کو بعض وقت "حفاظتی" غذا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں لحمی اجزا حیاتین اور معدنی نمکوں کی کثرت ہوتی ہے اور یہ جسم کو بیماری سے اس صورت میں محفوظ رکھتی ہیں۔ جب کھانے میں کم غذائیت رکھنے والے عناصر مثلاً مشین میں کوٹا ہوا چاول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کاڈ لیور آئیل کو جس میں حیاتین الف اور د بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ نہایت قیمتی "حفاظتی" غذا سمجھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی غذائیں عام طور پر اس لئے ناقص ہوتی ہیں کہ ان میں حفاظتی غذا کی کافی مقدار شامل نہیں ہوتی۔ اس کا خراب اثر خصوصیت کے ساتھ شیرخوار بچوں نمو پذیر نوجوانوں۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں پر پڑتا ہے۔

ان لوگوں کے لئے جو کسی ادارے کی طرف سے بچوں کی نگہداشت پر مامور کئے گئے ہوں۔ نیز ان تمام لوگوں کے لئے جو عملی زندگی میں غذا کی فراہمی سے تعلق رکھتے ہوں

اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ ایک غیر متوازن اور ناقص غذا کا تندرستی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً کسی ایسی غذا کا جو زیادہ تر مشین سے نکالے ہوئے اناج پر مشتمل ہو اور جس میں لحمی مادے، معدنی نمک اور حیاتین ناکافی مقدار میں ہوں۔ ہندوستان کے ایسے امراض کی جو تغذیہ کی خرابی کی وجہ سے عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طویل فہرست تیار کی گئی ہے۔ مثلاً بیری بیری حمل کے زمانے میں خون کی کمی۔ کیراٹومیلیشیا اوسٹیومیلیشیا خرابی تغذیہ کی ایسی صورتیں جن میں لوگ کسی سخت بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے تو بہت زیادہ عام ہیں۔ جسم کی نشو ونما کو معمول کے مطابق رکھنے کے لئے متوازن غذا کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ اگر بچے کو خراب غذا ملے گی تو وہ اپنی عمر کے مقابلے میں چھوٹا اور دبلا نظر آئے گا۔ اس کا وزن لمبائی کے مقابلے میں اوسط سے کم ہوگا۔ وہ آسانی سے بیمار پڑ جایا کرے گا۔ اسکول کے بچوں میں چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا تدارک غذا کو بہتر بنا کر کیا جا سکتا ہے۔ کم یا خراب غذا کھانے والے بچوں میں ایک جمود، زندہ دلی کی کمی، کام اور کھیل میں جوش کا فقدان عام طور پر نظر آئے گا۔ کھال کی حالت بھی تغذیہ کے نقص کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔ کھردری خشک کھال یا ایسی کھال جس پر پھوڑے پھنسیاں نکلتی رہتی ہوں، اس بات کی علامت ہے کہ غذا ناقص ہے۔ خاص طور پر حیاتین "الف" کی کمی ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ایک اچھے کھلائے پلائے جانور کے بالوں میں چمک، دمک اور نرمی اور چکنائی ہوتی ہے جو خراب غذا کھلائے ہوئے جانوروں میں نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک اچھے کھلائے پلائے آدمی کی کھال میں بھی چمک اور تندرستی کی دمک ہوتی ہے۔ روشن صاف آنکھیں بھی قابل اطمینان تغذیہ کی نشانی ہیں۔ زیر دپ تھلیا (یعنی ورم چشم) یا خشک آشوب چشم اس لئے ہوتی ہے کہ حیاتین الف غذا میں کم ہوتے ہیں۔ منہ اور زبان میں چھالے اور باچھوں میں زخم ان بچوں میں نظر آتے ہیں جنھیں خوراک اچھی نہیں ملتی۔ اچھے

کھلائے پلائے بچے کی زبان چکنی اور یکساں رنگ کی ہونی چاہیئے۔ اور اس پردانے ، خراش اور لعاب دار جھلی سے خالی جگہیں نظر نہ آنا چاہئیں۔ اس قسم کے خلل جو عموماً مشین کے کٹے ہوئے چاول کھانے والوں میں ملتے ہیں حیاتین کی کمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کو دودھ کی مقدار بڑھا کر تیزی سے اچھا کیا جا سکتا ہے۔ مسوڑھوں میں دبانے سے خون نکلنا یعنی ہلکی اسکروی (مسوڑھوں کا پھولنا اور خارش) حیاتین ' ج ' کی کمی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ تازہ پھل اور ترکاریاں کھلائی جائیں۔

<u>غذائیت پر پکانے کا اثر</u> کھانے کی چیزوں پر گرم کرنے اور پکانے اور ہندوستان میں کھانا تیار کرنے کے جو طریقے عام طور پر رائج ہیں ان کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس بارے میں کافی معلومات موجود نہیں ہیں۔ حیاتین ج معمولی گرمی سے ضائع ہوجاتے ہیں۔ اس لئے غذا میں کچھ بغیر پکائے ہوئے پھلوں کا شامل کرنا مناسب ہے جب کھانے کو بہت زیادہ پانی ڈال کر دیر تک پکایا جاتا ہے تو اس کے کچھ حیاتین اور نمک پانی میں مل جاتے ہیں ، اور جب پانی کو علیحدہ کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ چاول کے دھونے اور پکانے میں بہت خاصا فاسفورس ضائع ہوجاتا ہے۔ رنگ کو قائم رکھنے یا جلد گلانے کے لئے جب پانی میں سوڈا ملا کر پکایا جاتا ہے تو اس سے حیاتین ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس تیزابی چیزیں مثلاً املی کو جب پکانے کے پانی میں ملایا جاتا ہے تو اس سے حیاتین کا تحفظ ہوجاتا ہے۔ گھی کو جب کھلے کڑھے میں دیر تک گرم کیا جاتا ہے تو حیاتین الف ضائع ہوجاتا ہے۔ کچے اناجوں میں فاسفورس بہت خاصا موجود ہوتا ہے لیکن پکانے سے بہت کافی ضائع ہوجاتا ہے۔

غذا کی اصلاح و ترقی کا موضوع ہماری اولین توجہ کا مستحق ہے اور اس کے لئے باقاعدہ تحریک چلانے کی ضرورت ہے تاکہ غذا کے نقائص اور خرابیوں کو دور کیا جا سکے۔

ننھے کے سوالات

آپ کے ننھے آئے۔ یوں سمجھئے کہ آپ پر اچھی خاصی فرائض کی پوٹ نازل ہوگئی۔ دوسروں کے لئے شرارت کی اور آپ کے لئے فرائض کی۔ کھلائی پلائی اور پھر اس کی پڑھائی۔ آپ بھی جی میں کہتے ہوں گے۔ اچھے فتنۂ خوابیدہ کو چھیڑ بیٹھے ہیں مچلنے لگا تو اُسے تسکین دینے کے لئے جو نہ کرنا تھا وہ بھی کرنا پڑا۔ ابّا ابّا کہتے تھے۔ کیسے سکھ میں رہتے تھے اب ابا جو کہلوایا۔ کتنا دکھ پایا۔

ان کاموں میں سے ایک تعلیم کا کام ہی تھا۔ لیجئے اس کا حل تو آپ نے چٹکیوں میں کردیا۔ ننھے کے ابّا بننے کا شوق جب پرانا ہوچلا۔ تو جی میں آیا۔ کہ لکھے پڑھے ننھے کا ابّا بننا چاہیئے۔ لیجئے ننھے کے لئے ایک کتابوں کا بیگ خرید دیا گیا۔ بیگ بے چارہ ابھی مشکل سے گھر پہنچ پایا تھا، کہ گھر بھر کے بچوں نے ہلّہ بول دیا۔ بہت کھینچا تانی رہی۔ بہت کش کش کے بعد ننھے بیگ کاندھے پر لٹکا کے لگے ڈاک بانٹنے۔ مگر اندر ہاتھ ڈال کر جو دیکھتے ہیں۔ تو چیٹھی کی بجائے قاعدہ نکلا۔ یہ ان کی تعلیمی زندگی کا پہلا حادثہ تھا۔ ایک ہاتھ میں بیگ، دوسرے میں تختی۔ اور جیب میں قلم تراش۔ لیجئے آپ نے ننھے سپاہی کو خوب مسلح کردیا۔ اور فخر سے یوں محسوس کررہے ہیں۔ گویا کہیں سرکاری خدمت پر "لام" میں بھیج رہے ہیں۔ یہ حضرت آگے نہتے کیا کم تھے۔ جو آپ نے اتنے کچھ ہتھیاروں سے سجا دیا۔ اب ان کا فرنٹ کیا ہے۔ یہی سکول فرنٹ۔ اور غنیم! جو سامنے آجائے۔

آپ تو یہ کچھ کرکے اپنے خیال میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہوگئے۔ معلوم ہوتا ہے۔ منوں بوجھ آپ کے کندھے پر سے ٹل گیا ہے۔ مگر آپ نے کبھی اپنے جی سے

یہ بھی پوچھا کہ کیا سچ مچ ٹل گیا۔ یا ابھی تک ڈیماکلیس کی تلوار کی طرح ایک بال کے سہارے سر پہ لٹکا ہوا ہے۔ انسانی سیرت کی تعمیر کا کام اتنا ہی آسان ہوتا تو اللہ میاں اتنے پیغمبر رسول اور مصلح بھیجنے کی بجائے فرشتوں کو استاد اور ان کے گرو کو انسپکٹر بنا کر نہ روانہ کر دیتے۔

سچ تو یہ ہے تعلیم کا کام اکیلے استاد کے بس کا نہیں ہے۔ یہ تو پوری سماج کا کام ہے۔ اس عمل میں آپ بھی شریک ہیں۔ استاد بھی ہے۔ اور ماں باپ بھی یہ کام کرنے کا ہے، کئی ایک کے۔ کیا سبھی کے کرنے کا ہے!

آپ ننھے کو غور سے دیکھئے۔ اس کی صورت ہمہ تن سوال ہے۔ روٹی کپڑے کا سوال نہیں یہ زندگی اور اس کے مسائل کا سوال ہے مجھے تو ہر سوالیہ جملے کے بعد نشانِ استفہامیہ (Mark of interrogation)؟ ایک ننھے منے کا منہ سا معلوم ہوتا ہے۔ جو ہم سے سوال کرنے کے بعد شرارت آمیز حیرانگی سے کھڑا ہو کے رہ گیا ہے اور آنکھوں سے کہہ رہا ہے۔ واہ صاحب اتنے بڑے ہوگئے اور یہ سوال بھی نہ آیا۔

آپ نے اکثر ننھے کو سوال کرتے دیکھا ہوگا۔ سوال کرتے کیا۔ سوالوں کی بوچھار کرتے دیکھا ہوگا۔ وہ تو سوالات کی مشین گن ہے۔ اس کے چھرّے کیوں؟ کیسے؟ کس لئے؟ ہیں۔ جو ان سوالات کی باڑ کی تاب نہیں لا سکتا۔ ان کا صحیح توڑ نہیں جانتا۔ وہ انسانی محاذ کا اچھا اور کارآمد سپاہی نہیں۔ پھر اگر بیچارہ سوال نہ کرے تو کیا کرے وہ بھی اس دنیا کا نیا نیا مسافر ہے۔ اس کی راہوں سے انجان اس کے گلی کوچوں سے ناآشنا ہے۔ رہ رہ کر اپنے بڑوں سے پوچھتا ہے۔ جواب نہیں ملتا تو دل میں عزیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ عجب بستی ہے۔ نئے راہیوں کو راستہ تک نہیں بتاتے۔ مدرسے میں تو اکثر ماسٹر صاحب ایسے پے در پے سوال کرتے

ہیں۔ کہ ننھے کو کچھ پوچھنے کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔ کئی ایک دن سے ننھے کا رہ رہ کر سوال پوچھنے کو جی چاہتا تھا۔ ماسٹر صاحب سے تو ہمت نہ پڑی۔ امی سے ہی پوچھ بیٹھے۔ بولے امی جان! میں جانوں ہمارے ماسٹر صاحب کو کچھ آتا جاتا نہیں تبھی تو بار بار ہم ہی سے پوچھتے ہیں۔ ننھے کو اس کا شدید احساس تھا کہ وہ مدرسے میں بھی کچھ پوچھ نہیں سکتے اس پر امی نے پیار سے کہا۔ بیٹا! اپنے ابا میاں سے پوچھ لینا۔ اس پر ننھے نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جس میں کئی ایک پرانی یادیں شامل تھیں۔

ابا کی چاند کچھ ہلکی سی ہو چلی تھی اور ننھے کے سر پر تو گویا کوئی جھاڑ اُگ آیا تھا۔ ایک دن امی سے پوچھنے لگے۔ امی ابا کے سر پر بال اتنے چھدرے چھدرے کیوں ہیں اس پر اماں بولیں۔ بیٹا! سوچتے ہیں نا بہت۔ لکھنے پڑھنے والوں کے سر سے اکثر بال جھڑنے لگتے ہیں۔ ننھے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بولے امی! پھر تمہارے بال اتنے گھنے کیوں ہیں! ہمیں یہ تو پتہ نہیں کہ اس کا جواب ہلکی سے ملا یا دست پناہ سے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ننھے کو یہ جواب مدتوں یاد رہا۔ اور انھوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ آئندہ کے لئے یہ ایک سوال ہی کافی ہے۔

ننھا بڑا احساس ہے۔ اس کی شدتِ احساس کا تو کبھی کبھی آپ کو بھی پتہ چل گیا ہوگا۔ اگر آپ نے ایک دفعہ اس کے سوال کا جواب بے رخی سے دیا۔ تو اس نے خدا جانے کتنی مرتبہ شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر اپنے ننھے بوٹ کی ایڑی کو زمین میں جما جما کر عہد کیا ہوگا کہ پھر نہ پوچھوں گا حشر تک نہ پوچھوں گا۔

آپ اکثر ننھے کے سوالوں سے جھنجھلاتے ہوں گے۔ آپ کا دل ہے کہ دفتر کے فائلوں میں لگا ہے۔ یا دکان کے بہی کھاتے میں الجھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جسم تو گھر میں لے آئے مگر اپنا دل میز کی دراز میں مقفل کر آئے۔ ایسی صورت میں ننھا آپ کے لئے ننھا نہیں۔ بلکہ ایک شے ہے۔ جیسے آپ کے میز پر کا غذات دبانے والا

پیپر ویٹ یا چابیوں کا گچھا۔ جس سے آپ غیر شعوری طور پر کھیلتے رہتے ہیں۔ وہ انسان نہیں بلکہ ایک شے ہے۔ گھر کی بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز۔ دوسری ذرا گھٹیا۔ یہ ان میں سے بڑھیا۔ مگر ہے ایک چیز

بات یہ ہے کہ آپ نے دنیا میں کچھ اتنے کام اپنے سر اوڑھ لئے ہیں کہ ننھا بے چارہ اُن کے ڈھیر میں گم سا ہوکر رہ گیا ہے۔ ممکن ہے اس کا آپ بُرا مانیں۔ مگر حقیقت ہے یہی۔ اس کوڑے کباڑ کے ڈھیر میں کہیں تو آپ کی سیاسی دلچسپیوں کے تراشے ہیں۔ حالانکہ نہ آپ لیڈر ہیں۔ نہ اللہ کے فضل سے لیڈر بننے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں کے ذاتی معاملات کے ملبے ہیں۔ اس میں کہیں خاندانی جھگڑوں کے پرانے گودڑ ہیں۔ اور ان سب سے اوپر کاروباری ساجھیوں اور دفتری ساتھیوں کے الجھیڑے اور ان کے نیچے آپ کی زندگی کا سرمایہ۔ وہ گوہر گراں مایہ یعنی ننھا گم ہو کے رہ گیا ہے۔ جہاں آپ اتنا کچھ وقت ان سب کے لئے نکالتے ہیں۔ کچھ ننھے کے لئے بھی نکال لیتے۔ ابھی تو وہ تھوڑا سا وقت لے کر بہت کچھ ممنون ہوگا اور بعد میں سارا وقت دے کر بھی آپ اُسے ممنون نہ کر سکیں گے۔

ننھے کے سوالات! اکثر آپ کہتے ہوں گے۔ ننھا کیا۔ اور اس کے ننھے منے سوالات کیا۔ لیکن سوالات کرنے والا جتنا ننھا منا ہوتا ہے۔ اس کے جوابات اتنے ہی زیادہ مشکل اور بنیادی حقیقتوں سے اتنے ہی گہرے طور پر وابستہ ہوتے ہیں ان ننھے منے سوالوں کے جواب اکثر فلسفی اور مفکر بھی نہیں دے پاتے۔

ابا آسمان گول کیوں ہے! تارے کیوں چمکتے ہیں۔ امی! میرے پر کیوں نہیں اُگے۔ ان میں آپ کے لئے دعوت فکر ہے۔ اور آہنگ عمل بھی۔

اور پھر سوالات تو نیکی اور خیر کا سا انداز رکھتے ہیں۔ جو پوچھتا ہے۔ وہ تو پھل

بانا ہی ہے لیکن جو جواب دیتا ہے۔ اس میں بھی ایک خوش گوار تبدیلی آ جاتی ہے۔ زندگی کے جس مسئلہ کی جانب سائل کی توجہ مبذول کی جاتی ہے، اس کی جانب اس کا پورا نقطۂ نظر اگر بدل نہیں جاتا تو کم ازکم ایک مرتبہ شدید جھٹکا تو لگتا جاتا ہے۔ ذہنی زندگی کے خشک سوتوں میں ہلکا سا انقلاب آجاتا ہے۔ بچوں کے لئے تو استاد استاد سبھی برابر ہوتے ہیں۔ کیا پروفیسر اور کیا پہلے درجے کے ماسٹر صاحب۔ دونوں علم اور روشنی کے مخزن اور ابلتے ہوئے چشمے۔ مگر ایک یونیورسٹی پروفیسر کے بچے کو یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کہ ان کے ماسٹر صاحب کے چہرے پر یہ بے رونقی ان کے لباس میں چیتھڑوں اور پیوندوں کا یہ گستاخانہ ہجوم کیوں ہے۔ انھیں یہ تو خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ استاد کی دنیا میں بھی حسب نسب کا اتنا کچھ تفاوت ہو سکتا ہے۔

ایک دن رہ نہ سکے۔ اپنے ابا سے پوچھ ہی بیٹھے۔ خدا معلوم ان کے ابا نے اس مشکل بے حد مشکل سوال کے جواب کو کیسے نبھایا ہوگا۔ اور پندرہ سو روپئے ماہوار کو پندرہ روپلی ماہوار سے کیسے بھڑایا ہوگا۔ خدا نہ کرے۔ آپ کا ننھا آپ سے کوئی ایسا سوال پوچھ بیٹھے۔ اتنا ضرور ہے کہ اگر پوچھے۔ تو یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ اس میں سب کچھ پلنے والا آپ کا ننھا ہی ہے۔ ممکن ہے آپ بھی اس سودے میں گھاٹے میں نہ رہیں۔

ممکن ہے آپ بے حد عدیم الفرصت ہوں۔ یا معلومات کی دنیا سے زیادہ عقیدت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن ننھے کے سوالوں کا جواب نہ تو اکثر کچھ ایسا مشکل ہوتا ہے۔ نہ دیر طلب۔ ایک ہمدرد جواب دینے والے کے لئے اور ماں باپ سے زیادہ ہمدرد کون ہو سکتا ہے۔ جواب دینا اور بھی آسان ہوتا ہے۔ ان کی زبان ہی نہیں۔ ان کی نگاہیں، ان کے دل۔ ان کی پوری شخصیت جواب کی ترجمان ہوتی ہے

جواب دینے میں یہ ضروری ہے ۔ کہ کیا کچھ بتایا جائے ۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری
یہ کہ کیا کچھ نہ بتایا جائے یعنی اس حد فاصل کا تعین جہاں تک راہبر اپنے انجان مسافر
کے ساتھ ساتھ رہے اور پھر جہاں سے کھڑا ہو کے دور سے اس پر اسرار بستی کے
چمکتے ہوئے گنبد دکھادے ۔ جس کا راز نتھا اس سوال کے ذریعے فاش کرنا چاہتا ہے
بعض غلط قسم کے راہبر کدال اور کلہاڑا لئے ننھے مسافر کے ساتھ ساتھ ہو لیتے ہیں
اور جب تک اس پر اسرار بستی کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دیتے اپنا ہاتھ نہیں روکتے
ایسے جواب دینے والوں کی نہ تو ننھے کو ضرورت ہے اور نہ تعلیمی عمل کو اور پھر اس
طرح تو ایک سوال کے جواب میں ہی دل ودماغ جواب دے جائیں گے ۔ فرصت کے
اوقات دم توڑ جائیں گے اور ہاتھ پاؤں دونوں شل ہو جائیں گے ۔

نتھا یہ نہیں چاہتا ۔ کہ آپ زندگی کے اسرار کو اس کے لئے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکئے
یہ اس کی ذہانت اور شخصیت کی اہانت ہے ۔ وہ تو آپ سے ان اسرار کی کچھ سن گن چاہتا
ہے ۔ راستے کے نشیب و فراز کا اندازہ لینا چاہتا ہے ۔ پھر چند ایک اوزار اور
ہتھیار چاہتا ہے ۔ خواہ وہ اس مضمون کی کتابیں ہوں ۔ یا تجربی سامان اور آلات
اس کے بعد وہ آپ کا دخل (اور آپ کا دخل یقیناً اس کے بعد دخل درمعقولات ہوگا)
نہیں چاہتا ۔ اس میں آپ کا بھی کچھ بھلا ہے ۔ آپ اسے تھوڑے وقت میں ایک نہیں
کئی ایک نئی دنیاؤں کا اتا پتہ بتا سکتے ہیں اور آپ کا کولمبس ایک امریکہ نہیں کئی ایک
امریکاؤں کے معلوم کرنے کا فخر حاصل کرسکتا ہے ۔

مولانا حالی کے سیاسی افکار

"شاعر اور ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں" اور ماحول انسانی ارتقا کی گود میں انجان طور پر پروان چڑھتا اور زمانے کی تبدیلیوں اور سیاسی تقاضوں کے دامن میں پرورش پاتا ہے! کیونکہ وہ قوموں اور ملکوں کی ترقی اور زوال کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہم اسی آئینے سے اس ادبی جوہر کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں جو ادب کی تبدیلی، ترقی اور نئے تقاضوں کی اصل بنیاد ہے۔ اردو ادب اپنی پیدائش اور نشوونما کے لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جو سامنت شاہی ایوانوں کی چہار دیواریوں میں مقید ہو کر صرف چند افراد کے جذبات کا آئینہ دار رہا۔ لیکن اس کے دوسرے دور کا آغاز غالب اور اس کے بعد سے نذیر، حالی، شبلی اور آزاد وغیرہ کی نئی ادبی تحریکوں سے ہوتا ہے اور اردو ادب کے اس دوسرے دور کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس پس منظر کے ماحول میں حالی کے سیاسی افکار پرورش پاتے اور پروان چڑھتے ہیں! حالی ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے جب کہ دولت مغلیہ کا آخری تاجدار "نزع کے عالم میں" ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس وقت انگریزی سوداگر مسکراتے ہوئے سرزمین ہند پر اپنی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرتے جا رہے تھے۔ حالی (۲۱) ویں برس میں قدم رکھنے ہی پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ایک غیر منظم بغاوت ہوئی جسے غدر کے غلط نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے ہزاروں خاندان نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے اور خاندان مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ اس بادِ صرصر کے جھونکے سے گل ہو گیا اور لکھنؤ کے نواب "مٹیا برج" میں بند کر دئے گئے۔ ان کی ان میں ہندی سیاست پلٹ گئی اور حکمران قوم پر اس قدر تباہی نازل ہوئی کہ وہ سیاسی حیثیت سے بہت دور

معاشی اور ثقافتی حیثیت سے مفلس ہوگئی۔ ان سیاسی واقعات سے متاثر ہوکر حالی اپنے مشن کو سے کر آگے بڑھتے ہوئے قوم کی زبوں حالی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں :-

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہوگئے۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ کہنہ رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے غافل اور بے پروا ہیں علما جن کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں"

نثر کے ساتھ ساتھ مولانا کی شاعری میں بھی ماحول کی کشمکش اور گردوپیش کی دم توڑتی ہوئی طاقتیں منعکس نظر آتی ہیں :-

کل کون تھے آج کیا ہوگئے ہم !
ابھی جاگتے تھے ابھی سوگئے ہم !

بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے !
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے !

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت ! نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت ! خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا !
غرض کی تواضع غرض کی مدارا !

ماحول شاعر کے لئے ایک ناگزیر تقاضا ہوتا ہے جو اُسے متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ "غالب کے بعد کے شعراء نے سیاسی حالات کا اثر خود تو قبول کیا لیکن اپنی ادبی زندگی کے آبگینے کو ایک زمانے تک ٹھیس نہ لگنے دی" اور یہی بات ابتدا میں حالی کے یہاں بھی پائی جاتی ہے لیکن جب سرسید اور ان کے دوسرے رفقاء نے جن میں سے ایک مولانا حالی بھی ہیں ایک نئے اصلاحی مشن کا آغاز کیا تو زندگی کی ان مختلف النوع تبدیلیوں کے ساتھ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی بدل گئے۔ اسی دور سے صنفِ غزل میں زوال اور نظم میں عروج و ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی سب سے نمایاں مثال حالی اور اسی اسکول کے دوسرے شعراء میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ گذشتہ عظمت کی یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں چنانچہ حالی کہتے ہیں کہ:-

یہ تکلیف و راحت ہے سب اتفاقی !
چلو اب بھی ہے وقت چلنے کا باقی !

"مسدس حالی" کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ طویل نظم جس میں قوم کو پیام دیا گیا ہے سرسید کے ایما سے لکھی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ بات ایک حد تک بالکل درست ہو۔ لیکن بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سرسید نے جبر کر کے مولانا سے یہ نظم لکھوائی تھی۔ ہم اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ شاعر اور ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اس لئے وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جب وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں تو یقیناً وہ اس کی عکاسی کرتے ہوئے مستقبل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ہمارے اس خیال کی تائید خود مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں کی ہے:-

"بغیر اقتضائے طبعی اور ولولہ باطنی کے جو شعر کہا جائے گا یا جو نظم

سرانجام کی جائے گی۔ اس میں زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے۔"

اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا۔ بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے۔"

مسدس حالی کا آغاز عرب کی زبوں حالی سے شروع ہوتا ہے چنانچہ مولانا دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ " میں نے اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی۔" مگر اس زبوں حالی کا تذکرہ وہ اپنے ہی انداز میں کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس مسدس میں طرز بیان کے لحاظ سے وہ تنوع نہیں پایا جاتا ہے جو "مرثیہ انیس" میں موجود ہے :-

بلند ایک ہوتا گرداں شرارا!
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا!
وہ بکر اور تغلیب کی باہم لڑائی! قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی!
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی! صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی!
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ!
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ!

حالی اپنے زمانے کا اصلاح پسند ادیب تھا وہ زندگی کے ہر زاویے کو اصلاح ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لئے مسدس میں یکسر تبدیلی کا نعرہ کہیں بھی نہیں پایا جاتا ہے۔ البتہ وہ ماضی کے ٹھہراؤ کو زمانے کے چال چلن کے ساتھ ملا دینا چاہتے تھے

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں! بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں!
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں! بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں!
مگر اک تمھی ہو کہ سوتے ہو غافل!
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل!

آگے چل کر وہ مسدس میں قوم کا دکھڑا یوں بیان کرتے ہیں:۔

وہ ملت کے گردوں پہ جس کا قدم تھا! ہر کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا!
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا! وہ اُمت لقب جس کا خیر الامم تھا!
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں!
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں!

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم! نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم!
نہ علموں پہ شایانِ اعزاز ہیں ہم! نہ صنعت و حرفت میں ممتاز ہیں ہم!
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں!
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں!

یہ ہیں ڈھنگ ان تازہ آفت زدوں کے! بہت کم زمانہ ہوا جن کو بگڑے!
ابھی اک عالم ہے آگاہ جن سے! کہ ہیں کس کے بیٹے وہ اور کس کے پوتے!
جنھیں دیس پردیس سب جانتے ہیں
حسب اور نسب جن کا پہچانتے ہیں!

اس نظم کو شروع سے آخر تک پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حالی نے یک سر اردو شاعری کے رجحانات کو بدل کر اس کو قومی زندگی کی عکاسی کا روپ دے دیا تھا انھوں نے شاعری کو ماضی اور حال کی نمایندگی کا جائز وارث قرار دیا لیکن مستقبل کی رہنمائی کا راستہ ٹھیک طور سے نہیں تبلایا اور یہی نقص آج بھی بہت سے ترقی پسند شاعروں میں پایا جاتا ہے۔ اس مسدس کے متعلق جس کو ایک سیاسی کتاب کا رتبہ دیا گیا ہے۔ خود مولانا فرماتے ہیں" کہ اس کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت دلانے کے لئے کی گئی ہے"۔ چنانچہ جب سرسید احمد خاں سے کسی نے سوال کیا کہ تم نے ہندوستان میں کون سی سیاسی خدمت انجام دی اور جب تمھارا خدا تم سے اپنی اس زندگی کا حساب

پوچھے گا تو کیا جواب دوگے، انھوں نے فوراً جواب دیا کہ :- "جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا، میں کہوں گا حالی سے 'مسدس' لکھوا لایا ہوں"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سے مولانا حالی انگریزوں سے اتنے بددل ہوگئے تھے کہ جب ان کو ۱۹۰۴ء میں "شمس العلما" کا خطاب ملا تو انھوں نے اپنے لڑکے کو خط لکھتے ہوئے انگریزوں سے اپنی بیزاری کا یوں ذکر کیا تھا:-

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے رشک و دو بیان کرتے ہیں مگر میرے لئے تو یہ ایک مصیبت ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا ______ بھلا میں کہاں اور یہ دردسری کہاں"

غدر کے بعد سے ہندو مسلمانوں میں جو سیاسی نفاق بڑھتا چلا جا رہا ہے مولانا اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے اس نفاق کو ختم کرنے کے لئے کئی مضامین لکھے چنانچہ ۱۶ جون ۱۹۰۵ء کو "ہندو مسلم اتحاد" کے عنوان سے اخبار 'اتحاد' میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو مسلمانوں میں یکجہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوگئے ہیں کہ جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں لیکن ہمارے اس امر کے باور کرنے کی کافی وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں تعلیم کی

ترقی ہوتی جائے گی، جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نااتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے اسی قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائے گا کہ بغیر اتفاق و یک جہتی دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور عزت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔"

یہ ہیں مولانا حالی کے سیاسی افکار، جن کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اگر ہمیں حالی کی حقیقی عظمت کا اندازہ لگانا ہے تو ہمیں موجودہ ادب کا پورے طور پر جائزہ لینا ہوگا اسی وقت ہم اُن کی صحیح عظمت اور اُن کے افکار کا پتہ لگا سکیں گے کیونکہ خود اردو زبان اپنے وجود کے لئے سیاسی اثرات کی رہین منت ہے۔ لیکن اگر غالب نے ہمارے ادب کے دھارے کو نہ بدلا ہوتا تو مشکل تھا کہ ہم حالی سے "مسدس" جیسی چیز حاصل کر سکتے اور اس طرح سے اگر حالی ہماری قومی زندگی کے معنوی وجود کو پوری طرح سے ہم پر آشکارا نہیں کرتے تو اقبال جیسے شاعر کے پیدا ہونے میں کافی عرصہ لگتا۔

سری نواس لاہوٹی

ہمارا انظر لفیانہ ادب

اس وقت اردو ادب ایک دورِ تغیر اور عہدِ اضطراب سے گذر رہا ہے۔ کسی ملک یا قوم کی زبان اور ادب کے آغاز و ارتقاء پر غور کیجئے تو یہی پتہ چلے گا کہ ادب ہمیشہ زندگی کے ساتھ کروٹ بدلتا رہا ہے۔ افراد کے رجحانات اور سوسائٹی کے خیالات ادب پر اپنے اثرات ہمیشہ مرتسم کرتے رہے ہیں۔ اور جیسے جیسے معاشرت کی جلا ہوتی ہے ادب میں بھی حسن و لطافت کا رنگ نکھرتا جاتا ہے۔

تاریخ ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ادب جس وقت تحقیق و تنقید کی روشنی میں آتا ہے تو نہ صرف گذشتہ ادبی اعمال کا حسن و قبح ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس کے ذریعے مستقبل کے راستے بھی نظر آتے ہیں۔ جب ادب میں تہذیب و شائستگی کے عناصر پورے طور پر داخل ہو چکتے ہیں تو مفکرین اسے مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنا شروع کرتے ہیں۔

ادب کے متعلق کیٹس (Keats) جیسے رومانی مزاج شعراء کا نظریہ یہ تھا کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیئے، کیٹس رومانی شاعری کا قائل ہے۔ جمالیات اس کے نزدیک اہم ترین چیز ہے۔ وہ حسن کو حقیقت اور حقیقت کو حسن سمجھتا ہے۔ اس لئے ادب میں وہ کسی منفعت یا افادیت کا شائبہ بھی نہیں چاہتا۔ اس کے برخلاف دورِ جدید کے ادبی رجحانات منفرد؟ ذہنی ادب پر تحقیقات کرنے والوں میں روسو، ارنلڈ، ٹالسٹائی اور مارکس وغیرہ نے آزادی کے ساتھ اپنی اپنی رائیں پیش کی ہیں۔ دورِ جدید کے ادبی رجحانات کا محور ارنلڈ کا یہ خیال ہے کہ ادب کو زندگی کی تنقید ہونا چاہیئے وہ اپنے اس نظریے میں شدت یا انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتا لیکن ٹالسٹائی اور بالخصوص مارکس ادب کو نہ صرف افادیت کے نقطۂ نظر سے پرکھتے ہیں بلکہ اسے پروپیگنڈے کا آلہ بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ادب

برائے زندگی ایک ضروری امر ہے اور یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ ادب اور حیات میں ہم آہنگی ہے۔ لیکن ہم آہنگی پیدا کرنے میں ادب کی اصلی روح یعنی حسن کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے اگر ایسا نہیں تو ادب، ادب نہیں رہتا۔ کچھ اور بن جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ادب کو صرف تخلیق حسن ہی کا تابع بنا دیا جائے۔ لیکن ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو مختلف نظریوں میں جو تضاد ہے وہ دور ہو سکتا ہے۔ ادب اگر بنیادی اور اساسی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے مقتضائے زمانہ کی نمائندگی کرے تو ادبی معیار حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس عمل میں اپنی بنیادی خصوصیات کھو بیٹھے تو اُسے صرف پروپیگنڈا یعنی فیلٹر کہا جا سکتا ہے۔

ہم اس وقت ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اور یہ ہمارے اور ہمارے ادب کے لئے بڑا نازک مقام ہے۔ دور جدید میں یعنی اس وقت ادب کی باگ ڈور مختلف الخیال لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے تین طبقے ہیں۔ ایک تو وہ جو ادب کو حسن کاری سمجھتے ہیں اور حیات انسانی سے زیادہ متقدمین کی پیروی سے اپنا ربط قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ صرف دل اور حسیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حقائق ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ دوسرے وہ جو ادب سے اس کی تمام حسن کارانہ خصوصیات چھین کر اسے اپنے ہر اس خیال کا عکس بنا دینا چاہتے ہیں جو کسی نہ کسی خاص حادثے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب، جنگ کا پروپیگنڈا، خودمختاری، صوبہ داری حکومت دینی تنظیم۔ مزدوروں کے مسائل۔ کسانوں کی مصروفیت۔ ساہوکاروں کے سود کا لین دین اور اجناس کی گرانی وغیرہ سے بحث کرنے کا نام ہے۔ اس ادب کو ترقی پسند ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو ادب کو نہ تو اس کے حسن و جمال سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اُسے مٹی کی مورت بنا کر پوجنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک ادب ان خیالات اور رجحانات کے مجموعے کا نام ہے جو اقتضائے زمانہ کی

پیداوار ہوں۔ لیکن ان میں لطف اور حسن کا پہلو بھی موجود ہو ہم اس نظریہ امتزاج کو اپنی حد تک درست اور مناسب خیال کرتے ہیں۔

ادبی ظرافت کے معیار کو بھی اسی نقطۂ نظر سے جانچنا ہے کہ آیا وہ صرف ظرافت برائے ظرافت کا رنگ رکھتی ہے یا محض پروپیگنڈا ہے یا حسن اور افادیت کا امتزاج۔ کیٹس کے نظریے کے مطابق ہمارا ظریفانہ ادب جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے تو ادب کی تعریف میں آجاتا ہے۔ لیکن جب ہم "افادیت" کی تلاش کرتے ہیں تو اس میں تنزل رسیدگی کی شان نہیں پاتے۔ اردو ادب میں بالعموم نہ تو اس کے داخلی پہلو پر زور دیا جاتا ہے اور نہ حقیقی افادیت پر۔ اور اس کا بنیادی سبب ہندوستان کے عام حالات تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے خوب لکھا ہے " اگر شائستہ قوموں کی انشاپردازی سوال کرے کہ اردو کی انشاپردازی کیوں اس حالت میں مبتلا رہی تو حاضر جوابی فوراً بول اٹھے گی کہ قوم کی انشاپردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے۔ اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔ جیسی ہندوستان کی تعلیم و شائستگی تھی اور بادشاہوں اور امیروں کی قدردانی تھی ویسی ہی انشاپردازی رہی اور خاتمہ کلام اس فقرہ پر ہوگا کہ کوئی پرندا اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اس کے بازو، فارسی سنسکرت، بھاشا وغیرہ تھے، پھر اردو ہماری انگلینڈ یا روم یا یونان کے محلوں پر کیوں کر جا بیٹھتی" (آب حیات صفحہ ۶۴)

ہماری ادبی ظرافت جو زیادہ تر نظم کی صورت میں پیش ہوئی اسی نظریے کی پیداوار ہے۔ مولانا حالی نے ظرافت کی بدحالی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس امر کو واضح کیا ہے کہ بادشاہوں کی سرپرستی نے (جس میں محمد شاہ رنگیلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں) ہمارے مذاق پر کیسے اثرات مترتب کئے ہیں۔ بہرحال اردو کی یہ ظریفانہ شاعری معیاری نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اس کا افادی پہلو زندگی کے کسی عالم گیر مسئلے سے متعلق نہیں

بلکہ ذہنی تفریح، خوشامد، انعام و اکرام کی خواہش پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ جعفر علی زٹلی، سودا انشاء اور مصحفی نے کسی نہ کسی سطحی پہلو کو پیش نظر رکھا اور ادبی ظرافت کو تصنع اور صرف فن کی حیثیت دی۔ سودا کے قصیدے شہر آشوب میں البتہ حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے مقصد کے اعتبار سے نظیر اکبر آبادی کے کلام میں عمل و حرکت کا ایک جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ظریفانہ شاعری میں واقعیت نگاری کی پہلی کرن نظیر کے کلام سے پھوٹتی ہے اور نظیر کی ظرافت سے اردو شاعری میں پہلی مرتبہ فرائڈ (Freud) کے اس نظریے کی اشاعت کا پتہ چلا کہ ظرافت نفسی توانائیوں کی حفاظت اور کفایت کے ساتھ اُن کے اظہار کا نام ہے۔ —————— ورنہ اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لئے انسان کی ظریفانہ شاعری موجود ہے۔ جس پر اسپنسر کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ظرافت زائد توانائی کی پیداوار ہے۔

نظیر اکبر آبادی نے حقیقت نگاری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد جن شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور کسی خاص مقصد کو اپنا نصب العین قرار دیا، اُن میں حالی اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی قابلِ ذکر ہیں۔ اس طریقے سے گویا ہماری ظریفانہ شاعری ارتقائی منازل طے کرنے لگی لیکن بیچ بیچ میں سلسلے ٹوٹتے رہے۔ حالی، اکبر اور شبلی تینوں ہم عصر ہیں۔ اس لئے اُن کے کلام میں ایک ہی عہد کے مسائل پر تنقیدی نکات ملتے ہیں۔ حالی اور شبلی کی حیثیتیں ظرافت نگار شاعر کے علاوہ اور بھی ہیں۔ لیکن اکبر اردو ادب میں ظرافت کے مقام پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں —————— اس لئے ان کی شاعری متنوع بھی ہے اور جامع بھی۔ ہم اکبر کے کلام کو بحیثیت مجموعی اردو ظریفانہ شاعری کا عروج تسلیم کرسکتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے بعد اردو ظریفانہ شاعری میں کوئی خاص تغیر و تبدل نظر نہیں آتا۔ ریاض خیر آبادی نے بھی ظریفانہ شاعری کی۔ لیکن ان کا میدان شاعری جدا گانہ

ہے۔ مقبول حسین ظریف نے البتہ اس رنگ کو نبھانے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس پس منظر اور استدلال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو ظریفانہ شاعری میں فنیت اور کمال کو زیادہ دخل ہے اور افادیت کا پہلو زندگی کے عالم گیر مسائل سے دور رہا۔

تاریخ ادب اردو کی عجب کیفیت یہ ہے کہ اس میں ادب نہ تو براہِ راست زندگی سے متاثر ہوا اور نہ براہِ راست ——— زندگی کو متاثر کرسکا۔ ہر بڑے آدمی کی قدرومنزلت اس کے عہد کے بعد ہوئی نظیر کی ظرافت نگاری اپنے عہد کے حالات پر کچھ اثر نہ ڈال سکی اس وقت کے معاشرے نے اس کی ظرافت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نظیر کی ظریفانہ شاعری کے چراغ کی روشنی ہماری آنکھوں پر اس وقت پڑی جب کہ حالات بدل گئے۔ اکبر الہ آبادی نظیر کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری اُن کے بعد میں تحقیق و تنقید کی روشنی میں دیکھی جانے لگی۔ لیکن نظیر ہنوز پس پردہ رہے حال حال میں نظیر کے ظریفانہ کمالات پر کچھ توجہ دی گئی۔ لیکن قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اکبر کی تنقیدی شاعری نے ہماری قومی غفلتوں کو دور کرنے میں کوئی عملی حصہ لیا ہے یا نظیر کی تیز شوخ نگاہی نے ہمیں ماضی سے درسِ عبرت لینے پر مائل کیا۔ اس لئے نظم کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ظریفانہ شاعری ملک و قوم کے لئے بہت کم مفید ثابت ہوئی۔

اردو ادب کی ظریفانہ نثر میں خارجی اور داخلی دونوں عناصر کا ہلکا سا امتزاج نظر آتا ہے۔ غالب کے خطوط اور سجاد حسین و سرشار کی ناولوں میں ہمیں حقیقی ظرافت اور شوخی کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن جب اودھ پنچ کے اردو لکھنے والوں پر ہم غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی اردو ظریفانہ نثر عوام کے رجحانات پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ نواب آزاد، مولوی محفوظ علی اور سلطان حیدر جوش اردو کے قدیم ظرافت نگاروں میں سے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں ہمیں تنقیدی نکات نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ

نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نظم کی بہ نسبت ہماری نثری ظرافت میں ابتدا سے اعلیٰ اثرات کام کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کی ظریفانہ نثر اب بھی تہی دامن اور منزل نارسیدہ ہے۔ ناول جو ادب میں اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ سراسر حیات انسانی کے عکاس ہوتے ہیں اردو میں ناپید ہیں۔ بالخصوص ظریفانہ ناول تو اردو میں پائے ہی نہیں جاتے۔ دوسری چیز تمثیل ہے۔ اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جب ہم مغربی ادب میں برنارڈ شا کے ڈراموں میں ظرافت کے اثرات پر غور کرتے ہیں اور اس کا مقابلہ اردو ادب سے کرتے ہیں تو اس کی تہی دامنی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ اردو میں ظریفانہ انداز کے اشعار اور مضامین بکثرت ہیں۔ جن کے متعلق بہ حیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر تقلیدی ہیں نہ تصنع اولاً درد کی پیداوار۔ تاہم فرحت اللہ بیگ۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس کے مضامین میں معیاری ادبی ظرافت کے عناصر پائے جاتے ہیں ان میں مزاح اور ظرافت کی شان بھی ہے۔ اور اپنی منزل متعین کرنے کا ایک جذبہ بھی پنہاں ہے۔ افسانوں میں سے عظیم بیگ چغتائی کے افسانے مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں مصنف کا جذبۂ احساس، قوت مشاہدہ اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کی آرزوئیں کارفرما ہیں قاضی عبدالغفار اور نیاز فتح پوری کی تحریروں میں ایک نصب العین پایا جاتا ہے اور ان کی منزلیں متعین معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں کے انداز بیان میں نسبتاً طنز کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن طنز جہاں تک ظرافت کا آلۂ کار ہو سکتا ہے، مزاح اور ظرافت کی جھلکیاں اُن میں نظر آتی ہیں۔ اُن کی تحریریں فرائڈ (Freud) کے بامقصد ظرافت کے نظریے کو پورا کرتی ہیں" لیلیٰ کے خطوط" ہمارے معاشرے کی داخلی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں ہمدردانہ طنز کی اس سے عمدہ مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔ اس لئے ہم اُردو نثری ظرافت کو نظم پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ظرافت میں نفسیاتی اصول اور زندگی کے اس کے تعلقات کو پیش نظر رکھ کر حقیقی ادبی ظرافت کو پیش کیا گیا تو اردو ادب میں ظرافت

کا کچھ سرمایہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔

ہمارے ظریفانہ ادب نے سوسائٹی پر عمدہ تنقید بھی کی ہے لیکن افادیت کے نقطۂ نگاہ سے یہ تنقید ابھی تک اہل نظر کی توجہ کی محتاج ہے۔ سوسائٹی کے نقاد ادیبوں کی ظرافت نگاری نے ہمارے ماحول پر اب تک وہ راست اثر پیدا نہیں کیا جو ایڈیسن اسٹیل اور گولڈ اسمتھ کی ظرافت نے مغربی ادب پر کیا تھا اور اس کی بڑی وجہ میریڈتھ کا وہ خیال ہے جو کہ اس نے ظرافت نگار شاعروں اور ادیبوں کے ماحول کے متعلق ظاہر کیا ہے۔ میریڈتھ نے ادبی ظرافت کے لئے اس سوسائٹی کی ضرورت بتائی ہے جس کے افراد میں نہ صرف تہذیب اور شائستگی ہونا چاہئے بلکہ ان میں تلوّن مزاجی اور بخاری جذبات سے دور رہنے کی بھی قوت موجود ہونا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ہماری سوسائٹی میں یہ خصوصیات پوری طور پر پیدا نہیں ہوئیں۔

اس لئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری ادبی ظرافت باوجود اس کے کہ اس حصے میں اب زندگی سے فرار گریز اور تصنع کی خامیاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اب بھی بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی کے کان ہنوز ادبی ظرافت کے مضمون اور کیف سے آشنا نہیں ہوئے۔ ذاتیات سے بحث، جذبۂ شہرت پسندی، جلب منفعت کا شوق۔ مصنف بننے کی خواہش حقیقی ادب کی تخلیق میں ہنوز خلل ہے ادھر ادب کے قدردانوں میں اعلیٰ تمدن و تہذیب اور شائستہ مذاق پیدا ہونا باقی ہے صحافت کی غرض مندیوں، تبصرہ نگاروں کے غیر محتاط ریویو سے ہمارے مصنفین کو کم درجے کی شہرت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وقتی طور پر ہمارے نوخیز علمی معاشرے کے افراد متاثر ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حتی الامکان ان حالات کو نقطۂ اعتدال اور ایک مرکز پر لایا جائے۔

یوسف ناظم ایم اے عثمانیہ

دہلی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

فیملی بجٹ:۔ (اعلیٰ - متوسط، ادنیٰ کا ایک ایک نمونہ)

فیملی بجٹ جنگ سے پہلے کی آمد و خرچ کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے جتنا خرچ بڑھا ہے، آمدنی اس تناسب سے نہیں بڑھی ہے۔ اس سے صرف کی مدات متاثر ہوئی ہیں، یا قرض بڑھ گیا ہے۔ بہر حال قبل جنگ کا فیملی بجٹ یہ ہے:۔

اعلیٰ (جس کنبے کی ماہوار آمدنی سات سو روپے ماہوار ہو اسے اعلیٰ شمار کیا گیا۔)

کنبے کے افراد:۔

شوہر، بیوی، چار لڑکے، تین لڑکیاں، ایک بہو۔ کل دس افراد۔ پیشہ سادہ کاری ہے۔ ضمنی طور پر دوسرے کاریگروں سے کچھ مال جمع کرکے معمولی کمیشن پر فروخت کرنے کا کام بھی ہے۔ ایک لڑکا جس کی عمر ۱۲ سال کی ہے ابھی پڑھ رہا ہے۔ باقی تین بڑے لڑکے باپ کے ساتھ کام میں شریک ہیں۔ ان تینوں لڑکوں میں چھوٹے نے ساتویں درجے تک منجھلے نے آٹھویں درجے تک، بڑے نے میٹرک تک تعلیم پائی ہے۔ خاندان کے بڑے قدیم خیال اور وضع کے پابند ہیں۔ اولاد نئی تہذیب سے متاثر اور اسے اختیار کئے ہوئے ہے ———— یہ ایک مثالی گھر ہے۔ انفرادی ذوق اور حالات کے خفیف اختلاف کے ساتھ اتنی ہی آمدنی رکھنے والے کسی اور گھر میں خرچ کی مدات میں کہیں کہیں اختلاف ہوگا ———— کھانے کا معیار البتہ سب جگہ بلکہ ادنیٰ گھروں میں بلند ہے اور آمدنی کا بڑا حصہ اس میں صرف ہوتا ہے۔

تفصیل اخراجات ماہانہ

کھانا	150/-	نذر نیاز	×
کپڑا	100/-	تہواروں کا خرچ	15/-
مرمت مکان	8/-	شادی غمی کی تقریبات	5/-
روشنی و پانی	20/-	علاج معالجہ	30/-
تنخواہ ملازم	20/-	شکار	5/-
سنگار	50/-	سینما	5/-
زیور	×	ریڈیو	5/-
مکان کا سامان	50/-	پان، سگرٹ	10/-
تعلیم	30/-	شراب اور نشے	×
سواری	20/-	کتب ورسائل	×
زکوٰۃ	×	اخبار	4/-
خیرات	30/-	تعمیر مسجد و مدرسہ	-/8/-
ٹیکس	زیر غور	کتب خانہ	×
دعوت، مہمان، دوست	10/-	پیر پرستی	5/-
حج، زیارت	×	علم دوستی	×
			572/8/-

آمدنی کی تفصیل

کام کی اجرت	500/-	کرایہ جائداد	60/-
متفرق تجارتی منافع	100/-		560/-
کمی جو جمع میں سے یا زیورات یا جائداد کی فروخت یا قرض سے پوری ہوتی ہے			12/8/-
			672/8/-

متوسط : شوہر، بیوی، بچے کل ۶ افراد

ماہوار آمدنی 200/-

تفصیل اخراجات ماہانہ

کھانا	90/-	ملازم	×
کپڑا	15/-	تقریبات شادی و غمی	3/-
کرایہ مکان	15/-	علاج، دوا	1/-
زیور	×	شکار	×
مکان کا سامان	3/-	سنیما	7/-
تعلیم	15/-	ناچ رنگ	×
سواری	8/-	سگرٹ، پان	7/-
خیرات	10/-	نشے	×
زکوٰۃ	×	کتب و رسائل	/8/-
چندہ	3/-	تعمیر مسجد	-/8/-
ٹیکس	×	پیر پرستی	×
مہمان، دوست نوازی	6/-	علم دوستی	×
حج، زیارت	×		186/-
نذر، نیاز	×		20/-
تہوار	×		200/-

ادنیٰ :- شوہر، بیوی، بچے کل ۵ افراد

آمدنی ساٹھ روپے ماہوار

تفصیل اخراجات

کھانا	45/-	روشنی ، پانی ، سامان خانہ	
کپڑا	5/-	حلال خور ، شادی بیاہ ، بیماری	4/-
کرایہ مکان	6/-		60/-

لاہوری برادری کی صناعانہ خصوصیات

شروع سے لاہوری برادری کے لوگ بہت سی قسم کی صنعتوں میں کام کرتے چلے آئے ہیں ، لیکن پہلے ہمیں یہ بتا دینا چاہئے کہ یہ ایک ہنر پیشہ جماعت ہے ۔ اور اس نے صنعت کی سادہ شکلوں کو عام ذریعۂ معاش کے طور پر کبھی اختیار نہیں کیا ۔ ہم ابتدار سے اس میں صنعت کی صرف اُن پیچ در پیچ شکلوں کی مہارت پاتے ہیں ۔ جو تمدنی ترقی کی پیداوار تھیں۔ وہ ہمیشہ اس صنعت سے کتراتے رہے جس میں وہ "عرضِ ہنر" کے لئے وسیع میدان نہ پائیں۔ ہم غور سے دیکھیں تو عجیب وغریب طور پر اس برادری کا رجحان معدنی اشیا کی صنعتوں کی طرف پاتے ہیں ، لیکن لاہوریوں نے جس معدنی صنعت کو لیا اُسے فن کی حیثیت دے دی ۔ مثلاً لوہار کا پیشہ لاہوری آدمی نے صرف روٹی کمانے کے ایک ذریعے کے طور پر اختیار نہیں کیا ، بلکہ صرف اس لئے کہ اس کا جی چاہتا ہے لوہے کے کام میں فنی نزاکت پیدا کی جائے ۔ چنانچہ بھدّی اور بے قطع چھُریوں کو اس نے مصورانہ حُسن سے سنوارا ، لوہے کی کیل کے معمولی سر کو اس نے کسی پھول کی شکل دے دی ۔ کواڑ کے قبضے کو اس نے ڈرائنگ کی کسی مناسب تراش پر ڈھالا ، یوں اس نے لوہے جیسی ضروری چیز کو تکلف کا رنگ دیا ۔ ہر چیز جو اُس نے بنائی اُسے ایک مصور کی ، ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھا ، وہ ہر چیز میں موسیقی کا تناسب چاہتا ہے ۔ لاہوری صنّاع کا یہی موسیقی طلب جذبہ ہے جسے ہم تاج اور جامع مسجد کی شکل میں محسوس کرتے ہیں ۔

لاہوریوں کی صنعتیں لاہوریوں نے تعمیرات اور زیور سازی کے فن کی تکمیل کے لئے بہت سے ضمنی کام ہاتھ میں لئے اور ہر ایسے کام نے بعد میں مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ ضمنی کاموں میں لوہے کا کام جس میں ٹھپّے سازی بھی شامل ہے۔ لکڑی کی خراد کا کام اور پیتل کا کام معمولی حرفے ہیں۔ لاہوریوں نے ان میں اپنی امتیازی شان قائم رکھی۔ لاہوریوں میں نعل بند اور سلوتری بھی تھے، آج بھی ہیں۔ یہ کام انھوں نے درباری تعلق سے شروع کئے اور ان میں استادی کا درجہ حاصل کیا۔

تعمیرات اور زیور سازی کے ضمن میں لاہوری مندرجہ ذیل صنعتوں میں ماہر تھے: پچّی کاری، منبّت کاری، مینا کاری، مرصع کاری یعنی سادہ کاری، مصوری، نقاشی، مُہرکنی۔ ان صنعتوں کی تشریح یہ ہے:۔

(۱) پچّی کاری اصل میں پرچین کاری ہے۔ پرچیں فارسی میں کیاری کی باڑھ کاٹنے کی قینچی کو کہتے ہیں۔ مضبوطی کے لئے کسی چیز میں لوہے کی میخ ٹھونکنے کو بھی پرچیں کہتے ہیں۔ تعمیرات کی اصطلاح میں پتھر سے پتھر کے پکّے جوڑ لگانے اور پتھر کے خالی کئے ہوئے حصّے میں ترشے ہوئے پتھر بٹھانے کے کام کو پرچین کاری کہتے ہیں جو بگڑ کر پچی کاری بن گیا ہے۔

(۲) مُنبّت کاری پتھر میں پھول پتّے اور حروف اُبھارنے کے کام کو کہتے ہیں۔

(۳) پتھر یا مٹّی اور چینے کے پکے ہوئے ٹکڑوں یا برتنوں پر کیمیاوی رنگ چڑھا کر آگ میں پکا کر پختہ کرنے کو مینا کاری کہتے ہیں۔ اس طرح زیوروں پر مختلف رنگ کا مینا کیا جاتا ہے۔

(۴) سنگ مرمر یا دوسرے اچھے پتھروں میں نفیس اور نازک جالی کاٹنے کے کام کو سادہ کاری کہتے ہیں۔ یہی کام سونے چاندی کے معمولی زیوروں پر کیا جائے تو وہ سادہ کاری ساخت کا زیور کہلاتا ہے۔

(۵) مصوری اور نقاشی میں لاہوری لوگ یہ اصطلاحی فرق کرتے ہیں کہ مصوری تو آدمی یا مناظر کی تصویر کشی کو کہتے ہیں اور نقاش اس مصور کو کہتے ہیں جو لکڑی یا دھات کی چیزوں پر اور خاص طور سے عمارتوں میں پکے روغنی رنگوں سے صرف پھول پتوں کی ڈرائنگ کرے۔ نقاشی کا سب سے اہم اور قابلِ ذکر حصّہ طلا کاری ہے۔ یعنی دیواروں یا دوسری چیزوں پر بنے ہوئے پھول پتوں پر اصلی سونا چڑھانا۔ یہ صنعت لاہوریوں کی نادر صنعتوں میں ہے اور ہندوستان میں اس کے ماہر کمیاب ہیں۔

لاہوری برادری کی موجودہ صنعتیں | لاہوری برادری میں اب تعمیرات کا کام بالکل ختم ہو گیا ہے اس لئے پچی کاری کا کام کہ وہ براہِ راست تعمیرات سے متعلق ہے، لاہوری لوگ اب نہیں کرتے۔ باقی وہ سب صنعتیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا۔ جدید ترقیوں کے ساتھ لاہوریوں میں موجود ہیں مرصع کاری یعنی سادہ کاری کی صنعت، اب یہ لوگ نفیس جڑاؤ زیور کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ میناکاری کی صنعت سے زیوروں پر مختلف رنگوں کے خوب صورت نقش و نگار بنانے کا کام لیتے ہیں۔ منبت کاری کی جگہ اب چپائی کاری اور پرواز کے کام نے لے لی ہے۔ چپائی کاری (انگریزی ...) زیور یا ظروف میں اُبھرے ہوئے نقوش کے کام کو کہتے ہیں۔ چپائی اور پرداز کے حسین نمونے بڑے کام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بڑا کام۔ سادہ کاری کا وہ حصّہ ہے جس میں چاندی سونے کے برتن، سنگار کی چیزیں، تخت چوکیاں، قلم، عصا اور شاہی ضرورت کی چیزیں بنتی ہیں۔

ان سب صنعتوں میں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لاہوری برادری کے نامور کاری گروں کا مختصر تعارف ضمیمہ میں کرایا گیا ہے۔

لاہوری برادری کی سب سے نمایاں صنعت، سادہ کاری | لاہوری برادری کی سب سے نمایاں صنعت آج کل سادہ کاری ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اسے "سادہ کار برادری" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہم یہاں اس صنعت کا کچھ حال بیان کرتے ہیں:-

لفظ سادہ کاری کی تحقیق | زیور سونے کا ہو چاندی کا اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں

(۱) سادہ (۲) جڑاؤ - لاہوری لوگ اس زیور کو جو سادہ ہو سناری زیور کہتے ہیں اور جس میں نگینے جڑے ہوں اور زیادہ نازک اور نفیس ہو اسے سادہ کاری زیور کہتے ہیں۔ سناری ساخت کا کام دو ایک لاہوری کاریگر بھی کرتے ہیں۔ لیکن زیور سازی کی یہ قسم سندھ کے کاریگروں سے مخصوص ہے سادہ کاری یعنی جڑاؤ زیور کا بنانا لاہور ... لوٹا حصہ ہے اور سادہ کاری ساخت کا زیور ہندوستان بھر میں پسند کیا جاتا ہے جڑاؤ زیور کے لئے سادہ کا لفظ ... بالکل الٹا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اہل زبان یوں ہی بولتے ہیں جڑاؤ زیور کی صنعت کے لئے مرصع کاری لفظ موجود ہے اور قدیم زمانے میں استعال ہوتا تھا۔ لیکن لفظ سادہ کاری بھی کچھ کم پرانا نہیں ہے۔ چنانچہ شاہجہانی عمارتوں کے سرکاری تذکرہ نویس ملا عبدالحمید لاہوری کی کتاب بادشاہ نامہ میں سادہ کار کا ذکر ہم دیکھتے ہیں۔ تاج محل کی تعمیر کے لئے صناعوں کی فراہمی کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے :-

"گروہ گروہ مردم از سنگ تراش و سادہ کار و پرچین کر و منبت کار کہ از اطراف واکناف ممالک محروسہ فراہم آمدہ بودند، ہر کدام در صنعت خویش ید طولیٰ داشت"

اردو کتابوں میں ہم نے یہ لفظ دیکھنا چاہا۔ ہماری تلاش کا نتیجہ ابھی صرف یہ ہے کہ سب سے پہلی کتاب جس میں لفظ سادہ کار ملتا ہے، جان شیکسپیر کی "ہندوستانی انگلش ڈکشنری" ہے جو سنہ ۱۸۱۷ء میں یا کچھ پہلے مرتب ہوئی ہے وہ لکھتے ہیں :- سادہ کار A kind of gold smith

سب سے پہلی اردو لغت جو کسی ہندوستانی نے مرتب کی ہے مولوی اوحدالدین بلگرامی کی نفائس اللغات ہے جو سنہ ۱۲۵۳ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں لفظ سادہ کار تو نہیں ملتا لیکن لفظ سادہ کے عجیب استعمال کی طرف اشارہ انھوں نے کیا ہے۔ "سادہ لغت فارسی است در اردوئے ہندی مستعمل خلاف منقش"

فیلن نے اپنی ڈکشنری ۱۸۷۹ء میں ذرا خلط مبحث کیا ہے۔ انھوں نے سادہ کار کے لئے لکھا ہے (A plain or fine worker in gold & silver) انھیں plain کا شبہ لفظ سادہ سے ہوا ہے۔

صاحب فرہنگ آصفیہ (سنہ ۱۸۸۸ء) سادہ کار کے ذکر میں لکھتے ہیں

... اور سبک کام بنانے والا سنار جو نہایت سُدھ نفیس اور پرداز کا کام بنائے
۔ ــــــ فرہنگ کے اس بیان سے لفظ سدھ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ہندی میں
سُدھ کے معنی سیدھے، صاف پاک اور متوازن کے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے
کہ سادہ کاری کی اصل سُدھ کاری ہو۔ یہی قیاس یوسف بخاری صاحب نے اپنے
مضمون دلّی کی سادہ کاری میں پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے سُدھ کاری کے علاوہ لفظ
صد کاری بھی اس کی اصل سوچی ہے۔ کیونکہ سادہ کاری درحقیقت ... سے خود بہت
سی صنعتوں کے مجموعے کا نام ہے ــــــ لیکن یہ سب قیاس صحیح نہیں رہا۔ کیونکہ سادہ
کاری کا لفظ ہم خود شاہ جہاں کے عہد میں پاتے ہیں اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لاہوری
لوگوں نے اس صنعت کے لئے جسے وہ اپنے ساتھ عراق سے لائے تھے۔ کوئی ہندی الاصل
لفظ اختیار کیا ہوگا۔ ان کے ہاں اس صنعت کے لئے ترصیع اور اس صنعت کے ماہر کے
لئے مرصع کار لفظ موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ سادہ کار عراق اور ایران کے
صناعوں کی آویزش کی یادگار رہے جو عراق میں ہوئی یا ہندوستان پہنچ کر یا یہ لفظ
ایرانی شاعری نے مرصع کار کی ہنرمندی کو داد کے طور پر دیا ہے۔ حُسن اور شوخی ایک
جگہ جمع ہو تو ایرانی ادیب اُسے "سادہ پرکار" کہتا ہے ــــــ لاہوری کاریگر
کے ہاتھ کا بنا ہوا جڑاؤ زیور شوخی، رنگینی اور حسن کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ
سادہ پرکاری سے زیادہ موزوں داد اس زیور کے لئے نہیں ہو سکتی اور زیور ساز
ضرور سادہ پرکار کہلانے کا مستحق ہے۔ کثرتِ استعمال سے پر ختم ہوگیا اور سادہ کار
رہ گیا۔ یہ بحث رہ جاتی ہے کہ مرصع کار جو اصل اصطلاح ہی کب ترک کی گئی اور سادہ کار
جو استعارہ ہے پیشے کے نام کے طور پر کیوں استعمال ہونے لگا۔ غالباً مرصع کاری
اور سادہ کاری خود عہد شاہ جہانی میں اور اس کے بعد بھی مترادف الفاظ کے طور پر
استعمال ہوتے رہے۔ لیکن زبان کا رجحان ہمیشہ آسانی کی طرف رہتا ہے۔ اس لئے

مرصع کاری راستے میں رہ گیا اور سادہ کاری جو اس سے نسبتاً آسان لفظ تھا زندہ رہا۔

صنعت سادہ کاری کی مختلف منزلیں اور تشریح زیور بیسیوں قسم کے اور مختلف نام کے ہوتے ہیں۔ لیکن سادہ کار لوگ ہر زیور کو تیاری کے دوران میں بلکہ مکمل ہونے پر بھی عام طور پر اپنی اصطلاح میں پرزہ کہتے ہیں۔ ہر پرزہ بازار میں جانے سے پہلے تیاری کی بہت سی منزلوں سے گذرتا ہے۔ ہم بُندے کی مثال لیتے ہیں۔

ڈول نقش گر، زیادہ مہذب لفظوں میں، ڈزائنر نے پنسل سے اس کا نقشہ کاغذ پر بنایا۔ کاریگر نے یہ نمونہ خود پسند کر لیا ہوگا یا گاہک سے پسند کرالیا تو ڈزائنر نے وہ کاغذ تانبے کی چادر کے ٹکڑے پر چپکاکر لوہے کی باریک چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے نمونے کے نقوش کھود دیے۔ اس کھودنے کو ڈول چھیننا کہتے ہیں۔ یہ بنیادی چیز یعنی نمونہ تیار ہو گیا جس پر بندہ بنایا جائے گا۔ سادہ کار اپنی اصطلاح میں تانبے کے اس نمونے کو ڈول کہتے ہیں۔ ڈزائنر اپنے کام کا خصوصی ماہر ہے۔ لیکن سادہ کار اگر چاہے تو ڈزائنر کی مدد کی اُسے ضرورت نہیں۔ وہ خود پنسل سے کسی نمونے کا نقش کاغذ پر بناکر اُسے تانبے کی اور زیادہ آسانی اس میں ہے کہ سیسے کی چادر کے ٹکڑے پر کھود دے، سادہ کار اگر زیادہ مشاق ہے تو پنسل کا غذ کے نمونے کا سہارا لئے بغیر وہ کوئی نقشہ تانبے یا سیسے پر بلکہ چاہے تو براہ راست اصل چیز یعنی سونے یا چاندی کی چادر پر چھیت دے گا۔ ورنہ سیسے کی ڈول پر چاندی یا سونا گلاکر ڈھلائی کے مشہور طریقے کے مطابق پرزہ ڈھال لے گا۔

وسیع پیمانے پر تیاری مندرجہ بالا ڈول کا طریقہ اسی وقت اچھا ہے۔ جب صرف دو ایک پرزے بنانے ہوں۔ لیکن اگر کھیپ کی کھیپ مال تیار کرنا ہے تو ڈھلائی کا طریقہ طویل اور تکلیف دہ ہے۔ سادہ کار اب ڈزائنر سے ڈول نہیں بلکہ صرف کاغذ پر نقش بنواکر ٹھپے ساز کو دے گا کہ وہ اس پر فولاد کا ایک ٹھپہ بنا دے۔ اس ٹھپے پر چاندی یا سونے کی پتلی چادر کے ٹکڑے ٹھونک کر بکثرت بندوں کے لئے زمین تیار کر لی جائے گی —— اور

بہت ترقی یافتہ کاری گر جو مال کو اور بھی سستا اور جلد اور زیادہ بنانا چاہتا ہے، ٹھپے کے بجائے کٹنگ ڈائی تیار کرائے گا۔ اور دستی پنچنگ پریس میں ڈائی باندھ کر چاندی یا سونے کی چادر میں سے ہزاروں پیبے کٹوائے گا ڈائی ساتھ ہی ساتھ مطلوبہ جالی بھی کاٹ دیتی ہے اور نگینوں کے لئے سوراخ بھی کاٹ دیتی ہے —— پرزے کی تیاری کے ان تینوں طریقوں کو مثال میں یوں سمجھئے کہ ڈول والا طریقہ تو قلمی نسخہ ہے، ٹھپے والا طریقہ پتھر کے چھاپے کی کتاب ہے اور ڈائی کا طریق کار بلاک کی چھپی ہوئی کتاب ہے۔

مشینی ساخت کے زیور اور ہاتھ کے بنے ہوئے زیور کا فرق

یہاں یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ڈول والا پرزہ زیادہ دام پاتا ہے اور فن کے قدردان ٹھپے کی اور ڈائی کی چیز سے نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ چیز بازار میں ہر ایک کے پاس مل جاتی ہے۔ اور ہر کوئی اُسے خرید کر پہن سکتا ہے۔ اس لئے مشینی ساخت کا زیور باوجود یکسانیت نزاکت اور حسن کے بہت کم دام پاتا ہے۔ زیور کا استعمال آرائش سے بھی زیادہ تفاخر کے اظہار کی چیز ہے اور آسانی سے قابلِ حصول چیز میں شیخی اور نمود کا موقع کہاں؟ اس لئے سادہ کاری کے باکمال استاد وسیع پیمانے کی تیاری کی طرف توجہ نہیں کرتے اور مشین کے استعمال کو فن کی توہین سمجھتے ہیں۔

بندھائی اور کھلائی

ڈول پر جب پرزہ ڈھل چکتا ہے تو اس پر پھول پتّوں اور دیگر نقوش کے بہت ہی دھندلے نشان ہوتے ہیں اور وہ سوراخ جن میں تیاری پر مختلف ناپ اور رنگ کے نگینے جڑے جانے والے ہیں کچھ یوں ہی سے نمایاں ہوتے ہیں۔ پہلے ان سوراخوں کو جن میں نگینے جڑے جائیں گے واربار نہیں، بلکہ پرزے کے دَل کی نصف موٹائی تک باریک برمے سے گہرا کر دیا جاتا ہے۔ اس کام کو سوراخ گہرانا کہتے ہیں۔ اب پرزے کی کئی مناسب جگہوں پر وار پار سوراخ کرلئے جاتے ہیں اور ان سوراخوں میں باریک آری کے فنر (Fret Saw) ڈال کر پھول، بیل، پتے، جالیاں غرض جو نقوش

ہوں وہ کھول اور کاٹ لئے جاتے ہیں۔ پہلے یہ کام باریک ولائتی آری کے بجائے بہت پتلے سوہن سے کیا جاتا ہے۔ اس بے حد پتلے سوہن کو تیرکا کہتے ہیں۔ تیرکا اب صرف سوراخ بڑھانے اور گھلائی کی اندرونی صفائی میں کام آتا ہے۔ غرض اس جالی کی کٹائی اور پھول پتی کے کاٹنے کو گھلائی اور بندھائی کہتے ہیں اس کے بعد تیرکوں اور باریک سوہنوں کی مدد سے پرزے کی سطح اور جالی اور کٹاؤ کے اندرونی حصوں کو صاف کر لیا جاتا ہے اسے سوہن کاری کہتے ہیں۔

جلا اب یہ پرزہ جلاکار پالش والے کے پاس جاتا ہے۔ یہ پرزے کے سوراخوں اور جالیوں میں سوتی ڈورے ڈال کر گیرو اور دوسرے مسالوں کی مدد سے پرزے کی سطح اور اندرونی کناروں کو مانجھ کر خوب صاف کر دیتا ہے اس سے پرزے پر آب آ جاتی ہے۔

ملمع اور مینا اب اگر پرزہ چاندی کا ہے اور سجاوٹ کی مصلحت کے لئے ملمع ضروری ہے تو پرزے کو ملمع ساز کے یہاں بھیج دیا جاتا ہے اور پرزہ اگر سونے کا ہے اور گاہک کی فرمائش مینے کی ہے تو پرزے کے مناسب حصوں پر رنگ کی ہدایت کے ساتھ اسے میناکار کے ہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جڑاؤ پرزوں پر مینا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ مینا نگینوں کے بغیر اکیلا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نگینہ جڑے ہوئے پرزے میں کاری گر کسی خالی جگہ مینا کو حسن افزائی کا ذریعہ سمجھے تو مینا کرا لیتا ہے —— ملمع کا بیٹری کا طریقہ جب تک رائج نہ تھا۔ سونے کے ورق چڑھانے کا طریقہ تھا اب بیٹری کے ذریعے ملمع ہوتا ہے۔ میناکاری میں پہلے دیسی رنگ اور دوسرے کیمیاوی اجزا سے کام لیتے تھے اب ولائتی تیار مینا مختلف رنگوں میں آتا ہے۔ یہ شیشے کی قسم کا پگھلنے والا مرکب سمجھئے۔ مینا کار مینے کو کھرل میں پانی کی مدد سے بہت باریک پیس لیتا ہے اور لوہے کے قلم سے پرزے کی خالی جگہوں یا نقوشِ مقررہ میں محلول مینا بھر کر مینے کی خاص بھٹی میں رکھ کر مناسب وقت

تک پٹتا ہے تاؤ میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ پرزہ نہ گل جائے۔

چھلائی | پرزہ ملمع کار یا مینا کار کے ہاں سے واپس آگیا۔ اب اُسے لکڑی کے دستے پر جسے منڈی کہتے ہیں لاکھ کی مدد سے جمالیتے ہیں اور لوہے کی ایک چھوٹی سی دھار دار قلم سے جسے بُولی کہتے ہیں پرزے کے پھول کے کناروں، ڈنڈیوں، جالی کی کروٹوں وغیرہ کو چھیلتے ہیں۔ جس طرح لکڑی کو رندے سے چھیلنے میں چھیلن اُترتی ہے۔ اسی طرح پرزے پر سے سونے یا چاندی کی چھیلن اُترتی ہے۔ اس طرح پرزے میں چمک دمک اور خوب صورتی بڑھ جاتی ہے۔ چھلائی کا کام نہایت اہم ہے۔ اس کام کے خصوصی ماہر بھی ہوتے ہیں جو چھلیتے کہلاتے ہیں۔ کاریگر اگر چاہے تو اپنا پرزہ خود چھیلنے کی بجائے چھلیتے سے چھلوا سکتا ہے۔

جڑائی | چھلائی ہو چکی اور پرزہ ابھی تک لاکھ کی مدد سے منڈی پر مضبوط جما ہوا ہے اب نگینے جڑنے کا نمبر آتا ہے۔ معمولی یا چاندی کے پُرزے پر کاریگر اکثر اپنی مرضی سے معمولی داموں کے نقلی نگینے یا موتی جڑ دیتا ہے۔ بڑھیا یا سونے کے پرزوں پر قیمتی پتھر جڑے جاتے ہیں جو گاہک یا دوکاندار دیتا ہے۔ پرزے کی مناسبت سے پتھروں کا سائز اور رنگ انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ پتھر کا انتخاب ذوق اور حیثیت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ پتھر دو ڈھائی روپے رتی سے لے کر ہزار روپے تک ہو سکتا ہے۔ پکھراج، نیلم مانک، پنا، یاقوت، زمرد، لاجورد، اوپل، شجری، عقیق، یشب، مرجان، دہنہ فرنگ، ہیرا، اور بہت سی قسموں اور خاندان کے پتھر ہیں۔ جن کی قیمتیں، سائز، وزن رنگ، ساخت، پانی یعنی اندرونی روشنی کی صفائی کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہیں۔ غرض پتھر جڑ دیا جاتا ہے۔ چاندی کے سستے کام میں کہیں کہیں ولائتی سلیوشن سے نگینہ چپکا دیا جاتا ہے لیکن یہ طریقہ عیب میں داخل ہے اور کاریگر کو بدنام کر سکتا ہے۔ نگینے کی جڑائی بلی کی مدد سے ہوتی ہے۔ یعنی تیز دھار دار فولادی قلم سے سوراخ کے کنارے کو ذرا سا کاٹ

کر ابھارتے ہیں اور نگینہ سوراخ میں بٹھا کر یہ ذرا سا کڑا ہوا کنارا نگینے کے کنارے پر جا دیتے ہیں اور اس طرح نگینہ اپنی جگہ جم جاتا ہے۔ پرزہ اب تیار ہے اُسے سنباڑی پر سے اُکھاڑ کر لاکھ الگ کر دی جاتی ہے اور اب ایک بار اُسے ریٹھے کے پانی میں برش سے رگڑ کر دھوتے اور کپڑے سے پونچھ کر خشک کر لیتے ہیں۔ اس آخری عمل کو اُجال اور نکھار کہتے ہیں —— اس کے بعد پرزہ اس روپ میں ہوتا ہے جسے دیکھ کر کسی نے بے اختیار مگر بجا طور پر کہا ہوگا "سادہ پرکاری!"

چپائی اور پرداز | پرزہ قدرتی حسن سے مکمل ہو چکا ہے، لیکن پرکاری و شوخی میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے، یہ گنجائش چپائی اور پرداز سے پوری ہوتی ہے۔ پرزے کے لئے چپائی اور پرداز کاجل اور سُرخی کا سا مرتبہ رکھتی ہے۔ چپائی، منبت کاری کے لئے ہندی لفظ ہے۔ چاندی سونے کے زیوروں اور برتنوں پر اُبھرے ہوئے نقش و نگار بنانے کو چپائی کاری کہتے ہیں۔ چپائی صرف پرزے کے خالی ٹکڑوں پر نقش و نگار میں نہیں بلکہ مستقل حصّوں میں کام آتی ہے۔ وہ حصّے جہاں کھُلائی، جڑائی کا کام نہ ہو سکے یا ناموزوں رہے وہاں چپائی کے اُبھرے ہوئے پھول پتے بہار دیتے ہیں۔ مثلاً انگوٹھی میں نگینے کے حصّے کو چھوڑ کر دونوں طرف جو جگہ بچتی ہے۔ اس میں جالی کھولی جا سکتی ہے۔ لیکن چپائی کا کوئی ابھرا ہوا پھول اس جگہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چپائی کی صنعت پہلے بالکل ضمنی تھی، لیکن ولایت میں یہ کام بہت زیادہ عمدہ ہوتا ہے۔ وہاں کے نمونوں سے لاہوری برادری متاثر ہوئی اور اس شاخ میں اب زیادہ ترقی ہو گئی۔ یہ صنعت چونکہ ولائتی کام سے بہت ترقی پذیر ہوئی اس لئے چپائی کار اب اپنے آپ کو Engraver کہلانا پسند کرتا ہے —— پرداز بالکل حاشیے کی اور ضمنی چیز ہے۔ خوش نویس لوگ جیسے عبارت کے خلا کو کسی چھوٹی سی آرائش سے بھر دیتے ہیں یہی کام پرداز کا ہے۔ پرداز لوہے کے تیز باریک قلم سے آرائشی خطوط بنانے کو کہتے ہیں۔ زیور کے

پھول پتیوں میں جہاں کھلائی جڑائی نہ ہو۔ پتیوں پر رگیں اور ڈنڈیوں پر نشان بنا دیتے ہیں ـــــــ چپائی کار یا انگریوری پرداز کا کام بھی کر لیتے ہیں۔ پرزے پر چپائی یا پرداز کا کام جلاکاری کے درجے سے گذرنے کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن وہاں چپائی اور پرداز کا کام نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے یہاں لکھ دیا گیا ہے

زیور کی تیاری کے جتنے درجوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر صناع ان تیاری کی کتنی منزلوں میں سب پر حاوی نہیں ہوتا۔ لیکن شروع سے آخر تک صرف اپنے ہاتھ سادہ کار ماہر ہوتا ہے سے پرزہ تیار کرنے والے کاری گر بھی ہیں۔ عام طور پر کاری گر ڈول، ملمع، مینا، پالش جھلائی اور چپائی میں دوسرے کاری گروں سے مدد لیتا ہی جو اپنے کام کے خصوصی ماہر ہوتے ہیں۔ اس طرح وقت بچتا ہے اور پرزہ زیادہ اچھا تیار ہوتا ہے ـــــــ جو بات دلچسپ ہے کہ ماہر خصوصی یعنی وہ شخص جو ایک درجے کا مشاق ہو اور باقی درجوں میں معمولی ہو اپنے آپ کو سادہ کار کہتا ہے، جیسا کہ وہ ہے، لیکن ہم پیشہ لوگوں میں وہ اپنے خاص کام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً ملمع کار، میناکار، جلاکار، انگریور چھلیتا ـــــــ لیکن وہ کاری گر جو کھلائی، جڑائی کا خاص ماہر ہو اور باقی حصوں میں معمولی ہو ہم پیشہ لوگوں میں بھی سادہ کار کہلاتا ہے ـــــــ

(باقی آیندہ)

مختار احمد جامعی

یہ احباب

یادش بخیر! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب کہ میرے صرف دو چار ہی دوست اور دو چار ہی ملنے والے تھے ۔ لیکن خدا بھلا کرے اس ادبی ذوق اور علمی شوق کا کہ اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اور میرے ملنے والوں اور جاننے والوں کی تعداد اتنی بڑھا دی کہ اگر آپ مبالغہ نہ سمجھیں تو میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے ۔

اگرچہ پہلے پہل جب میرا حلقۂ احباب اتنا وسیع نہ تھا تو مجھے شدت سے اپنی پستی کا احساس ستاتا اور اس خیال سے بڑا دکھ ہوتا کہ میں بہت معمولی اور گمنام آدمی ہوں ۔ لیکن جیسے جیسے میرے ملنے والوں میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا تو میں اپنے آپ کو اپنے ہم جنسوں کے مقابلے نہایت سربلند اور خوش قسمت تصور کرنے لگا ۔ کاش! اس وقت مجھے اپنی اس نادانی کے عواقب کا تھوڑا بھی علم ہوجاتا اور آج مجھے گوشہ نشین ہو جانے ، جنگل کی طرف نکل جانے اور کبھی کبھی تو خودکشی کر لینے کے منصوبے نہ باندھنے پڑتے ۔

ہر چند کہ حلقۂ احباب کا وسیع ہونا فائدہ سے خالی نہیں ۔ اور بظاہر اس میں محض خوبیاں ہی خوبیاں ہیں ۔ مثلاً اگر آپ کے ملاقاتیوں میں کسی ٹاکیز کے قریب کی پولیس چوکی کا انسپکٹر نہ سہی ، کانسٹبل ہی ہے اور آپ بغیر لمپ کے پونے دس بجے سائیکل پر دوسرا شو دیکھنے جارہے ہیں تو یہ پولیس کانسٹبل آپ کا بڑا محسن ثابت ہوگا ورنہ بصورت دیگر آپ پکچر بھی نہیں دیکھ سکتے اور اگر آپ کے پاس اس وقت صرف دوسرے درجے کے ٹکٹ اور ایک پلیرس کی ڈبیہ ہی کے دام ہوں تو آپ سائیکل پر گھر بھی نہیں لوٹ سکتے ۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے دن آپ کو دفتر میں غیر حاضر ہونے کے باوجود اپنی سائیکل حاصل کرنے کے لئے

نہ معلوم کتنا جرمانہ بھی ادا کرنا پڑے۔

اسی طرح اگر آپ کے اپنے حلقے کے پولیس انسپکٹر یا اپنے محلے کی سمت کے پولیس کانسٹبل سے صاحب سلامت ہے تو پھر آپ اپنے محلے کے شیر ہیں۔ مطلق العنان بادشاہ ہیں۔ جو چاہے کیجئے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ رات بھر ریڈیو کی گھڑ گھڑ اور رت جگے کی گڑبڑ سے ہمسایوں کی نیند چین حرام کر دیجئے۔ کیا مجال جو کوئی آپ کا کچھ بگاڑ سکے۔

اور اگر اسی طرح آپ کی جان پہچان بلدیہ کے ناظم صاحب۔۔ نہ سہی کسی چپراسی صاحب ہی سے ہے تو اطمینان رکھئے آپ کو عمر بھر اپنی سائیکل کا نمبر خریدنا نہ پڑے گا۔

یا پھر آپ شاعر ہیں اور کسی مؤقر رسالے کے ایڈیٹر سے آپ کا یارانہ ہے تو پھر آپ بہت جلد اقطاعِ ملک میں شاعرِ مشرق اور شاعرِ اعظم کے عسیرالحصول القاب سے نہیں نہ سہی۔ لیکن حضرت اور مولانا، شاعرِ حیات اور شاعرِ فطرت، شاعرِ انقلاب اور شاعرِ ہند کے میدانِ جاپان قسم کے القاب سے تو مشہور ہو جائیں گے اور آپ کا شمار بھی پانچویں سواروں میں ہونے لگے گا۔

یا پھر آپ کی دو ایک طوائفوں سے آشنائی ہے (بُرا نہ مانئے میری نیت نیک ہی) تو گویا پھر آپ اپنے زمانے کے داغ ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہر اچھی اور بُری محفل میں آپ کا کلام گایا جائے گا اور آپ خود گلی کوچوں میں ہوٹل کے لونڈوں اور تانگے والوں کو اپنا کلام گاتے سنیں گے۔

یا پھر آپ ادیب ہیں اور کسی ریڈیو اسٹیشن کے کنٹرولر، ڈپٹی کنٹرولر یا شعبۂ ادب کے سپرنٹنڈنٹ سے آپ کے خوش گوار تعلقات ہیں تو پھر کیا پوچھنا۔ آپ کی چاندی ہی چاندی ہے۔ آپ انشاء اللہ ڈرامے، فیچرس، مضامین، مباحثے، مکالمے اور جانے کیا کیا لکھتے لکھتے تھک جائیں گے اور سننے والے بھی آپ کو بار بار سنتے سنتے۔ لیکن گھبرائیے مت پروگرام بلیٹن کی ہر نیم ماہی اشاعت میں آپکا نام ضرور ہوگا۔

بہرحال اب میں کہاں تک مثالیں دوں، آپ خود ڈاکٹر، وکیل، تھیٹر کے منیجر، کتب فروش، ٹیکسی والے، تانگے والے اور محلّے کے غنڈے تک کے آگے "اگر" لگا دیجئے۔ میرا ذمہ اگر آپ کا اگر اکارت جائے۔

تو بس اسی نظریے کے تحت میں نے ہر مذہب، ملت ہر پیشہ اور ہر قماش کے آدمیوں سے راہ ورسم پیدا کی، جس کے نتیجے کے طور پر تھوڑے ہی عرصے میں قسم قسم کی داڑھیاں، وضع وضع کی مونچھیں۔ داڑھی، مونچھوں سے بے نیاز چہرے، ترکی ٹوپیاں، انگریزی ٹوپیاں گاندھی کیپ، جناح کیپ، دو پلیاں، طرّے، عمامے، پگڑیاں اور نہ جانے کیا کیا میرے گلے کا ہار ہو گئے۔

بات اگر آداب عرض، سلام علیکم، نمسکار، گڈ مارننگ اور مختلف قسم کی ہاتھ کی حرکتوں تک محدود رہے تو اس میں یقیناً کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً آپ شام کے وقت شہر کی ٹھنڈی سڑک پر سیر کر رہے ہیں۔ کوئی آپ کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہتا ہے۔ کسی کو آپ مسکراتے ہوئے آداب عرض ہے کہتے ہیں۔ کوئی آپ کو دیکھ کر دور ہی سے حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہے۔ کسی کو آپ صرف ہوا میں ہاتھ لہرا کر نازی سلام کرتے ہیں۔ غرض کسی کو آپ بڑی بے پروائی سے سلام کرتے اور کسی کا آپ بڑی رعونت اور ٹھسّے سے سلام لیتے ہوئے سڑک پر سے گذر رہے ہیں تو سڑک پر چلنے والوں میں مردوں پر بالعموم اور عورتوں پر بالخصوص بڑا مرعوب کن اثر پڑ سکتا ہے۔

لیکن بات اس سے آگے بڑھی کہ گئی۔ یعنی یہ آپ کے ملنے والے مجھے بھر کو رُک کر اگر آپ کی خیریت بھی پوچھ لیا کریں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک میرے تلخ تجربات کا تعلق ہے۔ یہ مان نہ مان میں تیرا مہمان قسم کے ملنے والے اکثر اس وقت جبکہ آپ کسی بیمار عزیز کی دوا لانے ہسپتال بھاگ رہے ہوں۔ ناشتہ جلدی تیار نہ ہونے کے باعث دیر سے تیز تیز دفتر جا رہے ہوں۔ دن بھر تنازع للبقا میں لگے

رہ کر شام کو تھکے ہارے گھر لوٹ رہے ہوں یا کسی گہری سوچ میں غرق گردن جھکا کے سڑک پر چل رہے ہوں۔ آپ سے ٹکراتے ہیں۔ آپ لاکھ کنی کترانا چاہیں لیکن وہ سند باد جہازی کے مرد تسمہ پا کی طرح اس وقت تک آپ کی گردن پر سوار رہتے ہیں جب تک کہ کوئی غیبی امداد آپ کو ان کے پنجے سے نجات دلا دے۔

محولہ بالا بیان کی تصدیق میں آیئے آپ سے بھی اپنے چند ملنے والوں کا تعارف کرا دوں کیا حرج ہے۔ آپ سے ملئے آپ میرے ایک دوست کے دوست ہیں۔ خیر سے شاعر ہیں۔ اور تمام اصناف سخن پر حاوی غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، رباعی قطعہ، مستزاد، مرثیہ، ترکیب بند، ترجیع بند، واسوخت، ریختی اور آج کل کے رواج کے مطابق معرا اور آزاد نظم بھی لکھتے ہیں۔ آپ کی ہر غزل کم از کم پچیس تیس شعر کی ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ نظم وغیرہ کتنے اشعار پر مشتمل ہوتی ہوگی۔ ایک "ادبی اکھاڑے" یعنی مشاعرے میں مجھ سے میرے دوست کے دوست نے آپ کو ملایا تھا۔ بس اس دن سے جب آپ کبھی اور جہاں کہیں مجھے مل جاتے ہیں۔ آداب بجا لاتا ہوں قبلہ کے بعد میری مزاج پرسی کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے فوراً ہی بعد بغیر کسی تمہید کے بے تکلف فرماتے ہیں "آپ سے اس روز کے بعد سے نیاز ہی نہیں حاصل ہوا۔ کئی نظمیں اور غزلیں وغیرہ ہوئی ہیں لیکن افسوس کہ بیاض ساتھ نہیں ہے۔ البتہ رات دو تین قطعے ہوئے تھے جن کو ایک پرچے پر لکھ لیا تھا۔ دیکھئے دیکھتا ہوں وہ پرچہ بھی ہے یا نہیں" پھر جیبیں ٹٹول کر اور کئی میلے کچیلے کاغذ کے پرزے نکال کر مسرت سے "جی مل گیا" تو سنئے "عرض کیا ہے" کہہ کر گلا صاف کرتے ہیں۔ اب آپ ماحول سے بے نیاز۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ کسی چوراہے پر یا کسی پیشاب خانے کی بغل میں اور آنکھیں بند کر کے ہلکے ترنم کے ساتھ اپنا کلام بلاغت نظام جو فردوس گوش کرنے لگتے ہیں تو دو تین قطعوں کے بعد دو تین غزلیں اور نظمیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور میں واہ واہ کرتے کرتے آہ آہ کر کے

کراہنے لگتا ہوں۔ لیکن آپ سُناتے ہی چلے جاتے ہیں اور میری طرف توجہ ہی نہیں فرماتے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

آپ جب کبھی نظر آجاتے ہیں میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جانا یا کسی گوشۂ عافیت میں چھپ جانا چاہتا ہوں، لیکن ہر بار بے قصور ہی پکڑا جاتا ہوں اور بہرحال "کچھ" شعر سننا ہی پڑتے ہیں۔

آپ سے ملیے   آپ بزعم خود بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔ لیکن آپ اتنے ہی اچھے آرٹسٹ ہیں، جتنے ہمارے لیڈر۔ اچھے اور صحیح معنوں میں لیڈر ہوتے ہیں تاہم آپ کو مصوری کا خبط ہے اور اس میں شک نہیں کہ آپ صورت گری کر بھی لیتے ہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ جتنا نا چاہتے ہوں انسان اور وہ ماضی کی طرف دوڑ کر بن جائے بندر۔ آپ بنانا چاہیں مرد اور وہ "چلو ہٹو" کہہ کر ہو جائے عورت تو خیر اپنے میلان طبع کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے ایک پکچر اسٹال بھی کھول رکھا ہے اور آرٹ پرور نوجوانوں اور گشتہ کھائے ہوئے بڈھوں کے لئے پیرس وغیرہ کی ممنوعہ تصویریں بھی سپلائی کرتے ہیں۔

جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب کہ آپ سے تعارف ہوا تھا۔ بس اب جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے یا تو مجھے دوکان پر گھسیٹ لے جاتے ہیں یا پھر چوک بازار ہر جگہ وہ تمام تصویریں دکھلانے تک نہیں مانتے جو اس وقت آپ پر لدی ہوتی ہیں۔

ایک روز میں باغ عامہ میں جھپٹے کے قریب سبزے کے فرش پر بیٹھا مناظر قدرت کی دلفریبیوں پر سر دھن رہا تھا کہ "آداب عرض ہے" کی گمبھیر آواز نے مجھے چونکا دیا میں نے سر اُٹھا کے دیکھا تو آپ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ آپ کو تقریب ملاقات سے لیس یعنی تصویروں کا بستہ بغل میں دابے دیکھتے ہی میں سناٹے میں آگیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بکرا قصاب کو چھرے کے ساتھ دیکھ کر سہم جاتا ہے۔ میں نے ممیانے کے انداز میں

کہا" اخاہ! آپ، آداب عرض ہے، تشریف رکھئے" آپ بیٹھ گئے اور کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا دفتر کھولا اور تصویروں کی نمائش شروع کردی۔ تین چار تصویروں کے بعد ایک قلمی تصویر جس میں ایک عورت کو بالکل عُریاں، انگڑائی لیتے ہوئے بنایا گیا تھا۔ آپ نے میرے سامنے کردی اور اس کے بعد گہر افشانی کرنے لگے کہ "یہ........"

کہ اتنے میں چند نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹولی ہمارے سامنے سے گذری اور ہم سے دو ہی قدم آگے بڑھ کر ایک نے دوسری سے کہا" دیکھا ان مردوں کی بے حیائی کو کہ کس ڈھٹائی سے عورتوں کی ننگی تصویروں کو اس طرح منظر عام پر بیٹھے دیکھ دیکھ کر اپنے جنسی جذبات کو آسودہ کر رہے ہیں۔ تف ہے ایسی قوم پر جس میں ایسے نوجوان پیدا ہوتے ہوں" دوسری جو کچھ ظریف معلوم ہوتی تھی ہماری طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولی - ع

آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہی سوار

اور ساتھ ہی ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ میرے مصور دوست کی حالت نہ پوچھئے۔ بے چارہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ لیکن میرے لئے تو یہ ایک زرّیں موقع تھا پنڈ چھڑانے کا۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا" ہاں صاحب اب رہنے دیجئے۔ ان تصویروں کو یہ موزوں جگہ نہیں ہے۔ پھر اب شام بھی ہوا چاہتی ہے"

آپ سے ملئے —————— آپ ہکلے ہیں اور ہکلے بھی اس پایہ کے کہ آپ کے ہکلے پن کے نشے کو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کی ان تھک کوششوں کی ترشی بھی نہ اتار سکی۔ بات کرتے ہیں تو آپ پر رحم آنے لگتا ہے گردن اکڑ جاتی ہے۔ منہ کھل جاتا ہے اور منہ سے تھوڑی دیر تک اگر جملہ الف سے شروع ہو رہا ہو تو "آ آ" اور بے سے شروع ہو رہا ہو تو "با با" کی آواز نکلتی ہے جیسے کسی کے حلق میں روئی پھنس گئی ہو اور وہ پانی مانگ رہا ہو۔ بیٹھے ہوئے رہے تو دونوں ہاتھ جھٹکنے لگتے ہیں اور کھڑے ہوئے رہے تو ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر مارتے ہیں جس کی وجہ سے سارا جسم لرزنے لگتا ہے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرگی کا دورہ پڑ رہا ہے۔ لیکن آپ اس معذوری کے باوجود بڑے باتونی واقع ہوئے ہیں اور تو اور آپ کو اس پر گانے کا بھی شوق ہے۔ اور واہ ری قدرت کہ جب گاتے ہیں تو بالکل نہیں ہکلاتے۔

آپ کے گانے کے شوق کا یہ عالم ہے کہ جب دیکھو گنگناتے رہتے ہیں اور کم از کم جب کبھی مجھ سے ملتے ہیں تو گانے ہی کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں۔" آ آ آ ارے صاحب اب ہندوستان میں کلاسیکل موسیقی تو آخری سا سا سانسیں لے رہی ہے اور جو کچھ باقی بھی سو اس کو فلم کمپنیاں ت ت تباہ کر رہی ہیں۔ اور ہر بار تمہید کے طور پر کچھ دیر فنِ موسیقی پر گفتگو کرنے کے بعد حرفِ مطلب پر آتے ہیں۔ آج ہی میں نے ایک گانے کی ن ن ن نئی دھن بنائی ہے۔ بڑی پیاری۔ سنئے گا تو پھڑک جائیے گا۔ اجازت ہو تو دھی دھی دھیمے سروں میں پیش کردوں (واضح رہے کہ ہم سڑک پر چل رہے ہیں) تو سنئے آنا و ناؤ ناؤ آ..........

اچھا اب آپ سے ملئے ——— جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں آپ بمشکل ۴½ ۴¾ فٹ کے مختصر سے پاکٹ ایڈیشن قسم کے آدمی ہیں۔ لیکن آپ کی ہمتیں کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی بلند اور خیالات بحر ہند سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ لیکن خدا بھلا کرے اس پست قامتی کا کہ آپ کسی کی نظروں میں نہیں بھرتے۔ جب آپ کسی مجمع کے سامنے تقریر کرنے اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں تو اکثر غیر سنجیدہ لوگ ہنس پڑتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک من چلے نے جب آپ تقریر کرنے ایستادہ ہوئے تو پیچھے سے باواز بلند کہا "کھڑے ہو جائیے" لیکن پھر بھی آپ تقریر کرنے سے باز نہیں آتے۔ آپ کے اندر ان "تقریری جراثیم" نے اتنی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے کہ آپ اسٹیج تو اسٹیج سڑک کے فٹ پاتھ پر بھی تقریر کرنے سے نہیں چوکتے۔ یعنی آپ سڑک پر بھی اپنے مخاطب سے اس انداز میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر، مٹھیاں بھینچ بھینچ کر پینترے بدل بدل کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کرتے

ہیں کہ لوگ یکبارگی کسی   کے دھوکے میں آپ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن جب آپ اول تول بکتے ہوئے ان کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہیں تو وہ مسکراتے ہوئے "معاف فرمائیے" کہہ کر چل دیتے ہیں۔

میں کسی عالم میں بھی آپ سے ملوں۔ جب تک "حالاتِ حاضرہ" پر تقریر نہیں کر لیتے مجھے جانے نہیں دیتے۔

ان مشتے نمونے از خروارے کے بعد عرض ہے کہ اگر آپ بھی "تعدد ازدواج" کی لذتوں کے مدنظر بُری طرح "کثیر الاحباب" ہوں اور آج "دوست روک" استعمال نہ کرنے کے باعث نالاں تو آئیے پھر آپ اور میں سر جوڑ کر روئیں۔ لیکن اگر بفضل خدا آپ کے ملنے والوں اور شناساؤں کی تعداد کم ہے تو زنہار اس کو نہ بڑھائیے۔ ورنہ یاد رکھئے پچھتائیے گا۔

(بہ اجازت نشر گاہ، حیدر آباد)

سلیمان اریب

سجّاد حیدر یلدرم

ہماخانم سجاد حیدر یلدرم کا نام اردو ادب میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ مدتوں ان کے طرز نگارش کی تقلید کی گئی اور ان کی کتاب "خیالستان" کو پڑھا گیا اور سر دُھنا گیا۔

"ہماخانم" میر حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم کے قلم نے اس میں کچھ خوبیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ حجازی کے بانکپن اور یلدرم کی شوخی نے ہماخانم کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ قیمت مجلد عہ

خیالستان	ہے	جلال الدین خوارزم شاہ	عہ	حکایات و احتساسات	عہ
ثالث بالخیر	۸ر	لیلیٰ مجنوں	ہر	جنگ و جدال	۱۲ر
آسیب الفت	۱۲ر	پرانا خواب	۱۰ر	زہرہ	۱۰ر

پرانا خواب اور دیگر افسانے عہ

ماہِ نو ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے "شِشو" کا ترجمہ۔ از جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی ٹیگور فطرت انسانی کا باکمال مصور ہے۔ خصوصاً بچّوں کے حسیات اور ان کے خیالات کی جیسی سچی تصویریں اس نے کھینچی ہیں وہ کہیں اور نظر نہ آئیں گی۔ عہ

گیتان جلی	عہ	سیر الڑکین	عہ	خاموشِ حسن	عہ
کون کسی کا	عہ	پھول اور کلیاں	عہ	الجھن	عہ
کمودنی	عہ	جو کھیر والی	ہے	——	

چند اور کتابیں

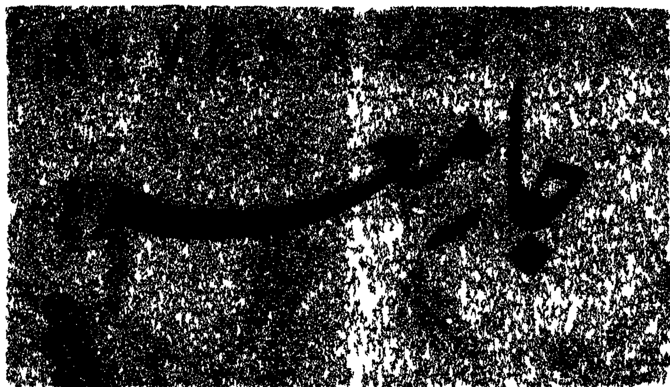
وقارِ حیات۔ نواب وقار الملک کی سوانح عمری۔ مصنفہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی۔ صہ

کارنامہ پہلوی۔ رضا شاہ پہلوی کے حالاتِ زندگی اور مملکتِ ایران کی داستان۔ از سید محمد حسن صاحب بلگرامی۔ للعہ

مناجات و نصائح۔ خواجہ عبداللہ انصاری کا فارسی کلام جو جیبی سائز میں دو رنگ میں نہایت خوشنما چھپا ہے۔ عہ

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲



مکتبہ جامعہ دہلی

مطبوعاتِ جامعہ

مکتبہ جامعہ کی مندرجہ ذیل کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں
تاجرانِ کتب اور اربابِ ذوق طلب فرما سکتے ہیں۔

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
پردۂ غفلت	عہ	شریر لڑکا	۶ر	نماز	۴ر
انشاء کی تعلیم	عہ	تانبیل خاں	۵ر	ماما بھی پڑھنے لگے	۴ر
انتخاب میر	عہ	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	غزلیں	۴ر
ہمارے نبی	۶ر	تاریخ ہند کی کہانیاں اول	۷ر	تعلیماتِ قرآن مجید (اخلاق)	۴ر
ارکان اسلام	۴ر	؍؍ ؍؍ دوم	۸ر	پیارے خاں درزی	۴ر
عقائد اسلام	۴ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر	بتن بڑھئی	۴ر
نبیوں کے قصے	۱۰ر	ادارہ تعلیم و ترقی کی کتابیں:-		عمر فاروق	۴ر
ہمارے رسول	۱۰ر	صحابۂ کرام نمبر ۳	۴ر	عبدالرحمن راج	۴ر
سرکار دو عالم	عہ	حالات قرآن مجید	۴ر	گل بکاؤلی	۴ر
خلفاء اربعہ	عہ	نصیب خاں حجام	۴ر	قصہ چار درویش	۴ر
رسول پاک	عہ	مہاتما گوتم بدھ	۴ر	خط کتابت	۴ر
مقناطیس کی کہانی	۵ر	پہیلیاں	۴ر	سمدھو حلوائی	۴ر
ننھی مرغابی	۵ر	رام کہانی اول	۴ر	حفیظ خانساماں	۴ر
چنو منو	۵ر	؍؍ ؍؍ دوم	۴ر	میرا ننھا	۴ر
دو بھائی	۸ر	گلستاں	۴ر	کعبہ شریف	۴ر

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم - اے

جلد ۴ - نمبر ۱	بابت ماہ جولائی ۱۹۴۵ء	سالانہ چندہ عہ - فی پرچہ ۸

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

جنگ کے بعد قیمتوں اور شرح مبادلہ کو کس سطح پر قائم کیا جائے؟

ہندوستان میں قیمتوں کی عام سطح، جنگ سے پہلے کے مقابلے میں، بہت زیادہ بڑھ
گئی ہے۔ اگر ۱۹۳۹ء کی قیمتوں کے اوسط کو سو مانا جائے تو اس کے مقابلے میں انجمن اقوام
کے اعداد کے مطابق ۱۹۴۳ء میں قیمتیں ۳۱۱ ہو گئی تھیں۔ اس کے بعد سے اعداد اشاریہ
برابر کمی کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اگست ۱۹۴۴ء میں عدد اشاریہ ۳۰۲ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد
غالباً اور زیادہ کمی ہوئی ہے اور اب اسے تقریباً تین سو سمجھنا چاہیے۔ لیکن اب بھی اکثر
دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری قیمتیں بہت زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ امریکہ
کے مقابلے میں ہمارا عدد اشاریہ ۱۶۰ کے بقدر زیادہ ہے اور انگلستان کے مقابلے
میں ۱۳۰ کے بقدر۔ کیونکہ امریکہ کا عدد اشاریہ ۱۹۴۳ء کے لئے ۱۴۰ تھا اور
انگلستان کا ۱۷۰۔

قیمتوں کی اتنی بڑی تبدیلی نے جماعت کے اندر سخت ابتری پیدا کر دی ہے اور
اس کی وجہ سے دولت کی تقسیم کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ کچھ لوگوں نے خوب
روپیہ کمایا ہے اور کچھ نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے ہیں۔ پچھلے دو سالوں میں تاجروں
اور ٹھیکیداروں نے خوب منافع کمایا ہے۔ مزدوروں کو بھی زیادہ اُجرتیں ملی ہیں اور
ان کی مانگ بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ کاشتکار کو بھی اپنی پیداوار کی قیمت زیادہ ملی ہے
لیکن دوسری طرف ہزاروں آدمی فاقے سے مر رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعداد
فاقہ کی سرحد تک پہنچ گئی ہے۔ مختلف طبقوں کی حالت پہلے کے مقابلے میں کتنی بہتر
یا خراب ہو گئی ہے اس سوال کے جواب کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ بات بالکل صاف ہے
کہ ۱۹۴۳ء کے بعد سے جب کہ قیمتیں اپنی انتہائی حدِ عروج تک پہنچ گئی تھیں دولت

کی تقسیم کی نوعیت بہت تبدیل ہوگئی ہے

بہرحال اب سوال یہ ہے کہ جنگ کے بعد کے سالوں میں ہندوستان میں، قیمتوں کو کس سطح پر قائم کیا جائے؟ کیا موجودہ ۳۰۰ کی سطح پر قائم کردیا جائے یا انھیں خاصا کم کیا جائے یا انھیں جنگ سے قبل جیسا کردیا جائے۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں قیمتوں کے بڑھنے کے جو اسباب ہیں ان کا تجزیہ کرلیا جائے۔

قیمتوں کے بڑھنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ متحدہ اقوام کی افواج کو رسد فراہم کرنے کا کام خصوصاً جاپان کے جنگ میں شامل ہونے کے بعد سے بہت کچھ ہندوستان ہی کو کرنا پڑا۔ یہاں سے اشیاء اور خدمات کی بڑی مقدار خریدی جاتی رہی اور اس کے دام روپے کی صورت میں ادا کئے جاتے رہے۔ ملک معظم کی حکومت نے سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں تقریباً تیرہ ارب ۸۵ کروڑ روپیہ ہندوستان میں خرچ کیا اور اس خرچ کے لئے جتنے روپے کی ضرورت تھی وہ اس نے رزرو بنک کے ہاتھ اپنے اسٹرلنگ تمسکات فروخت کرکے نوٹوں کی صورت میں حاصل کیا۔ اور اس سے یہاں کے لوگوں کو اُن کے مال اور خدمتوں کی قیمت ادا کی۔ پھر اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں خود حکومت ہند کا خرچ بھی مدافعت اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں بہت بڑھ گیا۔ اس خرچ کو کچھ تو زائد ٹیکس لگا کر پورا کیا گیا اور کچھ روپے قرض لے کر۔ حکومت ہند نے جو زائد خرچ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں جنگ کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے کیا، وہ آٹھ ارب ۴۴ کروڑ روپیہ ہوتا ہے۔ گویا ان سالوں میں ہمارے مُلک میں ۲۲ ارب ۲۹ کروڑ روپے کے خرچ کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بہت زیادہ اثر ہماری قیمتوں پر پڑا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے مُلک میں روپیہ کے اس خرچ کے اضافہ کے ساتھ

چیزوں کی تیاری میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ مال کی تیاری میں کچھ اضافہ ضرور ہوا۔ لیکن یہ صرف غیر استعمالی چیزوں میں ہوا جس سے صارف کو کوئی سہارا نہیں ملا اور اس سے قیمتوں کے اس اضافہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی جو ترقی یافتہ آمدنیوں کی زائد طلب کی وجہ سے رونما ہو رہا تھا۔ پھر جو استعمالی چیزیں ملک میں تیار کی جا رہی تھیں وہ بھی شہری آبادی کا حق چھین کر دفاعی کاموں میں استعمال کی جانے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو زائد آمدنیاں لوگوں کو مل رہی تھیں جب اُن سے بازار میں مال خریدنے کی کوشش کی جاتی تھی تو خریداروں کے باہمی مقابلے کی وجہ سے اُن کی قیمتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اور پہلے کے مقابلے میں کم اشیاء لوگوں کو میسر آسکتی تھیں۔ اس کے علاوہ جنگ سے پہلے ہندوستان میں خاصی بڑی تعداد میں مصنوعہ چیزوں کو دوسرے ملکوں سے منگایا جاتا تھا لیکن جنگ کے زمانے میں درآمد بہت کم ہو گئی بلکہ اس کی جگہ خود ہندوستان سے مصنوعہ چیزیں باہر جانے لگیں جس سے استعمالی چیزوں کا ذخیرہ شہری آبادی کے لئے اور بھی کم ہو گیا۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے زندگی کے تمام مصارف بڑھ گئے۔ لوگوں نے مہنگائی کے بھتے کے لئے کوشش کی۔ یہ مطالبہ منظور کیا گیا۔ لیکن یہ زائد آمدنی زندگی کے مصارف کو اور زیادہ بڑھانے کا موجب بن گئی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ نقل وحمل کی دشواریوں نے بھی قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کو تیز کیا۔ کیونکہ مال کے نہ پہنچنے کی وجہ سے مقامی قلت رسد اور اعتبار میں کمی رونما ہوتی رہی جن کی وجہ سے مقامی قیمتیں چڑھ جاتی تھیں اور پھر ناگزیر طور پر سارے ملک کی قیمتوں کی سطح بلند ہو جاتی تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ریل، سڑک اور ساحل کے نقل وحمل کو معاشی نظام کا خون زندگی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ملک کے اندر ریل گاڑیوں موٹروں اور ساحلی جہازوں میں اضافہ کرنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی معدنی تیل کی رسد فراہم ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف فوج کے سامان اور فوجی آدمیوں کی منتقلی بہت بڑھ گئی تھی،

اس سے لازمی طور پر مقامی قلّتِ رسد اور قیمتوں کی سطح میں تیزی رونما ہوئی۔

زر کے اصول کا مطالعہ کرنے والوں نے اب اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ قیمتوں کے تغیرات میں اعتبار و اعتماد کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہاں بہت سے ناموافق حالات جمع ہوگئے تھے۔ مثلاً جاپان کا جنگ میں شامل ہونا۔ ملک کو حملے کا خطرہ لاحق ہونا۔ جنگ کے شروع زمانے میں اتحادیوں کی ناکامیاں۔ مقامی طور پر اشیا کی قلت۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے مصارف کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کی توقع۔ یہ وہ [illegible] جنھوں نے لوگوں کے اعتماد کو زائل کردیا تھا اور تاجر اور خریدار دونوں بڑے پیمانے پر چیزوں کا ذخیرہ کرنا چاہتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چور بازار وجود میں آگئے اور ان سب نے قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کو بہت تیز کردیا۔

آخری وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں معاشی کنٹرول اور افراطِ زر کی روک تھام کے لئے وہ طریقے اختیار نہیں کئے گئے جو دوسرے شریکِ جنگ ملکوں میں کئے گئے تھے ایسا کیوں نہیں کیا گیا، اس بحث میں پڑنا فضول ہے۔ اس کا کچھ سبب تو بلاشبہ یہ تھا کہ اس ملک میں جاپان کے جنگ میں شریک ہونے تک قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اور بڑے پیمانے پر بڑھنے کا رجحان شروع نہیں ہوا تھا اور اس کا کچھ سبب یقیناً یہ بھی تھا کہ ملک کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ کھیتی کا انتظام چھوٹے پیمانے پر اور ذاتی گذارے کے لئے کیا جاتا ہے اور کچھ یہ تھا کہ حکومت اور رعایا میں اشتراکِ عمل کی کمی پائی جاتی تھی۔ بہرحال تازہ ترین انتظامات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ رکاوٹیں ایسی نہیں تھیں جن پر قابو نہ پایا جاسکتا ہو۔ اس لئے کچھ الزام تو حکومت پر عائد کرنا ہی ہوگا کہ اس نے افراطِ زر کے خلاف معاشی کنٹرول کی وہ پالیسی اختیار نہیں کی جو اس نے بعد میں مئی ۱۹۴۳ء میں اختیار کی اور جس کے نتیجے کے طور پر بعد میں ہندوستانی قیمتوں میں اضافہ کا رجحان رک گیا ہے۔

غرض اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں قیمتیں دوسرے ملکوں کے مقابلہ

میں بہت زیادہ ہیں اور یہ بات محض صنعتی اشیا ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اناج کے لئے بھی صادق آتی ہے۔

موجودہ صورت حال کا خلاصہ یہ ہے :۔

(۱) ہندوستان کی سطح قیمت ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں دو سو فی صد زیادہ ہے۔

(۲) زندگی کے مصارف میں اضافہ کا تخمینہ ۲۲۹ فی صد تک کیا گیا ہے۔

(۳) ہندوستان کے رزرو بنک میں شعبہ اجرائے نوٹ کے ذخیرے محفوظ میں ۸ ارب ۲ ۵ کروڑ روپیہ کے اسٹرلنگ تمسکات موجود ہیں۔ اور شعبہ ساہوکارہ کے ذخیرے محفوظ ہیں، ۳ ارب ۳ کروڑ کے گویا جنگ سے قبل کے مقابلے میں بصورت مجموعی دس ارب ۸۴ کروڑ روپے کے زاید اسٹرلنگ تمسکات ہندوستان کے رزرو بنک میں موجود ہیں۔

قیمتوں کے اضافہ کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد اب ہم اس سوال پر غور کریں گے جسے ہم نے مضمون کے شروع میں اُٹھایا تھا یعنی کیا قیمتوں کو ان کی موجودہ سطح پر قائم کردیا جائے یا انھیں تیزی کے ساتھ گراکر کم کردیا جائے۔

قیمتوں کو موجودہ سطح پر قائم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس کی حمایت کرنا سخت غلطی اور ناانصافی ہوگی۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔ اول وجہ یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ہے۔ اناج کی قیمت، جنگ سے قبل کے مقابلے میں آج تین گنا زیادہ ہے اور ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں بھی جو کسانوں کے لئے بہت اچھے سال تھے یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ زرعی مفاد کے نہایت سرگرم حامیوں کی طرف سے اس کی تائید میں صرف ایک دلیل پیش کی جاتی ہے کہ زراعت کی لاگتوں میں اور ان چیزوں کی قیمت میں جنھیں کسان بازار سے خریدتا ہے چونکہ بہت اضافہ ہوگیا ہے اس لئے زراعتی پیداوار کی قیمت بھی زیادہ رہنا چاہیے۔

لیکن جنگ کے ختم ہونے اور تجارت کے معمولی حالات میں واپس آجانے کے بعد استعمالی چیزوں کی قیمت لازمی طور پر کم ہوجائے گی اور ایک حد تک زراعت کی لاگتیں بھی ضرور کم ہوجائیں گی اس لئے اس دلیل کی اہمیت زائل ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ قیمتوں کو موجودہ سطح پر قائم رکھنے کی وجہ سے اصلاح و مرمت کے مصارف کس قدر بڑھ جائیں گے اور معاشی ترقی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا مالی اعتبار سے کس درجہ مشکل ہوجائے گی تو اس کی خرابی پوری طرح ظاہر ہوجاتی ہے۔ پھر قیمتوں میں موجودہ اضافہ چونکہ زیادہ تر افراطِ زر کی وجہ سے رونما ہوا ہے اس لئے آبادی کے مختلف طبقوں کی آمدنیوں اور مصارف میں مطابقت پیدا نہیں ہوسکی ہے۔ بعض طبقوں نے غیر معمولی فائدے حاصل کئے ہیں اور دوسرے طبقوں نے خصوصاً جن کی آمدنی مقرر ہے غیر معمولی نقصانات اور تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ افراطِ زر کی وجہ سے قومی آمدنی کی جس طرح از سر نو تقسیم ہوئی ہے اسے ہرگز انصاف پر مبنی نہیں سمجھا جاسکتا اور اسے ارادتاً دائمی بنانا اور بھی ناانصافی ہوگی۔ آخر میں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ جنگ کے زمانے میں قیمتوں کا جو اضافہ ہوا ہے اور جس کے اسباب تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ اس وقت بھی قائم رہے گا۔ جب جنگ کے ختم ہونے کے بعد یہ اسباب غائب ہوجائیں گے۔ خصوصاً جب متحدہ اقوام کے وہ فوجی مصارف جو وہ اس وقت ہندوستان میں کررہی ہیں ختم ہوجائیں گے اور باہر کا مال آزادی سے ہندوستان میں آسکے گا۔ اور اعتبار و اعتماد کو عام طور پر ترقی ہوجائے گی تو اس وقت از خود قیمتوں کی سطح کم ہوجائے گی۔ اگر ہم ان سب متوقع اسباب کو نظر انداز کرکے موجودہ حالات کو دائمی سمجھ لیں گے تو ہم بڑی سخت غلطی کا ارتکاب کریں گے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں قیمتوں میں جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے مقابلے میں کم اضافہ ہوا ہے۔ چاہے قیمتوں کا رجحان بڑھنے یا قائم رہنے کی طرف ہو لیکن ہندوستان میں

مزید زوال کی طرف مائل ہوگا۔ اس لئے ہمیں اپنی قیمتوں کو دائمی طور پر موجودہ سطح پر قائم رکھنے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا انھیں تیزی کے ساتھ گرنے دیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی قیمتوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن اگر اس فرق کو دور کرنے کے لیے ہندوستان کی قیمتوں کو تیزی سے گرنے دیا گیا تو جنگ کے زمانے میں جو صنعتیں شروع کی گئی ہیں اُن کا دیوالہ نکل جائے گا اور ملک میں بے روزگاری اور مزدوروں کے جھگڑے اور کساد بازاری شروع ہو جائے گی اور اس کا نقصان صرف صنعت تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ زراعت بھی متاثر ہوگی اور بالواسطہ اور بلاواسطہ ملک کی ساری آبادی پریشانی میں مبتلا ہو جائے گی۔

اس لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ کوئی کام جلد بازی اور قطعی فیصلے کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ ملکی اور غیر ملکی حالات کا صبر اور سکون کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور انھیں از خود مستحکم بنیاد پر قائم ہونے کا موقع دیا جائے اور جب وہ طلب و رسد کی قوتوں کے ماتحت کسی دیرپا سطح پر قائم ہو جائیں تب قیمتوں کے استحکام کی پالیسی کو شروع کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کی شرح مبادلہ کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ جنگ کے زمانے میں ہماری شرح مبادلہ کو برابر ایک شلنگ چھ پنس پر قائم رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ہماری داخلی قیمتوں سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں رہ سکا ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری بڑھی ہوئی قیمتوں اور ہمارے زر کی قوت خرید کی کمی کا یہ تقاضا تھا کہ ہماری شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس سے گھٹا کر بہت کم کر دیا جاتا۔ دوسری طرف ہندوستان کے ریزرو بینک میں اسٹرلنگ تمسکات کا جو ذخیرہ تیزی کے ساتھ اکٹھا ہوتا جا رہا ہے اس نے بین الاقوامی منڈی میں ہمارے زر کی حیثیت کو بہت مضبوط بنا دیا

ہے۔ اسٹرلنگ تمسکات کا۔ یہ ذخیرہ اب اتنا ہو گیا ہے کہ گذشتہ پچاس سال میں ہمارا توازن تجارت جس قدر ناموافق رہا ہے اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات ایسی ہے جو ہماری شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس سے کہیں زیادہ بلند سطح پر قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس وقت اپنی شرح مبادلہ کو نہ بڑھانا مناسب ہوگا نہ کم کرنا۔ کم کرنا تو اس لئے مناسب نہ ہوگا کہ ہماری داخلی قیمتوں کا عروج دائمی معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے ہمارے پاس اسٹرلنگ تمسکات کا بڑا زبردست ذخیرہ موجود ہے جس کی قوت خرید کو خود کم کرنا حماقت ہوگی۔ شرح مبادلہ کو بڑھانا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ ہمیں ابھی تک اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہے کہ جنگ کے بعد تعمیر نو اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہمیں کس قدر مال باہر سے منگانا ہے۔ دوسرے ملکوں میں قیمتوں کے اضافہ کی مقدار کیا ہوگی اور ہمارے اسٹرلنگ تمسکات ہمیں کس طرح اور کتنی مدت کے دوران میں ادا کئے جائیں گے۔ اسی لئے جب تک ان تمام عوامل کا جو اس سلسلے میں اثر انداز ہو سکتے ہیں پوری طرح پتہ نہ چل جائے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شرح مبادلہ کو نہ بدلا جائے۔ جب حالات دوسرے ملکوں اور خود اپنے ملک میں یک گونہ معمولی حالت پر آجائیں گے، تب اس کے بارے میں بھی آخری فیصلہ کرنا مناسب ہوگا۔

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی حالت اور سارجنٹ سکیم

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں دکھلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی ۳۹ کروڑ آبادی میں صرف پونے پانچ کروڑ ایک سادہ اور آسان خط لکھ پڑھ سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد اس سے بھی کم یعنی صرف سوا دو کروڑ تھی۔ گویا دس سال کے عرصے میں خواندہ لوگوں میں سو فی صدی سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود خواندہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے معنی یہ تھے کہ پانچ سال سے اونچی عمر کے لوگوں میں صرف ساڑھے چودہ فی صدی خواندہ تھے۔

جب ان اعداد کو عورتوں اور مردوں پر تقسیم کر کے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پانچ سال سے زیادہ عمر کے مردوں میں تعلیم کا اوسط ۲۲½ فی صدی اور عورتوں میں ۸ر۵ فی صدی تھا۔

عورتوں اور مردوں کی خواندگی میں فرق کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ابتدائی مدرسوں کے لئے پڑھانے والی عورتیں کافی تعداد میں نہ ملتی تھیں۔ دوسرے معاشرتی اور معاشی اسباب کی بنا پر بھی عورتوں کی تعلیمی ترقی سست تھی۔ لیکن ان سے بڑھ کر رکاوٹیں یہ تھیں کہ ایک تو آبادی کی اکثریت (یعنی ۸۰ فی صدی سے زیادہ) ایسے گاؤں میں رہتی تھی جن کی آبادی پانچ سو یا اس سے کم تھی۔ اس کے علاوہ کسانوں کا افلاس اور سرکاری آمدنی کی قلت بھی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود گذشتہ دس سالوں میں جو ترقی ہوئی، وہ بہت حوصلہ افزا ہے لیکن اگر آئندہ کے لئے ہندوستان کی تمام بالغ آبادی کو خواندہ بنانا ہے تو لازماً اس رفتار کو بہت زیادہ تیز کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے وسیع نظام تعلیم میں حسب ذیل درسگاہیں شامل ہیں۔ پندرہ

یونیورسٹیاں اپنے ۳۲۵ آرٹ اور سائنس کے کالجوں کے ساتھ۔ ۵۰۸ پیشہ ورانہ کالج، ۲ لاکھ ۳۳ ہزار ۳۶۴ فوقانیہ، وسطانیہ اور تحتانیہ اور ہر قسم کے مخصوص مدرسے ۱۹۴۱-۴۲ء میں ان ۲ لاکھ ۳۲ ہزار ۸۹۷ مجموعی تعلیمی اداروں میں ایک کروڑ ۷۵ لاکھ ۶۹ ہزار ۸۹۰ طلبہ (لڑکے اور لڑکیاں) تعلیم پا رہے تھے۔

یہ نظام تعلیم بہت زیادہ عظیم الشان ہے۔ لیکن ملک کی ضرورتیں اس سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ ہندوستان میں ۶ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ گاؤں پائے جاتے ہیں اور آبادی میں اضافہ ۵۰ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہو رہا ہے۔ ان حالات میں لازمی تعلیم کے جاری کرنے کا اختیار مجبوراً مقامی اداروں یعنی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو جو سب منتخب کی ہوئی جماعتیں ہیں سپرد کرنا پڑا ہے یہی اپنی موجودہ مالی حالت اور سہولتوں کو دیکھنے کے بعد اس کا فیصلہ کرتی ہیں کہ لازمی تعلیم مناسب رہے گی یا نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں چھ اور گیارہ سال کی درمیانی عمر کے بچوں کے لئے ۱۹۴ شہروں اور ۱۴ ہزار ۱۰۵ گاؤں میں جبریہ تعلیم رائج کی گئی تھی۔ ان علاقوں میں بھی جبریہ تعلیم صرف لڑکوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں مثلاً احاطہ مدراس میں یہ اصول لڑکیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔

۱۹۲۱ء سے یعنی جب سے ۱۹۱۹ء کے دستوری قانون کا نفاذ ہوا تعلیم پوری طور پر صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں دے دی گئی ہے۔ برطانوی ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اختیارات کو صراحت کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۷ء سے منتخب شدہ ہندوستانی وزراء جو صوبائی مقننہ کو جواب دہ ہوتے ہیں تعلیم کی دیہاتی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک نگرانی کر رہے ہیں۔ مرکزی حکومت کو تعلیم پر کوئی اختیار نہیں رہا ہے۔ وائسرائے کی عاملہ کے وزیر تعلیم کو صرف بعض چھوٹے وفاقی علاقوں (مثلاً دہلی کے دار السلطنت) کی تعلیم پر جو مرکزی حکومت کی راست نگرانی میں ہے، اختیار حاصل ہے اس کے علاوہ باقی تمام ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں وزیر تعلیم اور اس کے ماہرانِ تعلیم

کا کام صرف مشورہ دینا ہے ایک مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے ذریعے صوبوں نیز ریاستوں کے وزرائے تعلیم کے کام میں مشورہ دیا جاتا ہے اور اس میں یک جہتی پیدا کی جاتی ہے۔

ہر صوبے میں عوام کی منتخب کردہ کابینہ کا ایک رکن وزیر تعلیم ہوتا ہے اور تعلیمی انتظامات کے صدر مستقل کو جس کا کام وزیر تعلیم کو مشورہ دینا ہوتا ہے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی ۹۰ فی صدی تعلیم گاہوں کی صوبائی حکومت نگرانی کرتی ہے جو تعلیم گاہیں حکومت سے اپنی اسناد تسلیم کرانا یا مالی امداد لینا چاہتی ہیں انھیں حکومت کی نگرانی کو قبول کرنا پڑتا ہے اور ان کا سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً جائزہ کرتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں ذمہ داری کچھ تو صوبائی حکومتوں کی ہوتی ہے اور کچھ خود یونیورسٹیوں کے حوالے کردی جاتی ہے۔ ادنیٰ تعلیم کے معاملے میں صوبائی حکومتیں، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ساتھ یا تو ذمہ داری میں شرکت کرتی ہیں یا اپنے اختیارات انھیں منتقل کردیتی ہیں۔

مدرسے کا نظام | تحتانیہ یا ابتدائی مدرسوں میں چھ سے دس سال تک کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور ان کا عام مقصد "خواندگی" کے معیار تک پہنچنا اور کام چلانے کے لائق حساب سیکھنا ہوتا ہے۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ابتدائی تعلیم کی بنیاد کو وسیع کرنے اور اسے طلباء کے ماحول سے براہِ راست متعلق کرنے کی مختلف کوششیں کی جا رہی ہیں ۱۹۳۷ء سے صوبائی حکومتیں اس مسئلے پر توجہ کررہی ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس نے ایک زیادہ عملی اور دلچسپ نصاب کو رائج کرنے کی سفارش کی۔ یہ بنیادی تعلیم کی اسکیم تھی جس میں کئی ان خیالات کو قبول کیا گیا تھا جنھیں مہاتما گاندھی نے پیش کیا تھا۔ بنیادی تعلیم کی اس اسکیم پر جنگ کے باوجود، دیسی ریاستوں کے علاوہ برطانوی ہند کے چار بڑے صوبوں یعنی بمبئی، سی پی، بہار اور یوپی میں تجربہ کیا جارہا ہے۔

وسطانیہ اسکولوں میں عموماً دس سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے

ان کے دو بڑے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مقامی طور پر ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں۔ اول "ورناکلر" مڈل اسکول جن میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے لیکن ذریعہ تعلیم نہیں ہے۔ دوسرے "اینگلو ورناکلر" مڈل اسکول جو طالب علم کو پندرہ سال ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اور جن میں اونچی جماعتوں میں بعض مضامین کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔

مدرسوں کی زیادہ تر تعداد ایسی ہے جس میں باقاعدہ طور پر مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ البتہ جن مدرسوں میں تمام یا اکثر طلبا کا ایک مذہب سے تعلق ہوتا ہے۔ وہاں کچھ گھنٹے اخلاقی تعلیم کے لئے مخصوص کر دے جاتے ہیں لیکن مذہب کی کوئی جداگانہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ دینیات کی تعلیم کے لئے بھی کچھ مدرسے بعض ذاتیں اور فرقے مختلف طریقوں پر چلا رہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری نظام تعلیم سے باہر ہیں۔

تقریباً ۵ لاکھ طلبہ ایسی تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے ہیں جنھیں حکومت تسلیم نہیں کرتی۔ یہ عام طور پر وہ مدرسے ہیں جنھیں خاص خاص ذاتوں یا فرقوں نے کھول رکھا ہے اور یہ عموماً مندروں اور مسجدوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ابتدائی اور یونیورسٹی کی درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کو قبول کر لیا گیا ہے لیکن ان میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مدرسے اور کالج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان کی میزان ۱۹۴۰-۴۱ء میں حسب ذیل تھی:-

۲۶ ہزار ۴۲ ابتدائی مدرسے۔ ایک ہزار ۲۵۷ وسطانیہ مدرسے۔ ۲۹۷ فوقانیہ مدرسے۔ ۷۰۵ مخصوص مدرسے ۸ پیشہ ورانہ تعلیم کے اور ۵۴ عام تعلیم کے کالج۔ کل میزان ۲۸ ہزار ۵۵۴ تھی جس میں ۴۴ لاکھ ۲۲ ہزار طالبات زیر تعلیم تھیں۔

یونیورسٹی کی تعلیم | یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے کالجوں کی میزان

۱۰۱۲ ہوتی تھی، جس میں آرٹ اور سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم سب کے کالج شامل تھے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں ان میں ایک لاکھ باون ہزار ۸۶۲ طلبہ پڑھتے تھے۔ اس تعداد میں ۱۲ ہزار ۵۵۰ طالبات بھی شامل تھیں جو یا تو آرٹ یا میڈیسن یا مدرسی یا قانون کی سند کے لئے تیاری کرا رہی تھیں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیاں۔ اگر ان میں سے بعض ممتاز اقامتی یونیورسٹیوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے، عام طور پر الحاق کرنے والی یونیورسٹیاں ہیں۔ اور ان کو قریب قریب انگلستان کی لندن یونیورسٹی کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ ان کی اسناد کو آکسفورڈ کیمبرج لندن اور دوسری برطانوی اور یورپین یونیورسٹیاں اپنی اسناد کے برابر تسلیم کرتی ہیں۔ ان کے امتحانات عام طور پر سخت ہوتے ہیں اور ان کا معیار بھی بلند ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ڈاکٹری اور تحقیقات کی سندوں کو بہت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

استادوں کی حالت | نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں عالموں کی عزت کا رواج چلا آرہا ہے اور گرو (استاد) کا درجہ بہت بلند و محترم سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن استاد سے یہ توقع کی جاتی رہی ہے کہ وہ ولیوں اور مہاتماؤں جیسی سادہ زندگی بسر کرے۔ اس لئے اُسے مادی معاوضہ بہت کم دیا جاتا ہے۔ یہ روایت اب بھی استادوں خصوصاً ابتدائی مدرسے کے استادوں کی تنخواہ کی کمی کی صورت میں جاری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم گاؤں کے استاد ایسے ہیں جو اپنے کام کو ایک ضمنی کام سے زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں۔

ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں استادوں کی مجموعی میزان ۵ لاکھ ۱۸ ہزار ۱۰ ہوتی تھی۔ اس میں سے صرف ۲ لاکھ دس ہزار ۶۹۴ تربیت یافتہ استاد تھے۔ ثانوی مدرسے کے استادوں کو تربیت دینے کے لئے ۴۶ مدرسے تھے۔ جن سے سالانہ صرف ۱۹ ہزار ۳۹۴ استاد تربیت پا کر نکلتے تھے۔ گریجوایٹ استادوں کی تربیت کے لئے ۵۰ ٹریننگ کالج تھے جن سے سالانہ ایک ہزار ۳۱۴ استاد تربیت پا کر نکلتے تھے۔

تعلیم پر جنگ کے اثرات | خوش قسمتی سے ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے تعلیم کا کچھ زیادہ ہرج نہیں ہوا ہے۔ برما کے فتح ہو جانے کے بعد مشرقی ساحل کی کچھ درس گاہوں نے اپنے تعلیم کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا تھا۔ لیکن اب انھوں نے اپنا کام حسب معمول شروع کر دیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کام میں البتہ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے ملحقہ کچھ کالج جاپانی بمباری کے بعد زیادہ محفوظ علاقوں میں منتقل ہو گئے تھے۔

جنگ کے بقیہ تمام اثرات تعلیم کے لئے موافق ثابت ہوئے ہیں جنگی صنعتوں کی طلب نے فنی تعلیم کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ سرکار نے اپنی ٹیکنیکل اسکیم کو ۱۹۴۰ء میں بہت مختصر پیمانے پر شروع کیا تھا، لیکن اب اسکیم کے ماتحت چار سو مرکز چل رہے ہیں۔ اور ایک لاکھ فنی ماہر تربیت پا چکے ہیں۔ برطانیہ کے وزیر مزدوران، مسٹر ارنسٹ بیون نے جس اسکیم کو شروع کیا تھا اس کے ماتحت ہندوستان کے ماہر مزدوروں اور امیدواروں کی ٹولیاں معینہ وقفوں کے بعد ہتھیار اور گولہ بارود اور جہاز سازی کے کارخانوں میں تربیت پانے کے لئے جاتی رہتی ہیں۔ سائنس کی تحقیقات کو سر ایم بھٹناگر کی سرکردگی میں کاؤنسل آف انڈسٹریل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ قائم کر کے بہت ترقی دی گئی ہے۔ یہ کاؤنسل نہ صرف اپنے طور پر تحقیقات کا کام جاری رکھتی ہے بلکہ دوسرے بہت سے مرکزوں کے کام میں بھی یک جہتی پیدا کرتی رہتی ہے۔ اور ہندوستان کے وسائل کو جنگ اور صنعت کے کام میں استعمال کرنے میں اسے بعض نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

فوج کا تعلیمی اثر | جنگ کے زمانے میں تعلیمی ترقی کو، خود ہندوستانی فوج نے بھی ایک نہایت اہم اور دیرپا امداد پہنچائی ہے۔ ہندوستانی فوج کی تعداد اب بیس لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس فوج میں جس کی بھرتی رضاکارانہ طریقے پر ہوتی ہے زیادہ تر کسانوں کا طبقہ شامل ہے جو بھرتی کے وقت عموماً ناخواندہ ہوتے ہیں۔ فوج میں انھیں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ انھیں خواندہ بنایا جاتا ہے اور ایک مشترکہ زبان یعنی لاطینی رسم خط

میں لکھی ہوئی اردو سکھائی جاتی ہے (لاطینی خط میں لکھی ہوئی اردو ہندوستانی فوج کا مشترکہ ذریعہ تعلیم ہے) انھیں معقول بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کا ابتدائی مقصد اگرچہ سپہ گری کی تعلیم ہوتا ہے لیکن جس میں پھر بھی اس دیہی پس منظر کا خیال رکھنا پڑتا ہے جہاں سے سپاہی بھرتی ہوا ہے اور جہاں جنگ کے بعد اُسے دوبارہ واپس جانا ہوگا۔ بہت سے اہل نظر حضرات کا یہ خیال ہے کہ جنگ کے بعد جب وہ سپاہی جس نے فنی مہارت حاصل کی ہے، جس نے اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کی ہے، جس نے ہر قسم کی مشینوں اور حفظانِ صحت اور صفائی کے اصولوں سے اپنے آپ کو روشناس کیا ہے۔ جس نے جماعتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تربیت حاصل کی ہے اور بہت سے مذہبوں اور ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت ڈالی ہے۔ جب یہ سپاہی جنگ سے لوٹے گا تو ترقی کے کام میں بہت معاون ثابت ہوگا۔

سارجنٹ اسکیم | جنگ کے بعد کی تعلیمی ترقی کے لئے جو منصوبہ ہندوستان میں بنایا گیا ہے وہ اتنا ہمہ گیر اور ایسے بڑے پیمانے پر ہے کہ اس سے پہلے ایسا منصوبہ کبھی نہیں بنایا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں جسے حکومتِ ہند کے مشیر تعلیم مسٹر جان سارجنٹ کے نام پر سارجنٹ اسکیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چھ اور چودہ سال کے درمیانی عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لازمی ہمہ گیر تعلیم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس تعلیم کا مقصد محض "خواندگی" کا معیار حاصل کرنا نہیں ہوگا بلکہ طلبہ کو شہریت کے فرائض انجام دینے کے لئے کم ترین طریقے پر تیار کرنا ہوگا۔ چھ سال سے کم عمر کے بچّوں کے لئے گہوارہ کے مدرسوں کو بھی منصوبہ میں رکھا گیا ہے اور ان سب بچوں کو جن میں اس کی صلاحیت دیکھی جائے گی ثانوی اور فوقانی تعلیم کا بھی موقع دیا جائے گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں منتخب طلبہ کے لئے خاص زور پوسٹ گریجوایٹ اور ریسرچ کے کام کی سہولتوں پر دیا جائے گا اور کالجوں کی موجودہ گنجائش کو دوگنا کر دیا جائے گا ٹیکنیکل تجارتی اور آرٹ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا بالغوں کی پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ

تعلیم کا مقصد یہ ہوگا کہ ۲۵ سال کے دوران میں ۴۰ سال سے کم عمر کے تمام لوگوں کو خواندہ بنا دیا جائے۔ اس اسکیم کو چلانے کے لیے ۲۰ لاکھ مزید استادوں کی ضرورت ہوگی، اور ان میں کا ہر استاد معقول طریقے پر تربیت یافتہ ہوگا۔ اسکیم کے خرچ کا اندازہ جب اس پر پوری طرح عمل جاری ہو جائے گا۔ تین ارب بارہ کروڑ روپیہ سالانہ کیا گیا ہے۔ جنگ سے قبل سرکار کی طرف سے تعلیم پر صرف ۱۷ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کئے جاتے تھے۔

ہندوستان میں اس رپورٹ کو عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور اب اس پر حکومت ہند اور صوبے کی حکومتیں غور کر رہی ہیں۔

روس انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
نی ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب روس کی کامیابی کا دنیا کو پہلی بار اس وقت احساس ہوا جب روس نے اپنے پنج سالہ منصوبہ نمبر ا کو وقت سے پہلے مکمل کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کے ملکوں میں نہایت ہولناک کساد بازاری کا دور دورہ تھا۔ لیکن روس اس عالمگیر وبا سے محفوظ رہا اور اس کی آبادی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی تدبیروں میں لگی رہی

اس کے بعد سے روس کی تعریف میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کے لہجے میں مربیانہ شفقت اور سرپرستی کا انداز پایا جاتا تھا۔ موجودہ جنگ عظیم تک روس کے کارناموں کو سراہا جاتا رہا، لیکن مغرب کے دول عظمیٰ روس کی طاقت کو اپنے سے کم درجے کا سمجھتے رہے جرمنی کے مقابلے میں روس کی ابتدائی پس پائیوں سے لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ روس اب نہ پنپ سکے گا اور چین کی طرح اندرونی خانہ جنگیوں اور قحط سالیوں کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن اس کے بعد جس حیرت انگیز طریقے پر روس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس لیا اور اپنی جارحانہ پیش قدمیوں کو مسلسل جاری رکھا اس نے روز بروز لوگوں کے دلوں میں روس کا احترام اور اس کے ساتھ عقیدت واحسان مندی کو جاگزیں کرنا شروع کر دیا۔ اب لوگوں نے اس بات کو دل سے مانا کہ انقلاب نے واقعی روس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا ہے روس کا نظام مستحکم اور پائدار بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے اور اس کے پراگندہ

اور منتشر ہو جانے کے امکانات مفقود ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ جن کا شمار کل تک ذلیل انقلابیوں اور کم حیثیت مزدوروں اور کسانوں میں کیا جاتا تھا آج دنیا کے ممتاز ترین مدبر، جنرل اور صنعتی رہنما بن گئے ہیں۔ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ دول عظمیٰ کے قدامت پسندوں میں روس کی جانب سے خوف و اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اب وہ نئے پرانے نظام کا ایک خطرناک دشمن سمجھنے لگے ہیں۔

ان حالات میں قدرتی طور پر یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کی زندگی کے فرق کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے اور ان اصلاحوں اور ترقیوں کا پتہ لگایا جائے جنھوں نے روس کے جاہل اور پس ماندہ عوام کو دنیا کی مہذب ترین قوموں کا مد مقابل بنا دیا ہے اور ان کے ملک کو دنیا کے عظیم ترین دول میں شامل کر دیا ہے۔

اس مختصر مضمون میں اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اصلاحِ معاشرت کی چند مخصوص تحریکوں کو منتخب کر کے ان کے بارے میں کچھ سرسری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے تبدیلی کا ایک عام خاکہ پیش کر دیا جائے تو مناسب ہو گا۔

روس کے عوام انقلاب سے پہلے جاہل تھے، اوہام پرست تھے، غیر معمولی طور پر بیماریوں میں مبتلا تھے اور بعض علاقوں میں واقعی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے حکمران ایک غیر ملکی نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے تھے اور بد اخلاقیوں میں مبتلا تھے۔ اس ملک کا سیاسی دستور نکما اور دقیانوسی ہو چکا تھا۔ انقلاب کے بعد جب ۱۹۱۷ء میں اس ملک کی رہنمائی لینن نے اپنے ہاتھ میں لی تو اس وقت کی حالت کا نقشہ ایک نہایت واقف کار شخص ڈاکٹر ای جے ڈلن نے اپنی کتاب "دی اکلپس آف رشیا" (روسی چاند گہن میں آ گیا) میں کھینچی ہے۔ مصنف مذکور کی ساری پونجی انقلاب میں برباد ہو گئی تھی اور وہ بالشوزم کو اس زمانے میں حقارت

کی نگاہ سے دیکھا تھا اس لئے اس پر جانب داری کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ زار کے زمانہ کے روس میں نسلوں اور مذہبوں کے جو بے شمار اختلافات پائے جاتے تھے ان کو دیکھ کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"جب روس کی قوموں سے قطع نظر کرکے وہاں کے عوام یعنی زراعت پیشہ آبادی پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو نظر آتا ہے کہ اس کے معاشرتی ادارے عہد وسطی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی کوششیں ایشیا کے باشندوں جیسی تھیں اور زندگی کے بارے میں اس کا تصور زمانہ قبل تاریخ جیسا تھا۔ کسانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جاپانیوں کو، مانچوریا میں روس کے مقابلے میں جو کامیابی ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانیوں نے جراثیم کی شکل اختیار کرلی تھی اور روسی سپاہیوں کے بوٹوں میں گھس گئے تھے اور ان کے پاؤں کو کاٹ کر انھیں مار ڈالتے تھے۔ جب کسی ضلع میں کوئی وبا پھیلتی تھی تو وہ سب سے پہلے وہاں کے ڈاکٹر کو مارتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کنوؤں میں زہر ڈال کر بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ وہ جادوگرنیوں کو زندہ جلا کر خوش ہوتے تھے اور بھوت کو دفن کرنے کے لئے مردے کی لاش کو قبر سے نکالتے تھے۔ بے وفا بیویوں کو مادر زاد ننگا کرکے انھیں گاڑی سے باندھ دیتے تھے۔ اور ان پر کوڑے برساتے تھے اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ کسانوں کے تمدن کا معیار جن کا نام لے کر روس کو اس وقت تباہ کیا جارہا ہے۔ مغربی یورپ کے مقابلے میں بہت ادنے سطح پر ہے۔ جب کسانوں کے انبوہ کثیر پر سے وہ پابندیاں اٹھالی گئیں جو امن وامان قائم کئے ہوئے تھیں تو جماعت کے لئے اس کے نتائج لازماً نہایت اندوہناک ثابت ہوئے۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح کسانوں میں بھی اس معاشرتی حس کا فقدان ہے جو ایک قوم میں اتفاق، یگانگت اور سیاسی اتحاد کو قائم رکھتی ہے۔ یہاں کے عوام کو جو چیز نراج کا شکار بننے سے بچائے ہوئے تھی وہ خدا کا ایک ابتدائی تصور اور زار روس کا خوف تھا۔ لیکن مانچوریا کی شکست کے بعد

سے ان میں کمزوری پیدا ہونا شروع ہو گئی .... روس کے اکثر کسان ایسے جھونپڑوں میں رہتے ہیں جو سوروں کے رہنے کی جگہ سے بھی زیادہ گندے اور بدبودار ہوتے ہیں۔ وہ سردی کے موسم میں چھ بجے بلکہ پانچ بجے سو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس مٹی کا تیل خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ انھیں نہ گوشت کھانے کو ملتا ہے نہ انڈے نہ مکھن، نہ دودھ اور اکثر گوبھی تک نہیں ملتی۔ وہ زیادہ تر سیاہ روٹی اور آلوؤں پر زندہ رہتے ہیں۔ نہیں یوں کہیئے اُن کی ناکافی مقدار پر بھوکے مرتے ہیں۔ آج بھی (یعنی ۱۹۱۷ء میں) بیسریبیا میں ایسے بے شمار کسان ہیں جو کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بھوک سے مر رہے ہیں۔ وائٹ ایشیا میں اس وقت جبکہ فوج کے محفوظ دستے جنگ پر جا چکے ہیں۔ بہت سے ایسے گھر ہیں جن میں خاندان کے گذر کے لئے آدھ سیر جئی بھی نہیں ہے، اور نہ ہی کمانے والا گھر پر موجود ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ان فاقہ زدہ مردوں، عورتوں اور بچوں نے اپنے کھیتوں پر کافی غلہ پیدا کیا تھا۔ لیکن فصل کٹنے کے بعد سرکاری محصول ادا کرنے کے لئے انھیں اسے فروخت کر دینا پڑا تھا۔ اور اس کی انھیں محض برائے نام قیمت ملی تھی۔ سیاسیات سے انھیں کوئی واسطہ اور مطلب نہیں ہے اور روس کو یہ بالکل نہیں سمجھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ چالاک اور زمین کے لالچی ہیں۔ پہلے ان کی کوئی آواز اور اہمیت نہیں تھی اب باشعور طبقوں، خصوصاً سرکاری طبقوں نے ان کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ یہ صرف زمین کے طلبگار تھے، زمین انھیں کس طرح ملے۔ اس کے بارے میں یہ کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ ملکیت کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان کے ذاتی مقبوضات کو تو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ البتہ زمینداروں کے حقوق بلا تأمل اُن سے چھینے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک سادہ لوحانہ اشتراکیت تھی جسے صدیوں کی جہالت، غلامی اور گمراہی نے پیدا کیا تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ اس عنصر کی مکمل آزادی کے معنی لازماً یہ ہوں گے کہ زار شاہی تباہ ہو جائے .... گیارہ سال ہوئے (یعنی ۱۹۰۶ء میں) میں نے لکھا تھا "روس

میں کسانوں کے سوال کو انقلاب کی ابتدا اور انتہا سمجھنا چاہیے۔ یہ وہ تخریبی آلہ ہے جو زار کی فوجی طاقت کے باوجود پرانے نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ البتہ اگر زمین کے اہم مسئلہ کا کوئی تشفی بخش حل نکل آیا تو پھر انقلاب بہت کمزور ہو جائے گا۔ ... ... کیونکہ اس بات کو ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اسی فی صدی آبادی ناخواندہ ہے اور لاکھوں ایسی تاریک جہالت اور اوہام پرستی میں مبتلا ہیں جس کا غیر ملکی لوگ کوئی تصور بھی قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے انھیں رہنمائی کی بہت سخت ضرورت ہے۔ یہ نعرہ "زمین کس کی؟ کسانوں کی" ان پر ایک نشہ طاری کر دیتا ہے اور انھیں بالکل دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دوسروں کے جان و مال کے خلاف ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ اس سے ایک ایسی بے اندازہ آتش گیر طاقت وجود میں آتی ہے جس سے موجودہ معاشرتی اور سیاسی نظام کو درہم برہم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زار کی فوج کی طاقت بالکل حقیر اور ہیچ معلوم ہوتی ہے کیونکہ فوج کا منبع بھی خود دیہی طاقت ہے، اور وہ اپنی جد و جہد اور میلانات سے فوج کو بھی متاثر کر سکتی ہے ... غرض اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک سہل پسند متحمل، بے تدبیر جاہل، دروغ گو اور ایسا غیر منظم گروہ جس پر خوں خواری کے دورے پڑتے ہیں، پیدا ہو جاتا ہے اور سے پیر اگوئی کے جنگلی گاکومس قبیلے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر ڈلن نے لینن اور اس کے رفقاء کے بارے میں حسب ذیل رائے قائم کی تھی:-

"بالشویک تحریک میں ذرہ برابر بھی تعمیری اور اجتماعی تصور نہیں ہے، لینن اور ٹروٹسکی کے مغربی مداحوں کو بھی بالشوزم میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آسکتی۔ صحیح سوشلزم کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کی کلی اور ترکیبی تنظیم لیکن بالشوزم میں اس کے کوئی آثار نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس اس میں ایک جز کو کل قرار دے دیا گیا ہے اور بقیہ حصہ کے ساتھ جو سلوک

کیا جاتا ہے وہ الگزنڈر اول اور نکولس اول کے زمانے کے بیگاریوں سے بہتر نہیں ہے بالشوزم کو دراصل زارشاہی کی ایک الٹی شکل سمجھنا چاہیئے۔ سرمایہ داروں کے ساتھ اس کا سلوک ایسا ہی خراب ہے جیساکہ زاروں کا بیگاریوں کے ساتھ تھا۔ بالشوزم اخباروں کا گلا گھونٹتا ہے، آزادی کی ممانعت کرتا ہے۔ قوم کے منتخب کئے ہوئے نمایندوں کو گرفتار یا جلاوطن کرتا ہے۔ اوران جرائم کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے جو اپنی خونخواری میں بالکل شیطانی معلوم ہوتے ہیں "

لیکن دس سال بعد ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر ڈلن دوبارہ اشتراکی جمہوریت ہائے متحدہ روس میں وارد ہوا تو وہاں کی باتیں دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ وہ اپنی کتاب " رشیا ٹوڈے اینڈ ٹومارو" (روس اب اور آئندہ) میں لکھتا ہے:۔ ہر جگہ لوگ غور کر رہے ہیں، کام کر رہے ہیں، متحد ہو رہے ہیں، علمی انکشاف اور صنعتی ایجادیں کر رہے۔ اگر کسی شخص کے لئے روسی جمہوریتوں پر طائرانہ نگاہ ڈالنا ممکن ہوتا تو وہ اپنے حواس کی شہادت کا مشکل ہی سے یقین کر سکتا دنیا میں آج تک ایسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز اپنے مقصد کے تنوع شدت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ انقلابی کوشش پہاڑ جیسی رکاوٹوں کو روئی کی طرح سلنے سے ہٹارہی ہے اور غیر ہم آہنگ عناصر کو ایک عظیم قوم میں جذب کر رہی ہے اور جب میں قوم کا یہ لفظ استعمال کرتا ہوں تو اُس کے پرانے معنی نہ لئے جائیں بلکہ اس سے میری مراد ایک ایسی مضبوط جماعت ہے جو گویا مذہبی جوش سے سرشار ہو کر متحد ہو گئی ہے ...... بالشوکوں نے جو کچھ ارادہ کیا تھا اس کے بہت بڑے حصے کو مکمل کر لیا ہے اور جو کام انھوں نے کیا ہے اور جن ناموافق حالات کا مقابلہ کرکے کیا ہے وہ کسی دوسری انسانی تنظیم کے لئے قابلِ حصول نہیں تھا۔ انھوں نے پندرہ کروڑ ایسے آدمیوں کو جو بالکل قالب بے جان نظر آتے تھے، ایک نئی روح سے معمور کر دیا ہے۔ انھوں نے کرۂ زمین کے چھٹے حصے سے پرانی دنیا کے نظام کو نیست ونابود کر دیا ہے اور دنیا کے

باقی سب حصّوں میں بھی اس کے لئے قبریں تیار کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہنگامی مشکلوں کا مقابلہ کرنے میں اپنی قابلیت اور عزم و ہمت اور اپنے مواقع سے فائدہ اُٹھانے کا پورا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اپنے ملک کی مختلف قوموں کے ساتھ جو برتاؤ انھوں نے کیا ہے اور جو وطنی آزادی اُنھیں عطا کی ہے اُسے جدّت اور سلیقے کا شاہکار مانا جا سکتا ہے۔ اقلیتوں کے مطالبوں کو پورا کرنے کے جو طریقے انھوں نے اختیار کئے ہیں ان کا مقابلہ دنیا کا کوئی موجودہ مدبّر نہیں کر سکتا۔ ان تمام معاملوں میں اور دوسرے اقدامات میں جو قوت اُن سے کام کرا رہی ہے وہ ناقابلِ تسخیر بلکہ معجزہ نما معلوم ہوتی ہے .... بالشوزم تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ دنیا کی عظیم الشان مصفّی مسہلوں میں سے ہے جسے بعض وقت ہم مشیّت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور جس کا ظہور طویل مدتوں کے وقفہ کے بعد انسانی زندگی کے فسادات کو دور کرنے کے لئے اور نئے انسانی نظاموں کے واسطے زمین کو ہموار کرنے کے لئے ہوا کرتا ہے عبرانیوں نے حضرت موسٰی۔ ہنوں نے اٹیلا۔ منگولوں نے چنگیز خاں کی رہنمائی میں جو کام کیا تھا وہی بالشوکوں نے لینن کی رہنمائی میں کیا ہے۔ یہ سب ایک ہی بالائے فہم نقاش کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ بالشوزم کی ابتدا، زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوئی ہے اور اگر ان ناانصافیوں کا ختم کرنا ضروری نہ ہوتا جن میں ہماری فرسودہ تہذیب مبتلا ہے تو یہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ بالشوزم، خیر و شر۔ رحم و مروت سے بے تعلق ہے۔ کیونکہ یہ ایک فوق تجربی شے ہے۔ یہ عسائیت کی طرح دنیا میں امن پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ جنگ کرنے کے لئے آیا ہے اور اس کے شکار کئے ہوئے لوگوں کی تعداد سخت سے سخت خونریز جنگوں سے بھی زیادہ ہے۔ اس کا انجام چاہے خیر ہو چاہے شر لیکن مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ اس وقت دنیا میں ایک نہایت زبردست قوتِ محرکہ ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت بے درد حقیقت ہے۔ اس کے افسانوں سے "بوئے خون" آتی ہے۔ لیکن اس کا زمین پر ایک مقصد اور مشن ہے جو یقیناً پورا ہو کر

رہے گا۔"

بالشوکوں کے بارے میں ڈاکٹر ڈلن جیسے واقف کار اور غیر جانب دار شخص کو اُن کی دس سال کی کارگزاریوں کو دیکھنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں جس طرح اپنی رائے میں بنیادی تبدیلی کرنا پڑی تھی۔ اسی طرح اب دوسرے اور بہت سے مصنفوں کو بھی بالشوکوں کے ۲۵ سال کے کارناموں کو دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لئے ان کی رہنمائی میں روس کی زندگی میں جو غیر معمولی اصلاح و ترقی ہوئی ہے وہ کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی ہے لہذا اس پر مزید بحث کئے بغیر اب ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ اپنے اس کام کو انجام دینے کے لئے انھوں نے کون کون سے طریقوں کو اختیار کیا۔ ان طریقوں کو ہم حسب ذیل عنوانوں کے ماتحت تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱۔ عورتوں کی اصلاح و ترقی اور شیر خوار بچوں کی نگہداشت۔

۲۔ صحت و صفائی کی اصلاح و ترقی۔

۳۔ معاشی اطمینان و عافیت کی ترقی

۴۔ تعلیم کی ترقی (الف) ابتدائی فنی اور اعلیٰ تعلیم۔

(۵) تعلیم کی ترقی (ب) جسمانی۔ سیاسی اور جمالی تربیت اور تعطیلات و تفریحات کی تنظیم

۱۔ مکانوں کی فراہمی اور شہروں کا منصوبے کے مطابق بسانا۔

۷۔ میونسپل خدمات کی ترقی

(باقی)

ہندوستان کی بنک کاری کا مستقبل

دورانِ جنگ میں ہندوستانی بنکوں کی حالت میں دو غیر معمولی تغیرات ہوئے ہیں۔

(۱) بنکوں کی امانتوں میں اضافہ ہوا ہے۔

(۲) لیکن بنکوں سے کم مقدار میں قرضے لئے گئے ہیں جس کی وجہ سے امانتوں اور قرضوں کا باہمی تناسب فی صد گر گیا ہے۔

امانتوں میں اضافہ کے اسباب :- امانتوں میں اضافہ کے اسباب متعدد ہیں

(۱) امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حکومتِ ہند و حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر خریداریاں کی ہیں جس کی وجہ سے صناع، تاجر اور ٹھیکہ داروں کی آمدنیوں میں اضافہ ہوا ہے اور انھوں نے اپنی ان رقومات کو بنکوں میں رکھا یا ہے

(۲) جنگ کی وجہ سے بعض ایسے طبقوں کی آمدنیوں میں اضافہ ہوگیا ہے، جو پہلے بنکوں میں امانتیں نہیں رکھاتے تھے۔ اب یہ لوگ بھی بنکوں میں امانتیں رکھانے لگے ہیں۔

(۳) امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ افراطِ زر بھی ہے۔ حکومتِ ہند نے حکومت برطانیہ کی خریداری کے لئے روپیہ فراہم کرنے کا انتظام اپنے ذمے رکھا ہے۔ حکومت برطانیہ ان خریداروں کی ادائی اسٹرلنگ میں کرتی ہے جو ہندوستان کے نام لندن کے ذخیرہ اسٹرلنگ میں جمع کردئے جاتے ہیں اور ان کے معاوضہ میں روپئے کی اجرائی کے لئے تمسکات اسٹرلنگ ریزروبنک کے شعبہ بنک کاری سے شعبۂ اجرائی میں منتقل کئے جاتے ہیں، جن کی پشت پناہی پر روپیہ جاری کیا جاتا ہے۔ غرض کہ افراطِ زر کے اس طریقے کی وجہ سے صناع، تاجر، ٹھیکہ داروں اور سٹہ بازوں کی آمدنیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں نے بنکوں میں زیادہ امانتیں رکھائی ہیں

قرضوں میں تخفیف کے اسباب :-

قرضوں کی مقدار میں حسب ذیل اسباب کی بنا پر تخفیف ہوئی ہے۔

(۱) حکومت نے خود اپنے طور پر جنگی ٹھیکوں کے لئے رقمی مدد دی۔

(۲) اشیاء کی خریداری کے لئے حکومت نے فوراً اپنے پاس سے رقم ادا کی۔

(۳) صنعتی کاروبار میں اضافہ ہوا اور حرفت کاروں کو منافع بھی اچھا ملا، جس کی وجہ سے ان لوگوں نے بنکوں سے نقد رقم کم مقدار میں قرض لی

(۴) مشترکہ سرمایہ دار کمپنیوں سے محصول وصول کرنے میں دیر کی گئی جس کی وجہ سے انھیں رقم لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

(۵) حکومتوں نے قیمتوں کی نگرانی کی اور فصلوں کو براہ راست کاشتکاروں سے خریدا۔

(۶) درآمدی اشیاء کے تھوک اور جلد فروشندے اپنے ذخیروں کو نہ بڑھا سکے۔ کیونکہ یہ اشیاء انھیں دستیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ اس عدم دستیابی کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ حکومت نے ان کی کافی مقدار حاصل کر لی تھی اور دوسرے یہ کہ درآمد پر سختی سے نگرانی عائد کر دی گئی تھی۔ چونکہ تاجر درآمدی اشیاء کے ذخیروں میں اضافہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے ان کو زیادہ مقدار میں بنکوں سے رقومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی

غرض کہ دوران جنگ میں مختلف وجوہات کی بنا پر امانتوں میں اضافہ اور قرضوں میں تخفیف ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوران جنگ میں زر کی مقدار میں جو توسیع کی گئی ہے، وہ اگر بعد جنگ ختم ہو جائے تو بنک کی امانتوں اور قرضوں پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے۔ پھر دوسرے یہ کہ جنگ کی وجہ سے جو صنعتی و تجارتی گرم بازاری پیدا ہو گئی ہے، جنگ کے بعد اگر یہ گرم بازاری ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟

ان دو تنقیحات کی روشنی میں ہم بنکوں کی امانتوں اور قرضوں کے مستقبل کا

مطالعہ کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا جنگ کے بعد امانتوں کی مقدار میں تخفیف ہو جائے گی؟

جنگ کے بعد امانتوں میں کمی کے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

(۱) جنگ کی وجہ سے تجارتی صنعتی اور کاروباری سرگرمی پیدا ہو گئی ہے، بینکوں نے بھی اس سرگرمی میں حصہ لیا ہے اور قرضے دیئے ہیں۔ اگر جنگ کے بعد بینک اپنے ان قرضوں کو واپس طلب کریں اور یہ قرضے ادا کر دیئے جائیں تو پھر بینک کی امانتوں میں تخفیف ہو گی۔ —— لیکن یہ پیش قیاسی کی جا سکتی ہے کہ جنگ کے بعد بینک اپنے یہ قرضے واپس طلب نہیں کریں گے، کیونکہ ہندوستان کے پیش نظر اس وقت تعمیر و ترقی کے وسیع معاشی منصوبے ہیں اور ملک کے کاروباری ماہرین ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس لئے اندازہ یہی ہے کہ جنگ کے بعد تعمیر و ترقی کے ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے بینکوں سے زیادہ خدمات طلب کی جائیں گی۔ اس لئے موجودہ قرضوں کی واپسی کا امکان کم ہے۔

(۲) حکومت نے دوران جنگ میں کافی مقدار میں قرضے حاصل کئے ہیں۔ اگر جنگ کے بعد حکومت بھاری محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کر کے ان قرضوں کو ادا کر دے تو پھر بینکوں کی امانتوں میں تخفیف ہو گی کیوں کہ ان محاصل کی ادائی کے لئے محاصل ادا کنندے اپنی رقومات بینکوں سے نکالیں گے۔

اس سلسلے میں چند امور غور طلب ہیں۔ حکومت محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کر کے قرضوں کی ادائی کا اسی وقت بند و بست کر سکتی ہے جب کہ وہ جنگ کے بعد بچت والے موازنے تیار کرے۔ مگر امکانات یہ ہیں کہ حکومت تعمیر و تنظیم ما بعد جنگ کی اسکیموں میں عملی طور پر حصہ لے گی، جس کے لئے اس کو کثیر مالی وسائل کی ضرورت لاحق ہو گی۔ اس لئے اس بات کا امکان نہیں ہے کہ حکومت جنگ کے بعد قرضے نہیں لے گی۔

پھر یہ چیز غور طلب ہے کہ اگر حکومت جنگی قرضوں کی ادائی کے لئے محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کرے گی۔ تو یہ رقومات ان ہی لوگوں کو دے گی جنھوں نے جنگی قرضوں میں حصہ لیا تھا اور یہ واضح رہے کہ حکومت کے جنگی قرضوں میں حصہ لینے والوں کی اکثریت ان ہی اشخاص کی تھی جن پر حکومت بعد جنگ محاصل لگائے گی۔ گویا جس طبقے سے اُس زمانے میں قرضہ لیا گیا ہے۔ اُسی طبقہ سے محصول کے ذریعے رقم لے کر اس کا قرضہ بیباق کردیا جائے گا۔ اس طرح ان طبقوں کو اپنے بنک کی امانتوں میں تخفیف کرنے کی بڑی حد تک ضرورت نہ ہوگی۔

(۳) اگر جنگ کے بعد ہندوستان کا توازن تجارت مخالف ہوجائے یعنی ہندوستان کی درآمد اس کی برآمد سے بڑھ جائے تو اس کا امکان ہے کہ بنک کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ کیونکہ ہندوستانی درآمد کنندے بنکوں سے اپنی رقومات نکال کر ان درآمدات کی ادائی کریں گے۔

لیکن یہاں بھی بعض امور غور طلب ہیں۔

(i) ہمارا توازن تجارت اسی وقت مخالف ہوسکتا ہے جب کہ نگرانی مبادلہ کو برستور برخواست کردیا جائے۔

(ii) مخالف توازن تجارت کے باوجود اگر ہمیں اپنے فاضلات اسٹرلنگ کے آزادانہ استعمال کی اجازت دی جائے تو پھر امانتوں میں تخفیف نہ ہوگی۔ کیونکہ مخالف توازن تجارت کی بھرپائی یا بالفاظ دیگر زائد درآمدات کی قیمتوں کی ادائی فاضلات اسٹرلنگ سے کی جاسکے گی ایسی صورت میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے فاضلات اسٹرلنگ کی مقدار گھٹ جائے گی۔ لیکن بنکوں کی امانتوں میں بہر حال تخفیف نہیں ہوگی۔

(iii) جنگ کے بعد ہم اپنی معاشی تعمیر و ترقی کے لئے کثیر مقدار میں اشیائے اصل درآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اگر محض اشیائے اصل کی زائد درآمد کے باعث توازن تجارت مخالف ہوجائے

تو اس کی وجہ سے امانتوں کی مقدار میں بڑی حد تک غیر معمولی تخفیف نہ ہوگی۔ کیونکہ اشیائے اصل کی درآمد کے باعث ملک کی معاشی و صنعتی سرگرمی میں اضافہ ہوگا اور اس طرح بنکوں سے زیادہ مالی امداد طلب کی جائے گی، اور اس حد تک امانتوں کی تخفیف کو روکا جاسکے گا۔

(۱۷) زیادہ امکان تو اس امر کا بھی ہے کہ توازن تجارت ہمارے مخالف نہیں رہے گا ہندوستان کا توازن تجارت ہمیشہ موافق رہا ہے۔ ہندوستان سے بعض اشیاء مثلاً چلئے، سن، تل وغیرہ جتنی مقدار میں پہلے برآمد ہوتی تھیں، امکان یہی ہے کہ جنگ کے بعد بھی ہوتی رہیں گی، کیونکہ یہ چیزیں دوسرے ممالک سے کم داموں پر حاصل نہیں ہوسکتیں لہذا ہندوستان کا موافق توازن تجارت جنگ کے بعد بھی باقی رہے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ ہم اشیائے اصل (مشنری وغیرہ) زیادہ مقدار میں درآمد کریں گے۔ اس لئے ممکن ہی کہ توازن تجارت مخالف ہو جائے، تو اس کا امکان یوں کم ہے۔ ہم اپنے فاضلات اسٹرلنگ سے ان درآمد شدہ اشیائے اصل کی قیمت کے ادا کریں گے۔

(۱۸) بیان کیا جاچکا ہے کہ امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ افراط زر بھی ہے۔ اگر جنگ کے بعد اتنے وسیع پیمانے پر تعمیری کاروبار شروع نہ کئے جائیں تو زر کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا جاسکے گا اور اس لئے امانتوں میں بھی اضافہ نہ ہوگا۔

اگر جنگ کے بعد خانگی تاجروں اور صناعوں نے ریزرو بنک کو روپیہ دے کر اس کے معاوضہ میں اسٹرلنگ حاصل کرلیا تاکہ وہ اپنی درآمد کردہ اشیاء کی قیمت ادا کرسکیں تو اس طریقہ کار کی وجہ سے بنکوں کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ پھر جب ریزرو بنک کو اسٹرلنگ کے معاوضہ میں روپیہ مل جائے گا تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان روپیوں کو، جن کی پشت پناہی پر اسٹرلنگ نہیں ہیں، خارج کردے گا گویا تفریط زر کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ اگر اس حکمت عملی کو اختیار کیا جائے گا تو امانتوں میں یقیناً تخفیف ہوگی۔

اس کے تدارک کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ حکومت اس حکمتِ عملی کو اختیار نہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بنک عوام میں کفایت شعاری کی مہم کو آگے بڑھائیں۔ ہندوستان میں اس مہم کو جاری کرنے کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ یہاں کا طریقہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔

(ب) قرضے :۔ آیا جنگ کے بعد قرضوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا یا تخفیف ہوگی؟

جنگ کے بعد دشمن ممالک سے تجارت ہونے لگے گی۔ درآمد برآمد پر سے نگرانی برخواست ہوجائے گی۔ بین صوبجاتی حمل و نقل پر جو امتناع اس وقت عائد کیا گیا ہے، اُٹھالیا جائے گا۔ ان حالات میں کاروباری سرگرمی بڑھے گی اور قرضوں کی طلب میں اضافہ ہوگا، لیکن جنگ کے بعد اگر سرد بازاری کا دور دورہ ہوا تو پھر قرضوں کی طلب میں اضافہ نہیں ہوگا۔ بلکہ وہی حالت رہے گی جو اب دورانِ جنگ میں ہے۔

قانون بنک کاری :۔

دورانِ جنگ قانون بنک کاری میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بنک کاری سے متعلق ایک جامع قانون کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں آنجہانی سر جیمس ٹیلر سابق گورنر ریزرو بنک نے حکومت ہند کے پاس ایک مسودۂ قانون روانہ کیا تھا، اور یہ مسودہ عوام میں گشت بھی کر رہا تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے اس سلسلے میں مزید قدم نہیں اُٹھایا گیا۔ البتہ اس اثناء میں قانون کارخانہ جات کی بعض دفعات میں جن کا تعلق بنک کاری سے تھا، ترمیم کی گئی۔ لیکن گذشتہ تین سال میں بہت سے نئے بنکوں کا افتتاح عمل میں آیا، اور کئی نئی شاخیں کھولی گئیں ہیں، جس کی وجہ سے ملک کا یہ عام مطالبہ تھا کہ بنک کاری کے متعلق ایک جامع قانون بنایا جائے۔ ریزرو بنک نے اپنے پرانے مسودے میں چند تبدیلیاں کرنے کے بعد حکومت کے پاس روانہ کیا تھا۔ اور وزیر مالیہ سر جرمی ریزمن نے اسی کو مسودۂ قانون کی شکل میں ۶ر نومبر ۱۹۴۴ء کو مجلس مقننہ

میں پیش کیا ہے۔ اس مسودہ کی پہلی خواندگی ہو چکی ہے اور امید ہے کہ یہ مسودہ بہت جلد قانون بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ مستقبل میں ملک کی بنکاری کی تشکیل بڑی حد تک اسی قانون کے تحت ہوگی، اس لئے یہاں ہم اس مسودہ کے بعض دفعات پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

(۱) بنک کاری کی تعریف:۔ بنک کاری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "بنک کاری کے معنے ہیں امانتوں کو قبول کرنا اور عندالضرورت اُن کو ادا کرنا"۔ یہ تعریف بہت ہی سادہ اور جامع ہے۔ توقع ہے کہ بنک کاری کے کاروبار میں جو قانونی اور کاروباری پیچیدگیاں پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔ اب اس تعریف کے بعد رفع ہو جائیں گی۔

(۲) اداشدہ اصل وذخیرہ محفوظ:۔ موجودہ نافذہ قانون کی رو سے بنکوں کا اداشدہ اصل اور ذخیرہ محفوظ کم سے کم پچاس ہزار روپیہ ہونا چاہئے۔ لیکن موجودہ مسودہ میں اس کی مقدار بڑھا کر ایک لاکھ کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بنک کے اصل وذخیرہ محفوظ کا تعین اس کے محل وقوع اور آبادی کے لحاظ سے کیا گیا، مثلاً بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے بنکوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پانچ لاکھ کا اصل رکھیں۔ ان کے علاوہ دیگر شہروں (جن کی آبادی ایک لاکھ ہو) کے بنکوں کے لئے دو لاکھ روپیہ رکھنا لازمی ہے جن بنکوں کی رجسٹری برطانوی حصہ سے باہر (مثلاً دیسی ریاستوں) یا سلطنتِ متحدہ میں ہوئی ہو تو انھیں چاہیئے کہ کم سے کم ۲۰ لاکھ روپیہ نقد ریزرو بنک میں جمع کرائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان قواعد کا اثر بنک کاری کے مستقبل پر کیا پڑے گا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل کا اتنا اعلیٰ معیار اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس امر کا لحاظ کئے بغیر کہ کون سا بنک کتنے پیمانے پر کاروبار کرتا ہے، اصل کا اعلیٰ معیار مقرر کر دینے سے کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے؟

اداشدہ اصل اور ذخیرۂ محفوظ کو اس قدر بڑھاکر مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے باعث بڑے شہروں میں نبکوں کی شاخوں کو زیادہ بہتر طریقے پر منظم کیاجاسکے گا۔ لیکن ہمارے خیال میں محض اداشدہ اصل کی مقدار بڑھا دینے سے نہ تو شاخوں کی تنظیم ہوسکتی ہے اور نہ ہی کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہوسکتا ہے۔

پھر بڑے شہروں کے نبکوں کے لئے اصل کی جو زائد مقدار مقرر کی گئی ہے اس وجہ سے ان شہروں میں چھوٹے بنک کھلنے نہیں پائیں گے۔ عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ چھوٹے نبکوں کے باعث کاروبار میں افراتفری پھیلتی ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بنک اپنے حلقے کے لوگوں سے شخصی طور پر واقف ہوتے اور ربط رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے چھوٹے تاجروں اور صناعوں کو اعتبار کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان قواعد کے نفاذ کی وجہ سے اُن لوگوں کو اعتبار و قرض کے سلسلے میں گوناگوں دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ برطانوی ہند سے باہر جن نبکوں کی رجسٹری ہوئی ہو، وہ اگر کسی صوبے میں اپنی شاخیں کھولیں تو انھیں دو لاکھ روپے ریزرو بنک کے پاس جمع کرانے ہوں گے۔ اس دفعہ کے مضمرات یہ ہیں کہ دیسی ریاست کا بنک برطانوی ہند کے کسی صوبے میں اپنی شاخ بمشکل ہی کھول سکے گا۔ بالفاظ دیگر اس دفعہ کے باعث ملک کے اندر بنک کاری کی خاطر خواہ توسیع نہ ہو سکے گی اور چھوٹے چھوٹے تاجروں اور صناعوں کو اعتباری سہولتیں فراہم نہ ہو سکیں گی۔

(۳) مسودۂ قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ ہر بنک اپنی امانتوں کا ۲۵ فی صد نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھے گا۔

یہ قاعدہ بھی کچھ زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ان چھوٹے چھوٹے نبکوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی جو زیادہ تر زرعی کاروبار کے لئے

اعتباری سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے فنڈ کا اتنا بڑا حصہ محفوظ رکھوانے سے ان کے کاروبار میں دقت اور کمی ہو گی۔ پھر دوسرے یہ کہ زراعت کو رقمی امداد کی ضرورت موسمی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ رقم چھوٹی مدت کے لئے دی جاتی ہے۔ جو بنک یہ کاروبار کرتے ہیں انھیں موسمی امانتوں کو حاصل کرنے کے لئے مزید تشویق وترغیب سے کام لینا پڑتا ہے یعنی امانتیں حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ شرح سود دینی پڑتی ہے جب اس دفعہ کے تحت اُن کے کاروبار میں کمی ہوگی تو وہ اعلیٰ شرح سود کس طرح دے سکیں گے؟ بالفاظ دیگر زرعی کاروبار کے لئے جو بنک اعتبارکی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔اس دفعہ کے تحت اپنی امانتوں کا ایک بڑا حصہ نقد یا تمسکات کی صورت میں کھوکر وہ اپنے کاروبار میں کمی کریں گے اور جب اُن کے کاروبار میں کمی ہو گی تو وہ اعلیٰ شرح سود نہ دے سکیں گے۔ جس کے باعث انھیں زیادہ مقدار میں امانتیں حاصل نہ ہو سکیں گی اور اس طرح وہ زرعی کاروبار کے لئے اعتباری سہولتیں بہم نہ پہنچا سکیں گے۔

مناسب یہ ہے کہ امریکہ کی مانند کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار کا قانوناً تعین کر دیا جائے اور ریزرو بنک کو اختیار دیا جائے کہ ان حدود کے اندر امانتوں کا جو فیصلہ چاہے نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھوائے۔

(۳) بنکوں کے نظار کو یا ایسی کمپنیوں کو جن میں یہ نظار حصہ دار ہوں قرضے دینے کے متعلق مختلف بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ اس قسم کی بندشیں مناسب، موزوں اور ضروری ہیں۔

(۴) برطانوی ہند سے باہر یا سلطنت متحدہ میں رجسٹری شدہ بنکوں کے لئے ریزرو بنک سے اجازت نامہ لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ریزرو بنک اجازت نامہ دینے سے قبل ضروری معلومات حاصل کرے گا۔ یہ دفعہ بھی مناسب ہے۔ اس کی وجہ سے ملکی بنکوں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔

(۵) ریزرو بنک کو دوسرے بنکوں پر نگرانی وتنقیح کے وسیع اختیارات دئے گئے

ہیں ———— مگر ہمارے خیال میں یہ اختیارات ناکافی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریزرو بنک کو اس سے زیادہ اختیارات دئے جائیں تاکہ وہ ملک کے تمام بنکوں کو اپنے زیر اثر رکھ سکے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ریزرو بنک سے اجازت حاصل کئے بغیر نہ تو کسی بنک کا افتتاح عمل میں آئے اور نہ اس کی کوئی شاخ کھلنے پائے۔ اس طرح ریزرو بنک کو نگرانی کے پورے اختیارات حاصل ہو جاتے۔ مگر اس دفعہ کے تحت مرکزی حکومت نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور ریزرو بنک کے سپرد صرف تنقیح و جانچ کا کام کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے نظام بنک کاری کی موثر تنظیم نہیں ہو سکے گی۔ ضرورت ہے ریزرو بنک کو نگرانی وغیرہ کے سلسلے میں راست طور پر ذمے دار قرار دیا جائے۔

(۵) دیسی بنک کاروں کے الحاق کا مسئلہ :-

پندرہ سال قبل بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس مسئلے پر زور دیا تھا اور اپنی سفارشات پیش کی تھیں۔ لیکن اس وقت سے اب تک یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ہمارے نظام بنک کاری کو زیادہ کارگزار وسیع اور مؤثر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریزرو بنک دیسی بنک کاروں سے تعلق پیدا کرے اور ان کو اپنے زیر اثر لائے تاوقتیکہ ان بنک کاروں کو نظام بنک کاری کے سلسلے کی ایک مضبوط کڑی نہیں بنایا جائے گا۔ ہندوستانی بنکوں کا مستقبل درخشاں نہ ہو گا۔

محمد احمد خاں ایم۔اے عثمانیہ
ایل۔ایل۔بی (علیگ)

دلّی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

سادہ کاری کی سب سے خاص منزل اس کا مطلب یہ ہے کہ سادہ کاری کے تمام درجوں میں کھلائی اور جڑائی مرکزی کام ہے۔ اس لئے صرف اسی ایک حصے کا کاریگر سادہ کار ہے۔ لیکن حقیقی بات یہ ہے کہ کاریگر خواہ وہ زیور کے کسی حصّے کا ماہر خصوصی ہو، سادہ کار ہے۔ البتہ ایک درجے میں مثلاً میناکاری، چھلائی وغیرہ میں وہ امتیاز رکھتا ہے۔

راقم نے تیاری کے درجوں میں بہت سی نازک تفصیلات قصداً چھوڑ دی ہیں کیونکہ یہ سرسری بیان سادہ کاری کی صنعت کا ایک تصور دینے کے لئے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ سادہ کاری جیسی پیچیدہ اور اہم صنعت کے تفصیلی ذکر کے لئے ایک بڑی کتاب کی ضرورت ہے

سادہ کاری میں دوسروں سے مقابلہ سادہ کاری کی صنعت کے میدان میں لاہوری کاریگر ایک مدت اکیلے رہے اور کوئی اُن کے مقابلے میں نہیں آیا۔ سادہ کاری بجائے خود مشکل صنعت ہے، کتابی رہبری سے سیکھی نہیں جاسکتی۔ طویل عملی مشق اس کے لئے درکار ہوتی ہے۔ لاہوری برادری کے کاریگر کو اس کام کی مہارت نسلاً بعد نسل ورثہ میں ملتی ہے۔ فطرت اس کے ہاتھ میں وہ لچک اور آنکھ میں وہ نظر خود عطا کرتی ہے جو اس کام کے لئے ضروری ہے۔ اس پر بھی بہت بچپن سے وہ استاد کے پاس بٹھادیا جاتا ہے تب کہیں دس بارہ برس میں جاکر وہ کارآموزی کا نصاب پورا کرتا ہے۔ اس پر اضافہ کیجیے۔ مشرقی استادفن کی یہ روایتی وضع داری کہ وہ برادری کے شاگرد کو بھی کام

کے نکتے بتانے میں بخل کرتا ہے اس لئے دوسری برادری کے آدمی کو تو کبھی ہمت ہی نہیں پڑتی کہ وہ سادہ کاری سیکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن وقت نے جو سب سے بڑا مصلح ہے ایک ایسی دنیا سامنے کردی جس میں زندگی کا سارا نظام بدلا ہوا تھا۔ لاہوریوں سے دوسروں نے یہ صنعت کسی قدر سیکھی۔ لیکن وہ اتنے کم تھے کہ مقابلہ نہ کرسکے بلکہ لاہوریوں میں مل جل گئے۔

ملکی مقابلہ مرہٹہ کاری گر اور زیادہ تر بنگالی کاری گر نے البتہ مقابلہ کیا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے لاہوری برادری کے صناع کو بازار میں ترجیح دی گئی۔

غیر ملکی مقابلہ ملکی مقابلے سے نپٹے تو غیر ملکی مقابلہ پیش آیا جو زیادہ سخت تھا۔ زیکوسلواکیہ کی نقلی اور اصلی زیورات کی دستکاری نے جس کی بنیاد مشین اور سائنس کی ترقی نے مضبوط کی تھی، لاہوری برادری کے دستکار کو بہت پریشان کیا۔ نقلی زیورات (Imitation Jewellery) کی عام مقبولیت نے لاہوری برادری کے معمولی کاری گر کو بے کار کر دیا۔ امراء نے یورپ کی اصلی جوئلری کی سرپرستی کو اپنے شایانِ شان سمجھا۔ اس لئے لاہوریوں کا اوسط اور اعلیٰ دستکار کم وزن ہو گیا۔ مشینی طریقے کا استعمال تعلیم اور جرأت کی کمی سے لاہوری کر نہیں سکتے تھے۔ بہت معمولی مشینی استعمال بدرجہ مجبوری انھوں نے شروع کیا۔ ظاہر ہے پھر بھی وہ ولایتی مال کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن فنا ہونے سے بچ گئے۔

سادہ کاری میں بڑے پیمانے پر تیاری بڑے پیمانے پر تیاری (mass production) نقلی چاندی اور نقلی دھاتوں کے زیور میں ممکن ہے۔ لیکن لاہوری کاریگر جو صنعتی ضرورت سے تقسیم عمل کے قدرتی طور پر پابند ہو گئے ہیں۔ تجارتی ضرورت سے تقسیم کار کے اصول سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جہاں روپے اور تعلیم کی کمی ہے وہاں ان کو صحیح مشورہ دینے والا بھی کوئی نہیں۔ ورنہ برادری اتنا سرمایہ ضرور جمع کر سکتی ہے جو ایک ایسے صنعتی مرکز کے کھلنے کے لئے کافی ہے۔ جس سے لاہوریوں کا عام سادہ کار طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور بہت ترقی کر سکتا ہے۔ اب جنگ کی وجہ سے باہر کا مال بند ہوا اور دیسی مال کی مانگ بڑھی تو عام

سادہ کار طبقہ ذرا ہوشیار رہا، لیکن کوئی منظم کوشش نظر نہیں آتی عجیب افراتفری ہے ہر کاریگر دوسرے چند کاریگروں کو ملا کر کسی قدر تیزی کے ساتھ مال تیار کرتا ہے اور سمجھتا ہے بازار میں اس سے زیادہ مال کی کھپت نہیں۔ اور چاہتا ہے کہ جتنا نفع جلد سے جلد اُسے مل جائے غنیمت ہے۔

سونے کے زیورات بڑے پیمانے پر بننا مشکل ہیں

اصل جویلری یعنی سونے کا زیور، بڑے پیمانے پر بننا یہاں محال نظر آتا ہے۔ حالانکہ سونے کے زیور سازی کے اتنے ہی بڑے کارخانے انگلستان میں ہیں جتنے بڑے صابن یا تیل کے کارخانے ہیں اور جہاں زیور کی تیاری کا ہر درجہ مشین سے پورا ہوتا ہے۔ لڑائی کی وجہ سے سونے کا ولائتی مال بازار میں کم ہے۔ اس لئے اعلیٰ درجے کا لاہوری صناع اس وقت تیزی سے کام کر رہا ہے۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ لاہوری کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا سونے کا پرزہ ولایت کے سونے کے پرزے سے زیادہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا نئی دنیا میں قدروں کے سانچے بدل گئے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے کمال صنعت کی بقا کے لئے جہاں لاہوری استاد کے فن کا وجود ضروری ہے۔ لاہوریوں کی قومی بقا کے لئے صنعت کی تجارتی ترقی کی تدابیر بھی اتنی ہی ضروری ہیں۔ مستقبل کا مسئلہ لاہوریوں کے سوچنے کی چیز ہے۔ ایک دم سے عظیم الشان کارخانے قائم کرنا نہ ممکن ہے نہ مفید۔ لیکن مشین کی مناسب مدد سے انھیں اپنی عام سادہ کاری کی رفتار تیز کرنی ہوگی تاکہ جنگ کے بعد کے بازار میں اُن کا مال اتنا تو کھپ سکے جو اُن کے فرداً فرداً زندگی کی حفاظت کر سکے۔

لاہوری برادری میں پیشے کی تبدیلی

لاہوری برادری میں بعض لوگ اپنا پیشہ تبدیل بھی کر لیتے ہیں۔ ہنر کی مہارت بیٹے کو باپ سے ورثے میں ملتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں فطری طور پر ذوق یا اختلاف واقع ہوتا ہے۔ مثلاً سادہ کار کے ایک لڑکے کو اپنے باپ کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی وہ ایک لوہے کے کام کے کارخانے میں اکثر جا بیٹھتا، اور بڑے شوق سے کام میں شریک

ہو جاتا۔ باپ کے ڈانٹنے پر اس نے صاف کہہ دیا کہ میں سادہ کاری نہیں سیکھنا چاہتا۔ مجھے تو لوہے کا کام اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آخر اسے ایک اچھے مستری کے پاس کام سیکھنے کے لئے بٹھا دیا گیا۔ ایک لڑکے نے اپنے باپ کا لکڑی کی خراد کا کام پسند نہیں کیا اور سادہ کاری سیکھی

کہیں پیشے کی تبدیلی غلط وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایک بہت باکمال مصور کے لڑکوں نے دیکھا کہ باپ کی مذہبی حیثیت برادری میں مشتبہ ہے۔ یہاں تک کہ مسجد میں اس کا چندہ اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ وہ تصویر بنا کر کمایا گیا ہے۔ اس لئے بڑے لڑکے نے سادہ کاری سیکھی۔ اور چھوٹے نے لکڑی کی خراد کا کام سیکھا۔ دونوں اپنے کام کے معمولی کاریگر ثابت ہوئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مصوری میں باکمال ہوتے یا معمولی درجہ حاصل کرتے۔

واضح رہے کہ پیشوں کی یہ تبدیلی صرف برادری کے رائج حرفوں میں عمل میں آتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ پیشہ تبدیل کرنے میں کسی ایسے حرفے کا انتخاب کیا جائے جو برادری میں رائج نہ ہو۔ مثلاً یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کساد بازاری سے تنگ آکر کوئی لاہوری کاریگر کوئی عاجلانہ منفعت کا کاروبار کرے یا ادنیٰ حرفتی کام کرنے لگے۔ جیسے بٹن سازی قلعی گری وغیرہ

بالکل نئے پیشے زندگی کے انقلاب نے اب نئی نئی صنعتیں پیدا کیں۔ اس طرح کہ ہر صنعت ہزار دو ہزار صنعتیں اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ بے شک ان نئے کاموں میں سے چند کاموں پر لاہوریوں کی نظر انتخاب گئی۔ مگر انتخاب میں وہی فن کا نقطۂ نظر سامنے رہا۔ چنانچہ لوہے کا مشینی کام اور بجلی کا کام جو مہندس سی ذہانت چاہتا ہے اور گھڑی سازی کا کام جس میں سادہ کارانہ دماغ اور نظر درکار ہے، لاہوریوں کے کچھ افراد نے اختیار کیا، دوران میں بھی امتیازی درجہ حاصل کیا۔

علمی پیشے علمی پیشوں کی مثالیں بھی مل جائیں گی۔ یعنی لاہوری برادری میں ڈاکٹر، وکیل طبیب، مدرس وغیرہ بھی کچھ لوگ نکل آئیں گے۔ سرکاری دفتر کے ملازم بھی کچھ نہ کچھ ہیں صدر بازار کے تاجروں کی صف میں دو ایک ممتاز سوداگر لاہوری برادری کے بھی ملیں گے

قدیم علمی روایات کی جھلک بھی کہیں نظر آئے گی اور لاہوریوں میں ایک آدھا عالم دین، وکیل، مدرس اور شاعر بھی مل سکے گا لیکن آخر کار لاہوری برادری فی الجملہ ایک صناع برادری ہے، اور صنعت کا کمال اس کے امتیاز کے لئے پیش کرتا ہے۔

لاہوری برادری اور ساہوکار جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، لاہوری برادری صنعت کی صرف مزدوری لیتی ہے، اس کا تجارتی فائدہ ہندو ساہوکار اور جوہری اُٹھاتے ہیں ہندو دوکان دار کی بنیاد صرف لاہوری کاریگر ہے۔ کاریگر ہندو بیوپاری کی مٹھی میں رہتا ہے۔ مزدوری اسے کم ملتی ہے۔ خرچ کی زیادتی اور آمدنی کی کمی سے وہ قرض لینے پر مجبور ہے اور یہ دباؤ کبھی سوچنے بھی نہیں دیتا کہ اس کی مزدوری اس کی خوش حالی کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو سونا اور جواہر غریب سادہ کار کہاں سے لائے گا جس سے وہ مال تیار کرے اور آزادی سے کسی دوکان دار کو دے سکے۔ وہ عموماً ایک ہی سیٹھ کا پابند ہوتا ہے۔ بڑے درجے کے سادہ کار جو نسبتاً آسودہ حال ہوتے ہیں، اپنا سونا لگا کر مال تیار کرسکتے ہیں۔ لیکن ہندو سیٹھ کے پرانے تعلق اخلاقی دباؤ انھیں وضع داری کے ساتھ اُسی کا پابند رکھتا ہے۔ یہ بڑے سادہ کار کمالِ فن کے استغناء سے کبھی غور بھی نہیں کرتے کہ زیورات کی اُجرت کے علاوہ اس کا تجارتی منافع بھی کوئی چیز ہے۔

لاہوری اور زیورات کی تجارت کسی صاحب ثروت سادہ کار نے اس طرف توجہ بھی کی تو وہ ہندو بیوپاری کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے۔ جس کا قبضہ بازار پر سینکڑوں برس سے ہے۔ اور وہ تعداد میں بھی لاہوری تاجر زیورات سے ہزار گنا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تجارت اور صنعت الگ الگ ذہن اور استعداد چاہتی ہیں۔ لاہوری صناع سے تجارت کی توقع ظلم ہوگا۔ لیکن یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ لاہوری برادری کے صاحب ثروت لوگ جو سادہ کاری نہ کرتے ہوں، اپنے کام کی تجارت پر دھیان دیں۔ انھیں اپنی قوم کی حمایت مفت میں حاصل ہے۔ لاہوری کاریگر، لاہوری بیوپاری کو اپنا مال کیوں نہ دے گا۔ اگر اس کو وہی آسانیاں

ملیں، جو سندو سیٹھ سے ملتی ہیں؟ لاہوری برادری کے لوگ اپنے مشترکہ سرمایہ سے زیورات کی تجارت کا ایک مرکز بنا سکیں۔ اور زیادہ سے زیادہ لاہوری کاریگر اس مرکز سے متعلق ہو جائیں تو تجارتی منافع دوسروں کے پاس نہ جائے۔ کاریگر کی شرح اُجرت بھی بڑھ جائے اور قومی خوش حالی میں ترقی ہو۔ لاہوری قوم کو ایسی منظم تجارتی کوشش سے سندو بازار کی مخالفت کے جو اندیشے ہیں اُن سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن اگر اچھی طرح زندہ رہنا ہے تو اِن سب اندیشوں اور رکاوٹوں کو مسلسل جدوجہد سے دور کرنا ہی ہوگا۔ صنعت کے محض اجرتی منافع سے لاہوری قوم کبھی خوش حال قوم نہیں بن سکتی، حالانکہ اس عجیب بڑی صنعت کی مالک قوم کا قدرتی حق یہ ہے کہ وہ اچھی طرح زندگی گذارے

لاہوریوں کی توجہ زیورات کی تجارت کی طرف ہمیں خوشی ہے کہ لاہوری برادری کی طرف سے اس میدان میں کچھ قدم اُٹھائے گئے ہیں۔ سندوؤں کی بہت سی کروڑپتی فرموں کے بیچ میں دو ایک دوکانیں زیورات کی تجارت کی ایسی نظر آتی ہیں جن کے مالک لاہوری ہیں۔ کچھ کاریگروں نے انفرادی کوشش بھی شروع کر رکھی ہے۔ وہ مال بنا کر بیوپاری کو دیتے ہیں۔ مگر نجی طور پر براہِ راست گاہک تک بھی مال پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے گاہک کو کچھ بچت ہوتی ہے اور کاریگر کو وہ نفع بچ رہتا ہے جو درمیانی آدمی لے لیتا تھا۔ یہ تاجر سادہ کار (Manufacturing Jewelers) ایک فال کی علامت ہے۔ دیانت داری سے کوششیں جاری رہیں تو گاہک اور کاریگر کے بیچ میں وہ روایتی مشکل جس کا نام "بازار پر سندو قبضہ" ہے۔ رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔ سندو جوہری اگر ایک لاکھ روپیہ ماہوار کما سکے گا تو لاہوری تاجر زیور یا تاجرِ سادہ کار ایک ہزار تو کما سکے گا۔

ختم کلام

اب ہم لاہوری برادری پر ایک آخری نگاہ ڈالتے ہیں۔ جیسے ایک سیاح

شاہی عمارتوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر داپس ہورہا ہو۔ اور چلتے چلتے مڑکر ایک بار پھر اُن کھنڈرات کی طرف دیکھے

لاہوریوں کا سب سے اہم مسئلہ تعلیم

اِس آخری نگاہ کے ساتھ ہم لاہوری برادری کے متعلق ایک نہایت اہم بات کو کہتے ہیں وہ بات اس برادری کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ لاہوری برادری کی معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں ہم بعض لاہوری بزرگوں اور ذمے دار لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اکثر کو پایا کہ وہ اپنی برادری کی طرف سے مایوس ہیں، اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لاہوری برادری کی خرابیوں کا علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً چودھری حاجی حبیب احمد صاحب سادہ کار نے فرمایا ——— "لاہوری قوم پر آپ کوئی مضمون لکھنا چاہتے ہیں؟ تو بس لکھ دیجئے گا۔ یہ دہلی کی ایک قوم ہے جو صبح سے شام تک سونے چاندی سے کھیلتی ہے۔ لیکن سونے سے جاگنا نہیں چاہتی۔ یہ قوم رشک، حسد اور ایک دوسرے کی برائی میں مبتلا ہے اور اب شاید موت کی نیند سونا چاہتی ہے ———"

بے شک وہ برادری جو زبردست تاریخی روایات کی حامل ہو، اب پستی کی حالت میں ہے، یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ حاجی صاحب کی اس بات میں ضرور طنز پوشیدہ ہے لیکن سچ مچ لاہوری بہ حیثیت مجموعی زبوں حال ہیں۔ ان میں وہ سب آثار پائے جاتے ہیں جو ایک ناپذیر گروہ میں ہوتے ہیں۔ وہی جمود اور بے خبری، وہی بزرگوں کے کارناموں پر فخر اور خود کچھ نہ ہونا، وہی صرف ذاتی فائدے کی ہوس اور دوسرے کے نقصان سے بے پروائی۔ وہی عزیزوں سے بے گانگی کا سلوک، وہی ہزاروں گندریوں میں ایک کے ندھے پر... اور بہت سی جھونپڑیوں کے بیچ میں ایک اونچی شاندار کوٹھی۔ لیکن لاہوری قوم کی ہر خرابی کا سبب تعلیم سے بے گانگی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لاہوریوں کو تعلیم کا شوق نہیں یا وہ تعلیم کے فائدوں سے بے خبر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تعلیم کے بارے میں صحیح رہنمائی کے نہ ہونے سے وہ تعلیم سے خوف زدہ ہیں۔ وہ ہر قدم پر تعلیم کی ضرورت محسوس

کرتے ہیں۔ لیکن اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے نتائج غلط دیکھتے ہیں اس لئے وہ تعلیم سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔

لاہوریوں کی تعلیمی دقتیں

لڑکا میٹرک کرکے کام سیکھنے کی عمر کھو دیتا ہے سیکھنے کی گنجائش بھی ہو تو وہ کام کو حقیر جانتا ہے۔ وہ ملازمت کو پسند کرتا ہے لیکن ظاہر ہے یہ تعلیم کا نہیں، نظام تعلیم کا قصور ہے۔ لاہوریوں کی بڑی تعداد اس لئے بھی بچوں کو تعلیم سے محروم رکھتی ہے کہ اس سے دہرا مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایک تعلیم کا خرچ دوسرے اس آمدنی کا نقصان جو بچہ کام سیکھنے کے دوران میں ماں باپ کو لاکر دیتا ہے۔ خرچ کی یہ تکلیف غریب طبقے کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن بات تو ذمے دار جاننے والوں کے سوچنے کی ہے کہ وہ تعلیم کا کوئی ایسا ڈھنگ بتائیں جس میں اس صنعت پیشہ قوم کی ضرورتوں کی رعایت رکھی گئی ہو، جس سے لڑکا پڑھ لکھ بھی جائے اور قومی صنعت کو فروغ بھی حاصل ہو اور اس طریقے میں غریب بچوں کے لئے بھی کوئی تدبیر کی گئی ہو۔ یہ سب باتیں اُن کو سوچنے دیجئے جن کا یہ کام ہے۔ لیکن لاہوریوں کے ذمے یہ فرض رہ جاتا ہے کہ وہ برادری کو تعلیم کے لئے تیار کریں۔ جو نہ جانتے ہوں انھیں تعلیم کا فائدہ سمجھائیں۔ جواب تو سوال ہی پر ملے گا۔ لاہوریوں میں کچھ صاحب ہمت نوجوان اُٹھیں اور جاننے والوں سے تعلیم کی مشکل کا حل پوچھیں اور پھر اس حل کے مطابق کام کریں۔ یہ کام برادری کے کچھ ایثار پیشہ خادم بھی مانگتا ہے۔ کٹھن کام ہے۔ زندگیاں اس میں ختم ہو جاتی ہیں تب خدمت کہیں پھل لاتی ہے چند زندگیوں کی قربانی ہزاروں زندگیوں پر بہار لے آئے گی قوم پڑھ لکھ جائے تو دوسری سب کمزوریاں اپنے آپ دور ہو جائیں۔ قوم جب تک پڑھی لکھی نہ ہو ساری اصلاحی کوششیں اور ترقی کی تجویزوں کا وعظ بیکار رہے زمین جب تک جھاڑیوں اور پتھروں سے صاف کرکے پانی سے نرم نہ کرلی جائے اس میں بیج بونا بیج کو ضائع کرنا ہے۔

لاہوری قوم کی اصلاحی کوششیں کیوں بے کار گئیں لاہوری قوم کو جگانے اور ترقی پر مائل کرنے کی اس سے پہلے کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہو چکی ہیں۔ لیکن وہ سب بے کار گئیں اور یاد رہے جب تک قوم پڑھ لکھ نہ جائے وہ کوئی بات سن سکتی ہے نہ سمجھ سکتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم حوالے کے لئے اس جگہ ترقی و اصلاح کی گذشتہ کوششوں کا ذکر کر دیں۔

اصلاحی کوششوں کا ریکارڈ

۱۹۱۳ء۔ انجمن قوم لاہوریان قائم ہوئی۔ انجمن کے صدر نیاز الدین صاحب تھے۔ قواعدِ انجمن حافظ عبد الستار صاحب نے چھاپ کر شائع کئے۔ اس میں اغراض و مقاصد "ترقی ہر قسم" بیان کئے گئے ہیں۔ اور ترقی کے لئے "تدبیر صرف" جلسے اور تقریر اور مضامین" قرار پائے

۱۹۲۱ء۔ نثار احمد صاحب نے دعوتِ قوم کے نام سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں قوم سے دردناک اپیل کی کہ تم لوگ خواب غفلت میں ہو۔ اور قومی ترقی کے لئے ایک ماہوار رسالہ شائع کرنے کی تجویز پر قوم لاہوریاں سے رائے مانگی۔ شاید قوم نے تائید نہیں کی، کیونکہ رسالہ نہیں نکلا۔ نثار احمد صاحب اب بمبئی میں حکیم اکرامی کے لقب سے طبیب ہیں۔ اور پر جوش کانگرسی کارکن ہیں۔ افسوس ہے وہ اپنی برادری کی تنگ نلائے کو خدمت کے لئے ناکافی سمجھ کر کانگریس کے وسیع تر سمندر میں نکل گئے۔

۱۹۲۶ء۔ انجمن خدام قوم لاہوریاں قائم ہوئی۔ اسے ۱۹۱۳ء کی انجمن قوم لاہوریاں کا نیا چولا سمجھئے۔ اس کے سکریٹری رضی الدین احمد صاحب خلف نیاز الدین صاحب تھے انھوں نے بھی اس نئی انجمن کے قواعد و ضوابط چھاپ کر شائع کر دئے جو ۱۹۱۳ء والی انجمن کے نسخہ سے مشابہ تھے۔

۱۹۲۷ء۔ قوم لاہوریاں کا پہلا عام جلسہ ثناء اللہ خاں صاحب کے کارخانے واقع پہاڑ گنج میں ہوا۔ اس کا ایجنڈا ہمارے سامنے ہے جس میں ساری کارروائی شادی بیاہ اور غمی کی خرچیلی رسموں کو رد کرنے کی تجویزوں پر مشتمل ہے۔

۱۹۳۲ء۔ ۱۹۲۶ء میں جو انجمن نئے سرے سے قائم ہوئی تھی اس کے سکریٹری رضی الدین احمد صاحب نے ایک سہ ماہی رسالہ خادمِ قوم نکالا سے دے کر تحریر و تقریری ایک ایک تدبیر انجمن نے اصلاح و ترقی قوم کے لئے سوچی تھی۔ اس تدبیر کو بروئے کار لانے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا جس کے صرف ۳ نمبر ہماری معلومات کے مطابق نکل سکے نومبر ۳۲ء کی اشاعت میں کچھ کارآمد مضامین ملتے ہیں۔ اس کے ایک [illegible] میں لاہوریوں کے صنعتی زوال کا سبب تعلیماتِ قرآنی کے چھوڑ دینے کو ٹھیرایا گیا ہے۔ ایک مضمون میں یہ دلچسپ بحث ہے کہ سادہ کار بے پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے کس طرح ہندو بیوپاری سے دھوکا کھاتا ہے۔

ایک مضمون میں تعلیمی مشورہ یوں دیا گیا ہے کہ لڑکا پہلے میٹرک پاس کرے۔ پھر سادہ کاری سیکھے۔ انجمن کی سالانہ رپورٹ کا خلاصہ سکریٹری کی طرف سے اسی نمبر میں شائع ہوا ہے جس کا ایک قابل حوالہ نوٹ یہ ہے کہ ایک تجویز منظور کی گئی کہ قوم لاہوریاں کی تاریخ مرتب کی جائے اور منتظمہ کمیٹی اس تاریخ کے لئے مواد فراہم کرے۔

۱۹۳۳ء۔ پہاڑ گنج کے چند حوصلہ مند روشن خیال نوجوانوں نے ایک ہنگامی جلسہ کرکے قومی اصلاح و ترقی کی تعمیری تجاویز مرتب کرنی چاہئیں
افسوس ہے بعض وجوہ سے یہ تجاویز بن ہی نہ سکیں۔

مندرجہ بالا سب کارروائیاں لاہوریوں کی اضطراری حرکات ہیں اور کسی اندرونی خلش کا پتہ دیتی ہیں۔ دلوں میں کام کی اُمنگ اور ترقی کی تڑپ ضرور موجود ہے لیکن بیماری

کی تشخیص میں اب تک چوک ہوتی رہی، اس لئے تجویزیں بھی وعظ اور ادبی تقریروں پر مشتمل رہیں ——— ہم پھر دہراتے ہیں :۔

بیماری کا سبب صحیح تعلیم کا نہ ہونا ہے ۔ اس کا انتظام کیجیے اور یقین کیجیے کہ لاہوری برادری اپنی پچھلی اونچی سطح پر پہنچ جائے گی ۔

تعلیم کے سردست دو طرح کے انتظام ہوں گے ایک بڑی عمر کے بے پڑھے یا کم پڑھے لکھوں کے لئے انتظام ۔ دوسرے برادری کے بچوں کے لئے خاص قسم کے اسکول ۔ یہ اسکول تعلیم کا کام کرنے والے ماہروں کے بتائے ہوئے طریقوں اور نصاب کے مطابق ہوں گے ۔

ہم لاہوریوں کی تعلیم کے انتظام کے لئے، کہ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے پر امید نگاہوں سے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ یقین ہے کہ لاہوری نوجوان اب اپنی قوم کے لئے اٹھیں گے ——— خدا کرے عزم اور استقلال ان نوجوانوں کا رہبر ہو ۔

(باقی)

رجز

رن کو شمشان بنا دوں میں بہ فیضِ شمشیر
زد میں آئے تو نہ چھوٹے کبھی میرا نخچیر
کس کی طاقت کہ مرے پاؤں میں ڈالے زنجیر
میرے ہر فعل سے خود بنتی ہے میری تقدیر

میں بہادر ہوں، رضامند ہی یزداں مجھ سے!

میری فطرت کو نہیں راس غلامی کی ہوا
نام آزادی پہ ہوں روزِ ازل ہی سے فدا
سطوتِ ملکِ سلیماں سے ڈرے میری بلا
مور بے مایہ سہی ہمتیں میری ہیں سوا

میں بہادر ہوں، در زنداں ہی لرزاں مجھ سے!

میرے اشعار، مرا زخمہ، مرا ساز جواں
آتشِ قلب سے دہکی ہوئی آواز جواں
میرے رہوار جواں سال کے انداز جواں
میری تلوار، مری مونس و دمساز جواں

میں بہادر ہوں، جوانی ہے پرافشاں مجھ سے

میں وطن دوست ہوں لیکن نہیں انساں دشمن
میرا دل شیشۂ نازک، میں سراپا آہن
امن عالم کا میں پیغامبرِ ظلم شکن
عدل و انصاف کا باقی ہے مرے دم سے چلن

میں بہادر ہوں، یہ دنیا ہی گلستاں مجھ سے

میرے مذہب میں ہے عصمت کی حفاظت داخل
میرے مسلک میں ہے طفلی سے محبت داخل
میرے مشرب میں ہے پیری کی حفاظت داخل
ہے مرے کیش میں انسانی اخوت داخل

میں بہادر ہوں، عزازیل ہی نالاں مجھ سے

زیست کو رزم میں ہر بار سجایا میں نے
موت کو رزم میں ہر بار ہرایا میں نے
زیست کے شوق کو ہر دل میں بٹھایا میں نے
موت کے خوف کو ہر دل سے مٹایا میں نے

میں بہادر ہوں، اجل خود ہی گریزاں مجھ سے

سلیمان اریب

حالاتِ حاضرہ

شروع مئی میں یورپ کی جنگ ختم ہوئی اور اب آخر میں متحدہ قوموں کی کانفرنس نے اپنا کام سرانجام کیا۔ یہ کارپردازی بہت قابلِ تعریف ہے، خاص طور پر ان قوموں کے لئے جن کے متعلق جنگ سے پہلے تک مشہور تھا کہ وہ کسی معاملے کو طے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ کانفرنس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ روس نے مختلف فیہ مسائل سے بحث بہت کم کی۔ اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس نے ان قوموں کی سرداری تسلیم کرلی جن کی قوت اور مستعدی کی بدولت اٹلی اور جرمنی کو شکست دی جاسکی یا جنھوں نے جنگ میں بہت نقصان اُٹھایا تھا۔ چین کو سرداری کا مرتبہ اس استقلال کے حصہ میں ملا ہے جس سے اس نے جاپان کا مقابلہ کیا۔ فرانس کو یہ مرتبہ اصولاً تو نہیں ملنا چاہیے تھا، لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ اس کی عزت افزائی کی جائے۔ متحدہ قوموں نے اس بات کو بغیر بحث کے مان لیا کہ متحدہ ریاستیں برطانیہ، روس، فرانس اور چین سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ غور اس بات پر کیا گیا کہ ان کے ساتھ کتنی اور ریاستوں کو شریک کیا جائے اور انھیں کتنا اختیار دیا جائے۔ پولینڈ کے مسئلے پر زیادہ اختلاف ہونے لگا تو کانفرنس نے اصرار نہیں کیا کہ اسی کا فیصلہ صحیح مانا جائے، بلکہ جھگڑا چکانے کا کام متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور روس کے سُپرد کردیا۔ کانفرنس پولینڈ یا اس قسم کے اور معاملات میں اُلجھ جاتی تو اس کا اصل کام رہ جاتا، اور اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قومیں ایک بنیادی حق سے دست بردار ہوگئیں مگر اس دست برداری کی پشت پر بڑی مصلحتیں تھیں جن کی اہمیت اب ظاہر ہو رہی ہے۔

سین فرینسسکو میں نئے بین اقوامی نظام کا دستور مرتب ہوگیا ہے۔ یہ نظام ایک حفاظتی کاؤنسل، ایک معاشی و معاشری کمیٹی، ایک مجلس تولیت۔ ایک بین اقوامی عدالت

اور ایک دفتر پر مشتمل ہوگا۔ مجلس عامہ میں متحدہ قوموں میں سے ہر ایک کو ایک نشست حاصل ہوگی۔ لیکن چونکہ مجلس کا مقصد قوموں کے اتحادِ عمل کو فروغ دینا ہوگا، اس لئے ہر قوم مجلس میں پانچ نمائندے تک بھیج سکے گی۔ اس طرح مجلس کی بحثوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈھائی سو تک ہوسکتی ہے۔ مجلس کا طریق کار ویسا ہی ہوگا جیسا کہ قانون ساز جماعتوں کا ہوتا ہے۔ اس کا مقررہ مدت تک سالانہ اجلاس ہوگا اور وہ تمام مسائل پر بحث کرسکے گی۔ اور رائے دے سکے گی سوائے اُن معاملات کے جن پر کہ حفاظتی کاؤنسل، ان حقوق اور اختیارات کے مطابق جو اُسے دستور میں عطا کئے گئے ہیں غور کر رہی ہو۔ بین اقوامی اتحادِ عمل کا ذریعہ اور نمونہ یہی مجلس ہوگی، اور سوائے اِن جھگڑوں کے جس کا نتیجہ جنگ ہوسکتی ہے اور ان معاملات کے کہ جن میں حفاظتی کاؤنسل کے مستقل اراکین میں سے کسی ایک کی بڑی غرض یا مصلحت مانع ہو، وہ ہر مسئلے پر بحث کرسکے گی اور رائے دے سکے گی۔ حفاظتی کاؤنسل کے اصل منصب میں اقوامی امن قائم رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو تو وہ اس کا تدارک کرے گی۔ جھگڑے چکائے گی اور جنگ چھڑنے کا اندیشہ ہو تو ہر قوم سے مقررہ امداد طلب کرے گی۔ اس کی حیثیت ایک کابینہ کی سی نہ ہوگی جو قانون ساز مجلس کی رہنمائی کرتی ہے، تجاویز پیش کرتی ہے اور مجلس سے انھیں منظور کراتی ہے۔ اس قیام میں بیشتر یہی مدنظر ہے کہ اس کے مستقل اراکین، جو اپنی قوت کے مناسب حقوق رکھتے ہیں، اپنے حقوق کو محفوظ رکھ سکیں، قوت کا موجودہ توازن نہ بدلنے پائے اور سیاست میں کوئی ایسا انقلاب نہ ہونے پائے جو دنیا کو پھر جنگ میں مبتلا کردے۔ حفاظتی کاؤنسل کے مستقل اراکین بے غرض ہونے کا دعوےٰ نہیں کرتے، ان کی امن پسندی کے ساتھ جو شرطیں لگی ہوئی ہیں ان کا اندازہ اس رویے سے کیا جا سکتا ہے جو حال میں فرانس نے شام اور لبنان میں اختیار کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فرانس کے سوا باقی سب مطمئن ہیں، یعنی ان کا فائدہ اس میں ہے کہ امن قائم رہے اور انھیں بے فکری ہو

اپنے تعمیری کاموں میں لگ جانے کا موقع ملے۔ فرانس کی بے اطمینانی کا سبب یہ ہے کہ اُسے اپنے دوستوں سے اندیشہ ہو کہ وہ اصولی بحث اور اخلاقی تلقین کرتے کرتے اس کا حق مارلیں گے اور ان مقبوضات کو آزاد کرادیں گے جنھیں قابو میں رکھنے کی طاقت فرانس اب تک پیدا نہیں کرسکا ہے۔ مگر فرانس کو بھی بہت جلد اطمینان ہوجائے گا اور تب یہ کہا جاسکے گا کہ حفاظتی کاونسل کا کوئی رُکن ایسا نہیں ہے جو طاقت کا بے جا استعمال کرے۔ بہر حال نئے بین اقوامی دستور کے مطابق حفاظتی کاونسل ان اغراض کی نمائندگی کرے گی جو اس وقت دنیا پر حاوی ہیں اور ہمیں یہ یقین کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ ان اغراض کا پورا ہونا حفاظتی کاونسل کے مستقل اراکین کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے مفید ہوگا۔ اس دعوت کو سین فرین سسکو کانفرنس میں رد کرنے کی کچھ تحریک ہوئی، مگر پھر یہی مناسب سمجھا گیا کہ اسے قبول کیا جائے جب تک کہ اُسے رد کرنے کے لئے کافی دلیلیں مہیا نہ ہوجائیں۔

مجلس تولیت کے متعلق بحث شروع ہوئی تو اس کی کچھ امید تھی کہ سین فرین سسکو کانفرنس قومی آزادی کے اصول کی حمایت کرے گی، اور اس کا مطالبہ کرے گی کہ دنیا کی ہر قوم آزاد کردی جائے۔ برطانیہ نے پہلے ہی اس کا اعلان کردیا تھا کہ کانفرنس کو اس کی نوآبادیوں اور مقبوضات کے متعلق بحث کرنے کا اختیار نہ ہوگا اور ہندوستان کی طرف سے تین نمائندے یہ کہنے کے لئے پہنچ گئے کہ ہم جتنی آزادی چاہتے ہیں وہ ہمیں حاصل ہے تو کانفرنس ہندوستان کے سرکاری نمائندوں کے بجائے مسز پنڈت کو جلسوں میں کیسے شریک کرسکتی تھی۔ ہندوستان کا معاملہ اس طرح طے ہوگیا تو برما، ملایا، جزائر مشرقی ہند وغیرہ کا سوال کون اُٹھاتا۔ اس کے علاوہ متحدہ ریاستوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ انھیں بحرالکاہل کے ان تمام جزیروں کا متولی اور حق دار حاکم تسلیم کیا جائے جن پر قبضہ رکھنا دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تولیت کے بارے

میں ریزولیوشن منظور ہوئے اور مجلس تولیت قائم ہوئی جو ایسے علاقوں کی نگرانی کرے گی جن پر متحدہ ریاستوں یا متحدہ قوموں میں سے کسی اور کو قبضہ کرنے کا حق دیا گیا ہے یا دیا جائے گا۔ بظاہر تو وہ ریاستیں جو متولی مقرر ہوئی ہیں اس کی پابند ہیں کہ ماتحت آبادی کی خوش حالی اور ترقی کا ہر طرح سے انتظام کریں اور اس کی کوشش کریں کہ وہ جلد آزاد اور خود مختار بننے کے قابل بن جائیں۔ لیکن مجلس تولیت شاید کبھی بھی یہ طے نہ کرسکے گی کہ کس متولی نے اپنے فرائض جیسا کہ چاہیے انجام دیے ہیں اور کس نے ایسا نہیں کیا۔

بین اقوامی نظام کے باقی تین ادارے، معاشی و معاشرتی مسائل کی کمیٹی، بین اقوامی عدالت اور بین اقوامی دفتر، تینوں بہت مفید ثابت ہوں گے، اور غالباً ان کی کارگزاری سب سے زیادہ اہم ہوگی۔ بین اقوامی لیگ نے جو تہذیبی خدمات انجام دیں وہ اس کی کارگزاری کا سب سے روشن پہلو تھیں، اور اس مرتبہ بھی بین اقوامی اتحاد کے کارناموں کا میدان دنیا کی معاشرت اور تہذیب ہوگی۔

نئے بین الاقوامی دستور میں سیاسی مصلحتوں کا جو لحاظ کیا گیا ہے اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اسی کی ایک شکل یہ ہے کہ ایسی ریاستیں جو ایک براعظم میں ہیں یا جن کی معاشی اور سیاسی زندگی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اپنے خطے کی الگ تنظیم مشترک طور پر کر سکتی ہیں۔ البتہ یہ تنظیم بین اقوامی نظام کے ماتحت اور بین اقوامی دستور کے اصولوں کے مطابق ہوگی۔ ایسی تنظیم کے حق کا مطالبہ جنوبی امریکہ کی ریاستوں نے کیا، اور وہی اپنے مطالبے کو حق بجانب ثابت کرسکتی تھیں۔ لیکن اب ایسی تنظیم کا حق عام ہو گیا ہے، اور کوئی تعجب نہ ہوگا اگر برطانیہ اس کی بنا پر اپنی اور نوآبادیوں اور ہندوستان کی تنظیم الگ کرنا چاہے اور روس سلاف ملکوں کی تنظیم الگ، اور اس تنظیم کی پشت پر اتحاد عمل کے فائدے ہی نہ ہوں بلکہ طاقت وروں کی مصلحت۔

جون کے واقعات میں سب سے اہم یہی بات ہے کہ بین اقوامی نظام کا دستور بن گیا

دلچسپی اور مسائل سے بھی ہو سکتی ہے۔ امریکیوں نے جزیرہ اوکنیاوا فتح کر لیا ہے، اگرچہ اس میں اُن کے بہت سے سپاہی اور شاید جہاز بھی ضائع ہوئے۔ اب جنرل میک آرتھر خاص جاپان کے جزیروں میں کہیں پر فوج اُتارنے کی تدبیریں کر رہے ہوں گے۔ انگریزوں کا تقریباً پورے برہما پر قبضہ ہو گیا ہے اور کسی دن بھی یہ خبر آ سکتی ہے کہ اُنھوں نے سنگاپور پر حملہ کر دیا ہے۔ شام اور لبنان کے معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے فرانسیسی ایک طرف انگریزوں پر الزام لگاتے ہیں کہ اُنھوں نے شام اور لبنان کی آبادی کو بغاوت پر آمادہ کیا، دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ ہم برطانیہ کے ساتھ اتحادِ عمل کرنا چاہتے ہیں اور کریں گے۔ برطانوی سیاست نے شام میں بازی جیتی اور بڑی نیک نامی کے ساتھ جیتی ہے۔ فرانسیسیوں کی یہ کوشش بھی کہ شام اور لبنان کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں فساد ہو جائے بے سود نہیں۔ لیکن کوئی مثل سنتے ہوئے برطانیہ کے اخبار "اکونومسٹ" نے لکھا تھا کہ برطانیہ کو زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو شیشے کے گھر میں رہتے ہوں، پتھر پھینکنے کی عادت نہ ڈالنا چاہیے۔

"مولانا شبلی کا مرتبہ اُردو ادب میں"

مولانا شبلی کے بارے میں اس سے پہلے بھی چند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں مولانا کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا ہے در اصل مولانا جامع حیثیات تھے اور ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔

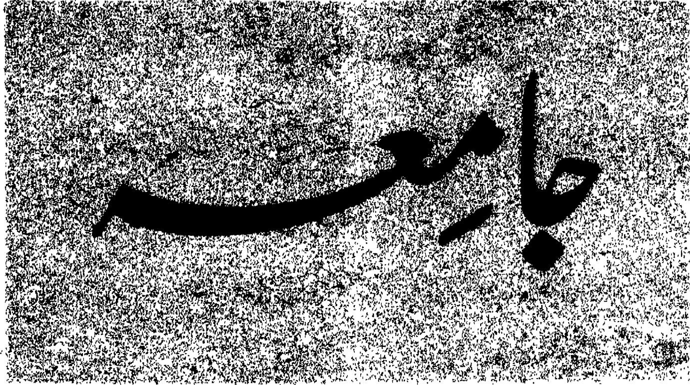
یہ کتاب مولانا شبلی کی اردو خدمات کی محض ایک تاریخ نہیں ہے مولف نے فن تنقید و تبصرہ کے موجودہ رجحانات کو سامنے رکھ کر مولانا کے نظم و نثر پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ مصنف کے قلم میں سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ پختگی اور جان ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر آل احمد صاحب سرور کے دیباچوں نے کتاب کی قدر و قیمت اور اہمیت کو اور نمایاں کر دیا ہے۔

کتاب مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳ روپے فی جلد

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ، دہلی قرول باغ

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲



مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرِ ادارت :۔ پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۴۰ - نمبر ۱۱	بابتہ ماہ اگست سنہ ۴۵ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع پریس۔ دہلی

جنگ اور ہندوستان کی مالیاتِ عامہ

ایک زمانہ تھا جب معاشی اور معاشرتی معاملات میں حکومت کی کم ترین مداخلت کو بہترین پالیسی سمجھا جاتا تھا، لیکن اب اس کے خلاف ملک و قوم کی مجموعی ترقی، آئندہ نسلوں کی بہبودی اور معاشرتی انصاف کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت کی زیادہ سے زیادہ مداخلت کو پسندیدہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس لئے اب یہ سوال اہم ہوتا جارہا ہے کہ ان کثیر ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جن کی روز بروز حکومت سے زیادہ توقع کی جارہی ہے روپیہ کہاں سے حاصل کیا جائے۔

لوگ حکومت سے جبریہ تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں اور تعلیم کے کم ترین معیار کو روز بروز بڑھاتے جارہے ہیں۔ لوگ حکومت سے حفظانِ صحت، علاج و معالجہ، نگہداشت اطفال خدماتِ زچگی کے بہترین حالات فراہم کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ بے روزگاری کے بیمہ اور دیگر بیشمار خدمات کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ان سب کو حکومت کیسے فراہم کرے۔ ان کے لئے سامان اور آدمی کیسے اکٹھا کرے۔ ان سب کاموں کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ حکومتوں کا ذریعہ آمدنی ان کی رعایا ہوتی ہے۔ لیکن اسے محصول کی ادائی شاق گذرتی ہے۔ غرض ایک طرف خدمات کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ اور دوسری طرف محاصل ادا کرنے کی کم سے کم آمادگی ---- یہ متضاد کشمکش ہے جس میں حکومتوں کو مبتلا رہنا پڑتا ہے۔

لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہی حکومتیں جو امن کے زمانے میں تھوڑی سی مزید ذمہ داری کو قبول کرتے سے ہچکچاتی تھیں جنگ کے زمانے میں بڑے بڑے مدافعتی پروگرام کا آغاز کردیتی ہیں اور ان کی وہی رعایا جو امن کے زمانے میں محصول کے تھوڑے سے اضافہ پر چیخ اٹھتی تھی، جنگ کے زمانے میں محصول کے بڑے سے بڑے بوجھ کو کسی نہ کسی طرح جھیل لے جاتی ہے۔

کیا اس سے امن کے زمانے کے تعمیر و ترقی کے کام شروع کرنے کے لئے حکومتوں کی کوئی حوصلہ افزائی اور رہنمائی نہیں ہوتی ؟ کیا حکومتیں ان محاصل اور فرضوں کو جنھیں وہ جنگ کے کثیر اخراجات کو پورا کرنے کے لئے عاید کرتی ہیں۔ امن کے زمانے میں بھی جاری رکھ سکتی ہیں ؟ ذیل کے مضمون میں ہندوستان کی مالیات جنگ کا تجزیہ کرنے کے بعد اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

جنگ کے زمانے میں حکومت ہند کو اپنے مصارف بہت زیادہ بڑھا دینا پڑے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے کیا جا سکے گا۔

جنگ سے قبل کے مصارف :-

۳۹-۱۹۳۸ء	..	۸۵ کروڑ پندرہ لاکھ روپیہ

جنگ کے زمانے میں :-

۴۰-۱۹۳۹ء	.	۹۴ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے
۴۱-۱۹۴۰ء	.	ایک ارب ۱۴ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے
۴۲-۱۹۴۱ء	..	ایک ارب ۵۷ کروڑ [illegible] لاکھ روپے
۴۳-۱۹۴۲ء	..	دو ارب ۹۰ کروڑ ۵ لاکھ روپے
۴۴-۱۹۴۳ء	..	۴ ارب ۳۹ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے
۴۵-۱۹۴۴ء	..	۵ ارب ۱۲ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے
میزان	..	۱۵ ارب [illegible] کروڑ ۶۰ لاکھ روپے

جنگ سے قبل کے سال میں حکومت کے جو مصارف تھے، ان کو اوسط قرار دے کر جب جنگ کے سالوں کے مصارف کی میزان لگائی جائے گی تو یہ میزان ۵ ارب ۱۱ کروڑ ہوگی۔ لیکن چونکہ حقیقی میزان پندرہ ارب ۹۸ کروڑ روپیہ ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کی وجہ سے ... کے مصارف تین گنا بڑھ گئے یعنی دس ارب ۸۸ کروڑ روپیہ کا زائد خرچ جنگ کی

وجہ سے ہندوستان کو کرنا پڑا۔

اس زائد خرچ کا سب سے بڑا حصہ مدافعت پر صرف کیا گیا۔ چنانچہ مدافعت کا خرچ جو ۱۹۳۸-۳۹ء میں ۴۶ کروڑ ۱۸ لاکھ تھا ۱۹۴۴-۴۵ء میں تین ارب ۷۰ کروڑ ۲۳ لاکھ ہو گیا تھا یعنی آٹھ گنا بڑھ گیا تھا۔ خرچ کی سال بہ سال تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

جنگ سے قبل:۔

۱۹۳۸-۳۹ء .. .. ۴۶ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے

جنگ کے زمانے میں:۔

۱۹۳۹-۴۰ء .. .. ۴۹ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے

۱۹۴۰-۴۱ء .. .. ۷۳ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے

۱۹۴۱-۴۲ء .. .. ایک ارب ۳ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے

۱۹۴۲-۴۳ء .. .. دو ارب ۱۴ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے

۱۹۴۳-۴۴ء .. .. تین ارب ۸۵ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے

۱۹۴۴-۴۵ء .. .. تین ارب ۷۰ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے

میزان .. .. گیارہ ارب ۹۷ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے

جو اس حساب سے یورپ کی جنگ کے زمانے کا مجموعی خرچ گیارہ ارب ۹۷ کروڑ ہوتا ہے۔ اگر جنگ سے قبل کی بنیاد پر ان سالوں کے خرچ کا تخمینہ کیا جائے تو اس کی میزان صرف دو ارب ۷۷ کروڑ ہو گی۔

مدافعت کے خرچ کا انتہائی نقطہ عروج ۱۹۴۴-۴۵ء کو سمجھنا چاہئے کیونکہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے لئے جو تخمینہ تیار کیا گیا ہے اس میں مدافعت کے مصارف صرف تین ارب ۹۴ کروڑ رکھے گئے ہیں گویا سال ماقبل سے یہ بقدر تین کروڑ کے کم ہیں۔

لیکن ہندوستان کے بہی کھاتوں میں مدافعت کے جو مصارف درج ہیں وہ یہیں ختم نہیں

ہوجاتے بلکہ اس سے بہت زیادہ ہیں۔ اس زیادتی کا سبب یہ ہے کہ حکومتِ ہند نے مدافعت کے سلسلے میں بہت سے مزید مصارف ایسے کئے ہیں جنھیں بعد میں برطانیہ کی حکومت سے یا دیگر اتحادی حکومتوں سے وصول کیا جائے گا۔ چنانچہ ان مصارف کو ہندوستان کے میزانیہ میں نہیں دکھایا جاتا۔

برطانیہ کی حکومت سے جو رقم واجب الوصول ہے اس کا تعین اس معاہدہ پر ہے جس کا عنوان ۱۹۳۹ء کے "مالیاتی سمجھوتے" کی بنیاد پر برطانیہ کی حکومت سے مطالبہ کر سکتی ہے۔ مالیاتی سمجھوتہ کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ اس کی رو سے حکومت ہند نے مدافعت کے صرف ان مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے جو ہندوستان کی مدافعت کے لئے براہِ راست ضروری ہیں۔ لیکن جہاں ہندوستان کی فوج کو ہندوستان سے باہر شہنشاہی مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہاں جتنے مزید مصارف ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری برطانیہ کی حکومت کو اٹھانا پڑے گی۔

آئیے اب اس سمجھوتے کی بنیاد پر ہندوستان کی مدافعت کے خرچ کا تجزیہ کریں۔ اس کی تفصیلات ذیل کے جدول میں درج کی گئی ہیں۔

سال	مدافعت کا مجموعی خرچ	حکومت ہند کا حصّہ	حکومت برطانیہ کا حصّہ
۴۰-۱۹۳۹ء	۵۴ کروڑ روپے	۵۰ کروڑ روپے	۴ کروڑ روپے
۴۱-۱۹۴۰ء	ایک ارب ۲۷ کروڑ روپے	۷۴ کروڑ روپے	۵۳ کروڑ روپے
۴۲-۱۹۴۱ء	دو ” ۹۸ ” ”	ایک ارب ۴ کروڑ روپے	ایک ارب ۹۴ کروڑ روپے
۴۳-۱۹۴۲ء	۵ ” ۷۳ ” ”	۲ ” ۱۵ ” ” + ۵۸ ” ”[1]	۳ ” ۶ ” ”

[1] ۴۳-۱۹۴۲ء سے مصارف کے اعداد پیش کرنے میں یہ جدت کی گئی تھی کہ مصارف کو مدّات جاری اور

سال	مدافعت کا مجموعی خرچ	حکومت ہند کا حصہ	حکومت برطانیہ کا حصہ
سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء	۷ ارب ۷۳ کروڑ روپے	۳ ارب ۵۰ کروڑ روپے + ۳۰ ″ ″	۳ ارب ۷۸ کروڑ روپے
سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء	۸ ″ ۵۱ ″ ″	۳ ″ ۹۰ ″ ″ + ۶۰ ″ ″	۴ ″ ۳۹ ″ ″
میزان	۲۷ ارب ۲۲ کروڑ روپے	۱۱ ارب ۹۸ کروڑ روپے + ۱ ارب ۵۰ ″ ″ = ۱۳ ″ ۴۸ ″ ″	۱۳ ارب ۷۴ کروڑ روپے

اوپر کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں یورپ کی جنگ کے زمانے میں ۲۷ ارب ۲۲ کروڑ روپے مدافعت پر خرچ کئے گئے۔ جس میں سے ہندوستان کا گیارہ ارب ۹۸ کروڑ روپیہ تو اس طرح پر خرچ ہوا کہ اس سے آئندہ کسی معاوضہ کے ملنے کی کوئی اُمید نہیں ہے ایک ارب ۵۰ کروڑ روپے کی مالیت کا اثاثہ اس کے پاس ٹھوس صورت میں موجود ہے۔ اور تیرہ ارب ۷۴ کروڑ روپیہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے خرچ کیا گیا۔ اس کا اگرچہ ہندوستان کے میزانیہ میں اندراج نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے بوجھ کے بہت بڑے حصّے کو ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ بوجھ ہندوستان کو کس طرح اُٹھانا پڑا، اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے کیا جائے گا۔ فی الحال ہم اپنی توجہ صرف میزانیہ میں درج کئے ہوئے

(بقیہ صفحہ ۵) مدات سرمایہ میں تقسیم کیا جانے لگا تھا، اور میزانیہ میں صرف مدات جاری کے مصارف کو دکھلایا جاتا تھا چنانچہ جمع کی علامت کے بعد جو اعداد درج کئے گئے ہیں، وہ مدات سرمایہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

مصارف تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

یورپ کی جنگ کے ۵ پہلے سالوں میں حکومت ہند کے میزانیوں کے مصارف کی مجموعی رقم جیسا کہ اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ پندرہ ارب ۶۰ کروڑ روپے ہوئی، اب سوال یہ ہے کہ حکومت ہند نے ان کثیر مصارف کو پورا کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیے۔

حکومت ہند کی آمدنی کے بڑے ذرائع کو ذیل کے عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

محاصل

دیگر ذرائع آمدنی

محکمہ ڈاک اور تار سے خالص آمدنی

ریلوں سے خالص آمدنی

اگر آمدنی کے یہ ذرائع ناکافی ثابت ہوں تو خسارہ کو پورا کرنے کے لئے حکومت ہند کو قرض لینا پڑتا ہے۔

آمدنی کے ان مختلف ذرائع سے حکومت ہند کو جو سال بہ سال آمدنیاں حاصل ہوتی رہی ہیں انھیں ذیل کے جدول میں دکھلایا گیا ہے:۔

جنگ سے قبل کا سال:۔

سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء ۸۴ کروڑ ۵۱ لاکھ

جنگ کے زمانے میں:۔

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء ۹۴ کروڑ ۵۷ لاکھ

سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء ۹۹ " ۸۸ "

سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء ایک ارب ۳۴ کروڑ ۵۷ لاکھ

سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء ۱ " ۲۷ " ۸۸ "

سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء .. .. ۲ ارب ۹۴ کروڑ ۹۵ لاکھ

سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء .. .. ۳ ارب ۵۶ کروڑ ۵۸ لاکھ

میزان .. .. گیارہ ارب ۱۲ کروڑ ۳۰ لاکھ

جنگ کے ابتدائی ۵ سال میں حکومت ہند کو بصورتِ مجموعی گیارہ ارب ۱۲ کروڑ کی آمدنی حاصل ہوئی۔ اگر آمدنی امن کے زمانے کے اوسط کے مطابق ۹۴ کروڑ ۵۰ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہوتی رہتی تو مجموعی آمدنی کا تخمینہ صرف ۵ ارب ۶۷ کروڑ ہوتا، اس لئے ۵ ارب ۴۵ کروڑ کے فرق کو جو حقیقی آمدنی اور اس مفروضہ تخمینہ میں پایا جاتا ہے۔ محصول کے اس اضافہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو جنگ کی وجہ سے حکومت نے اپنی رعایا پر عائد کیا۔ اس عدد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند اس زمانے میں اپنے محاصل کے اندر سو فی صدی اضافہ کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔

اس اضافہ کا کتنا حصہ محاصل کی قدرتی توسیع کا نتیجہ ہے اور کتنا محاصل کے عائد کرنے کا، اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے۔ جب سے انکم ٹیکس کی وصول یابی میں پے ایز یو ارن سسٹم کی پیروی کی جا رہی ہے۔ انکم ٹیکس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور کاروبار کی توسیع کی وجہ سے نئے افراد انکم ٹیکس کی زد میں آتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح صنعتی پیداوار کی ترقی کی وجہ سے ایکسائز کے محاصل میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے آمدنی کے اضافہ کا ایک حصہ تو بلا شبہ قدرتی توسیع کا نتیجہ ہے اور اگر اوپر درج کی ہوئی مثالوں اور دیگر وجوہ کے پیش نظر محاصل کے ایک تہائی اضافہ کو قدرتی اسباب کا نتیجہ تصور کیا جائے تو یہ بات خلاف حقیقت نہیں ہوگی اس لئے اس اضافہ کو منہا کرنے کے بعد آمدنی کے کم سے کم دو تہائی اضافہ کو جنگ کے حالات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

جنگ کے زمانے میں محاصل کے جو نئے قوانین بنائے گئے ان کا مختصر حال ذیل میں درج ہے
سنہ ۱۹۴۰ء کے میزانیہ میں پہلی دفعہ زائد نفع کا ٹیکس جاری کیا گیا اس کی شرح پچاس فیصدی

رکھی گئی۔ اسی سال محاصل کے بڑھانے کی دوسری تدبیریں یہ اختیار کی گئیں کہ شکر پر اکسائز کا محصول اور درآمد کا محصول دو روپیہ فی ہنڈرویٹ سے بڑھا کر تین روپیہ ہنڈرویٹ کر دیا گیا۔ پٹرول ٹیکس کو (یعنی پٹرول پر اکسائز اور کروڑ گیری دونوں کو) دس آنے فی گیلن سے ۱۲ فی گیلن کر دیا گیا۔ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء میں ضمنی بجٹ پیش کیا گیا جس میں تمام انکم ٹیکس پر (جس میں سوپر ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس بھی شامل تھے) ۲۵ فی صدی کا زائد محصول لگا دیا گیا اور ڈاک اور تار کے محصول اور ٹیلیفوں کے کرایہ میں بھی تھوڑا سا اضافہ کر دیا گیا۔

سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے بجٹ میں زائد نفع کے ٹیکس کی شرح کو ۵۰ فی صدی سے بڑھا کر ۶۶ ۲/۳ فی صدی کر دیا گیا۔ انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس پر جو ۲۵ فی صدی کا زائد محصول لگایا گیا تھا اس کو بڑھا کر ۳۳ ۱/۳ فی صدی کر دیا گیا۔ ہوا بھرنے والے ٹائروں اور ٹیوبوں پر ان کی مالیت کے لحاظ سے ۱۰ فی صدی اکسائز کا نیا محصول لگایا گیا۔ مصنوعی ریشم کے تاگے کی درآمد پر محصول کو تین آنے فی پونڈ سے بڑھا کر پانچ آنے فی پونڈ کر دیا گیا۔

سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں انکم ٹیکس کی تشخیص کے لئے آمدنی کی آخری حد کو دو ہزار روپے سالانہ سے گھٹا کر ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ کر دیا گیا۔ انکم ٹیکس پر زائد محصول کی شرح کو ۳۳ ۱/۳ فی صدی کی جگہ اس طرح بڑھایا گیا کہ ڈیڑھ ہزار سے پانچ ہزار تک کی آمدنیوں پر شرحِ محصول ۶ پائی فی روپیہ رکھی گئی اور اس کے بعد کی پانچ ہزار آمدنیوں پر ۹ پائی فی روپیہ اور اس کے بعد کے پانچ ہزار پر ایک آنہ دو پائی فی روپیہ اور پندرہ ہزار سے اوپر کی بقیہ آمدنی پر ایک آنہ تین پائی فی روپیہ۔ سوپر ٹیکس پر زائد محصول کی شرح کو پچاس فی صدی بڑھا دیا گیا اور کارپوریشن ٹیکس کی شرح کو ڈیڑھ آنہ فی روپیہ کر دیا گیا۔ زائد نفع کے ٹیکس کی شرح کو ۶۶ ۲/۳ فی صدی قائم رکھا گیا۔ لیکن کاروبار کے انتظام میں کفایت شعاری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے حکومت اس بات پر راضی ہو گئی کہ اگر محصول ادا کنندہ اس کی دوگنی رقم کو حکومت کے پاس بطور امانت جمع کرے گا تو حکومت زائد نفع کے ٹیکس کے ۱/۵ حصے کو ایک ایسے سرمایۂ محفوظ

میں اپنی طرف سے جمع کر دے گی جس سے جنگ کے بعد صنعت کے لئے نیا سامان خریدا جا سکے گا۔

تمام محاصل درآمد پر ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ۱/۵ زائد محصول عاید کیا گیا اور اس اضافہ سے صرف مندرجہ ذیل تین چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ (۱) خام روئی۔ اس وجہ سے کہ اس پر ایک خاص ضرورت سے محصول سو فی صدی بڑھایا جا چکا تھا (۲) پٹرول کہ اس پر کسٹم اور کروڑگیری کے محصول ۳ر فی گیلن کی شرح سے بڑھائے جا چکے اور (۳) نمک کو۔

چاندی اور مٹی کے تیل پر اکسائز کے محاصل کو بھی نئے محاصل درآمد کے برابر کر دیا گیا اور ڈاک تار اور ٹیلیفون کے بعض کرایوں کو بھی اور زیادہ بڑھا دیا گیا۔

سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء میں ایسی متعدد تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا دوگونہ مقصد تھا ایک طرف تو زیادہ محصول حاصل کرنا اور دوسری طرف افراطِ زر کو روکنا۔ پانچ ہزار سے زیادہ آمدنیوں پر زائد محصول کی شرح کو بڑھایا گیا۔ جس کی وجہ سے انکم ٹیکس کی بنیادی شرح پر زائد محصول کی شرح ۶۶ ۲/۳ فی صدی ہو گئی۔

سوپر ٹیکس میں بھی ۲۵ ہزار اور ۳ ۱/۲ لاکھ کی درمیانی آمدنیوں پر زائد محصول کی شرح کو یکساں طور پر ۶ پائی فی روپیہ کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زائد محصول کو ملا کر سوپر ٹیکس کی شرح ۲ر فی روپے کی کمترین شرح سے لے کر ساڑھے دس آنے فی روپے کی انتہائی شرح تک پہنچ گئی۔ کارپوریشن ٹیکس کو بھی نصف آنہ بڑھا کر ۲ر فی روپیہ کر دیا گیا۔

دو نئے اکسائز محاصل لگائے گئے ایک تمباکو پر اور دوسرا بناسپتی گھی پر۔ تمباکو سے اول سال میں ۱۰ ۱/۲ کروڑ روپیہ وصول ہونے کی توقع قائم کی گئی اور بناسپتی گھی پر شرح ۵ روپے فی ہنڈریٹ ویٹ رکھی گئی اور اس سے ایک کروڑ روپے وصول ہونے کی اُمید کی گئی۔ ڈاک اور ٹیلیفون کے بعض کرایوں میں مزید اضافہ کیا گیا جس سے ایک کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کی توقع کی گئی۔

اسی طرح ۴۵-۱۹۴۴ء کی مالیاتی تدبیروں سے بھی آمدنی میں نہ صرف جنگ اور مابعد جنگ کے زمانے کی ضرورتوں کا خیال کرکے اضافہ کیا گیا بلکہ زائد زر کو جذب کرنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ لوگ اپنے انکم ٹیکس کو پیشگی ادا کرسکتے تھے۔ زائد منافع کے ٹیکس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی لیکن لازمی امانت کے تناسب کو کمپنیوں کے لئے ٹیکس کا ۱۹/۶۴ اور دوسروں کے لیے ۱۴/۶۴ کردیا گیا۔ گویا اس کے بعد لوگوں کو تمام ایسے زائد منافع سے فوری فائدہ اٹھانے سے محروم کردیا گیا جو زائد منافع کے محصول کو ادا کرنے اور بقیہ پر انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس ادا کرنے کے بعد باقی بچا کرتا تھا۔

جن لوگوں کی آمدنیاں دو ہزار روپے سے کم تھیں ان کے ساتھ رعایت کی گئی اور محصول کی کم ترین حد کو ڈیڑھ ہزار روپے سے بڑھا کر دو ہزار روپے کردیا گیا۔ دس ہزار روپے سے پندرہ ہزار روپے تک کی آمدنیوں پر زائد انکم ٹیکس کی شرح کو دو پائی بڑھایا گیا یعنی ۲۴ پائی کی بنیادی شرح پر ۱۶ پائی سے ۱۸ پائی فی روپیہ کردیا گیا اور ۱۵ ہزار روپے سے زائد کی بقیہ آمدنیوں پر شرح کو چار پائی بڑھایا گیا یعنی ۳۰ پائی کی بنیادی شرح پر ۲۰ پائی سے ۲۴ پائی فی روپیہ کردیا گیا۔ سوپر ٹیکس پر بھی ۳۵ ہزار اور دو لاکھ کی درمیانی آمدنیوں پر زائد محصول میں دو پیسہ کا مزید اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح کارپوریشن ٹیکس کو ایک آنے سے بڑھا کر تین آنے کردیا گیا۔ لیکن کمپنی کی ایسی مجموعی آمدنی پر جو مقررہ شرح منافع کے علاوہ بطور مزید منافع کے حصے داروں کے درمیان تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایک آنہ فی روپے کی چھوٹ دی گئی۔

تمباکو پر اکسائز محاصل کو اور زیادہ بڑھایا گیا جس کی وجہ سے دس کروڑ روپے کی مزید آمدنی حاصل ہونے کی اُمید قائم کی گئی۔ تین نئے اکسائز کے محاصل لگائے گئے یعنی چھالیہ، قہوہ اور چائے پر ۲ر فی پونڈ کی شرح سے۔

ان ذرائع سے مزید آمدنی کی جو توقع قائم کی گئی وہ ۲۰.۲۵ کروڑ روپے ہوتی تھی اور

افراطِ زر کے تدارک کے سلسلے میں ان نئی تدبیروں سے تقریباً نوے کروڑ روپیہ کی واپسی کی توقع کی گئی۔

۱۹۴۵-۴۶ء میں محاصل میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ پندرہ ہزار سے زائد کی آمدنیوں پر زائد محصول کو تین پائی کے بقدر بڑھایا گیا جس سے چار کروڑ روپے کے حاصل ہونے کی اُمید قائم کی گئی۔ نہایت اعلیٰ قسم کے تمباکو پر بھی اکسائز کے محاصل اور زیادہ کئے گئے جن سے ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آمدنی حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ غیر مصنوعہ تمباکو کی درآمد پر بھی اسی کی مناسبت سے محصول میں اضافہ کیا گیا جس سے ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ وصول ہونے کی امید کی گئی۔ اندرون ملک کے ڈاک کے پارسلوں کے کرایے میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا اور ٹرنک ٹیلیفون کال اور تار کے کرایے پر بھی زاید محصول لگایا گیا۔ جس سے ایک کروڑ ۳۵ لاکھ کی آمدنی کی توقع کی گئی۔

ذیل کے جدول کے ذریعے جنگ کے زمانے میں محاصل کی مختلف مدوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں دکھلایا گیا ہے۔

(کروڑ روپیہ)

سال	محاصل کروڑ گیری	مرکزی محاصل کسائز	کارپوریشن ٹیکس	کارپوریشن ٹیکس کے علاوہ دیگر انکم ٹیکس۔	نمک کا محصول
جنگ سے قبل ۱۹۳۸-۳۹ء	۴۰ کروڑ ۱۵ لاکھ	۸ کروڑ ۶۶ لاکھ	۲ کروڑ ۴ لاکھ	۱۵ کروڑ ۴۴ لاکھ	۸ کروڑ ۱۲ لاکھ
جنگ کے زمانے میں ۱۹۳۹-۴۰ء	۴۵ 〃 ۸۸ 〃	۶ 〃 ۵۲ 〃	۲ 〃 ۳۸ 〃	۱۶ 〃 ۹۹ 〃	۱۰ 〃 ۸۶ 〃
۱۹۴۰-۴۱ء	۳۷ 〃 ۳۰ 〃	۶ 〃 ۴۹ 〃	۴ 〃 ۱۴ 〃	۲۱ 〃 ۷۹ 〃	۷ 〃 ۶۷ 〃
۱۹۴۱-۴۲ء	۳۷ 〃 ۸۹ 〃	۱۳ 〃 ۱۵ 〃	۱۱ 〃 ۶۶ 〃	۳۲ 〃 ۴۰ 〃	۹ 〃 ۲۰ 〃
۱۹۴۲-۴۳ء	۲۵ 〃 ۱۳ 〃	۱۲ 〃 ۷۵ 〃	۳۱ 〃 ۴۰ 〃	۵۴ 〃 ۳۶ 〃	۱۰ 〃 ۹۱ 〃
۱۹۴۳-۴۴ء	۲۶ 〃 ۵۷ 〃	۲۴ 〃 ۹۴ 〃	۵۱ 〃 ۲۸ 〃	۴۷ 〃 ۸۶ 〃	۸ 〃 ۳۹ 〃
۱۹۴۴-۴۵ء	۴۰ 〃	۳۹ 〃 ۷ 〃	ایک ارب ۶ کروڑ [illegible] لاکھ	ایک ارب ۲ کروڑ ۸۹ لاکھ	۹ 〃 ۳۰ 〃

اس جدول کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصل کروڑگیری عین اس سال جب کہ ان میں ۲۰ فی صدی کا زاید محصول لگایا گیا۔ جنگ سے قبل کے سال کے مقابلے میں ۴۰ فی صدی کم ہوکر صرف ۲۵ کروڑ رہ گئے۔ ۱۹۴۲-۴۳ء کی تھوڑی سی کمی کو نظر انداز کر دیا جائے تو محاصل اکسائز میں متواتر توسیع نظر آتی ہے۔ انکم ٹیکس میں (جس میں کارپوریشن ٹیکس بھی شامل ہے) غیر معمولی طور پر نمایاں اضافہ نظر آتا ہے یعنی ۱۷ کروڑ سے بڑھ کر یہ دو ارب دس کروڑ تک پہنچ گیا۔ نمک کا محصول کم و بیش قائم حالت پر رہا۔

حکومت کے بعض تجارتی شعبوں کی آمدنی سے بھی مثلاً ڈاک اور تار اور ریل کے محکموں سے سرکار کی عام آمدنی میں بڑا اچھا اضافہ ہوا۔ ذیل کے جدول میں مثال کے طور پر ڈاک اور تار اور ریل کے محکموں کی آمدنیوں کو دکھلایا گیا ہے:-

سال	ڈاک اور تار کے محکمے سے خالص آمدنی	ریلوں سے خالص آمدنی
جنگ سے قبل		
۱۹۳۸-۳۹ء	۱۹ لاکھ روپے	ایک کروڑ ۳۷ لاکھ
جنگ کے زمانے میں		
۱۹۳۹-۴۰ء	۵۹ " "	۴ " ۳۳ "
۱۹۴۰-۴۱ء	ایک کروڑ ۲۵ لاکھ	۱۲ " ۱۶ "
۱۹۴۱-۴۲ء	۳ " ۴۱ "	۲۰ " ۱۷ "
۱۹۴۲-۴۳ء	۴ " ۵۲ "	۲۰ " ۱۳ "
۱۹۴۳-۴۴ء	۹ " ۳ "	۳۷ " ۶۳ "
۱۹۴۴-۴۵ء	۹ " ۳۲ "	۳۲ "

ذیل کے جدول میں حکومتِ ہند کی آمدنی اور مصارف کے خلاصہ کو درج کیا گیا ہے

	۱۹۳۸-۳۹ء	۱۹۳۹-۴۰ء	۱۹۴۰-۴۱ء	۱۹۴۱-۴۲ء	۱۹۴۲-۴۳ء	۱۹۴۳-۴۴ء	۱۹۴۴-۴۵ء
آمدنی							
آمدنی کی خالص مدیں	۷۹ر۱۱	۸۴ر۰۹	۸۳ر۰۱	۱۰۶ر۱۵	۱۳۶ر۵۷	۱۹۱ر۵۱	۳۰۱ر۳۲
آمدنی کی دوسری متفرق مدیں	۸ر۳۴	۸ر۰۵	۱۶ر۳۹	۱۲ر۲۳	۲۶ر۵۹	۳۰ر۲۷	۴۰ر۸۰
ڈاک اور تار سے خالص آمدنی	ر۱۹	ر۸۹	۱ر۲۵	۳ر۴۱	۵ر۵۲	۹ر۰۳	۹ر۳۲
ریل سے خالص آمدنی	۱ر۳۷	۴ر۴۳	۱۲ر۱۶	۲۰ر۱۷	۲۰ر۱۳	۳۷ر۶۴	۳۲ر۰۰
	۸۶ر۰۱	۹۷ر۳۶	۱۱۱ر۸۱	۱۴۱ر۹۶	۱۸۷ر۷۸	۲۶۹ر۴۵	۳۸۳ر۴۴
منہا صوبوں کا انکم ٹیکس میں حصہ	۱ر۵۰	۲ر۷۹	۴ر۱۶	۷ر۳۹	۱۰ر۹۰	۱۹ر۵۰	۲۶ر۵۶
میزان آمدنی	۸۴ر۵۱	۹۴ر۵۷	۱۰۷ر۶۵	۱۳۴ر۵۷	۱۷۶ر۸۸	۲۴۹ر۹۵	۳۵۶ر۸۸
خرچ							
مدافعت پر	۴۶ر۱۸	۴۹ر۵۴	۷۳ر۶۱	۱۰۳ر۹۳	۲۱۴ر۶۲	۳۵۸ر۴۰	۳۹۷ر۲۳
شہری مصرف پر	۳۸ر۹۷	۴۵ر۰۳	۴۰ر۵۷	۴۳ر۳۳	۷۴ر۴۳	۸۱ر۴۵	۱۱۵ر۴۲
میزان خرچ	۸۵ر۱۵	۹۴ر۵۷	۱۱۴ر۱۸	۱۴۷ر۲۶	۲۸۹ر۰۵	۴۳۹ر۸۵	۵۱۲ر۶۵
خسارہ	ر۶۴	۰۰۰	۶ر۵۳	۱۲ر۶۹	۱۱۲ر۱۷	۱۸۹ر۹۰	۱۵۵ر۷۷

جنگ کے شروع زمانے میں مصارف کو پورا کرنے کے لئے محاصل ہی پر انحصار کیا گیا اور ان کی مقدار میں اضافہ کیا گیا۔ جنگ کے لئے روپیہ بہت کم قرض لیا گیا۔ لیکن بعد کے زمانے میں قرض کی مقدار آمدنی سے کہیں زیادہ ہوگئی اور جیسا کہ سر جریمی رائیس مین نے اپنے آخری دو بجٹوں کی تقریر کے دوران میں کہا کہ ہندوستان کی جنگی مالیات میں اب قرض کی حیثیت "سب سے بڑے لنگر یا آخری پناہ اور سہارے کی ہوگئی ہے۔ یہ قرض نہ صرف جنگ کے مصارف کو

پورا کرنے کے لئے لیا گیا بلکہ افراط زر کا تدارک کرنے کے لئے بھی لیا گیا۔

جنگ کے زمانے میں خسارہ کی مجموعی میزان ۴ ارب ۷۷ کروڑ روپیہ ہوتی ہے جس کو حکومتِ ہند کے زیادہ تر قرض لے کر پورا کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے ——— جنگ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے میں قرض سے بہت کم کام لیا گیا۔ جنگ کی ابتدا سے جنوری ۴۵ء کے آخر تک قرض کی میزان ۸ ارب ۳۴ کروڑ روپے ہوتی ہے جنگ سے قبل کے سالوں میں جس طرح کم شرح سود پر کامیابی کے ساتھ قرض لیا جا رہا تھا اس کم شرح کو جنگ کے زمانے میں بھی جاری رکھا گیا۔ چنانچہ جنگ کے زمانے کے تمام قرضے تین فی صدی شرح سود کی بنیاد پر لئے گئے ہیں۔

روپیہ قرض دینے والے لوگوں کی خواہشات کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف قسم کے قرضے طلب کئے گئے۔ کچھ چھوٹی مدت کے تھے، کچھ درمیانی مدت کے۔ کم پونجی رکھنے والے لوگوں کو قرض دینے کے لئے مائل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں بارہ سال کے نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کی شرح سود نسبتاً کچھ زیادہ اسی لئے رکھی گئی تاکہ کم پونجی والے لوگ بھی ان کے خریدنے کی طرف مائل ہو سکیں۔

چھوٹی رقموں کی بچت کی حوصلہ افزائی کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ان میں صوبائی حکومتوں اور غیر سرکاری اداروں کے اشتراکِ عمل سے اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا اندازہ ڈاک خانے کے سیونگ بنک کے حسابات اور بارہ سالہ نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے جس سے تین کروڑ روپیہ ماہانہ کی رفتار سے حکومتِ ہند کو قرض ملتا رہا۔

حکومت ہند کے غیر مستقل قرضے کی مقدار ۱۹۴۳-۴۴ء کے خاتمہ پر ایک ارب ۱۱ کروڑ تھی اور ۳۱ جنوری ۱۹۴۵ء کو ۹۳ کروڑ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند کو اپنی عارضی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے بھی قرض لینے میں کسی دشواری کا

سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

۱۹۴۴-۴۵ء کے خاتمہ پر حکومتِ ہند کے سرکاری قرضے کی (جس پر سود واجب الادا ہی) میزان ۱۷ ارب ۹۹ کروڑ روپیہ ہوتی تھی۔ اس کے بالمقابل جمع کے کھاتے میں سود ادا کرنے والی پونجی کی میزان ۱۰ ارب ۴ کروڑ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ نقدی اور خزانے کے کھاتے کے تمسکات کی مالیات ۳ ارب ۱۲ کروڑ ہوتی تھی۔ اس لئے ایسا قرضہ جس کے اصل اور سود کی ادائی کے لئے کوئی دولت آفریں سرمایہ موجود نہیں تھا۔ صرف ۴ ارب ۸۳ کروڑ تھا۔

اس جنگ سے ایک مہتم بالشان نتیجہ یہ نکلا ہی کہ اب ہندوستان بین الاقوامی منڈی میں ایک مقروض ملک کی جگہ ایک قرض خواہ ملک بن گیا ہی۔ موجودہ جنگ سے پہلے ایک طویل مدت سے ہندوستان کا شمار مقروض ملکوں میں کیا جاتا تھا لیکن جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے حساب میں برطانیہ کے اندر جو اسٹرلنگ فاضلات جمع ہوتے رہے ہیں انھوں نے پانسہ پلٹ دیا ہی۔

اسٹرلنگ فاضلات کے ذخیرے کے اجتماع کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نظام زر کے بارے میں چند ابتدائی باتوں کی تشریح کردی جائے۔

ہندوستان میں چاندی کا یا کاغذ کا روپیہ چلتا ہی۔ حکومتِ ہند نے اس کی قیمت ایک شلنگ ۶ پنس مقرر کی ہی۔ لیکن نہ تو چاندی کے روپے میں اس قیمت کی چاندی ہوتی ہی نہ کاغذ کے روپے کی قدر ذاتی اس کے برابر ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستانی روپے کو وضعی یا اعتباری زر کہا جاتا ہے۔

وضعی اور اعتباری زر کی قدر و قیمت کو اس کی ذاتی قدر و قیمت کے مقابلے میں اسی وقت بلند رکھا جا سکتا ہے جب کہ اس کی رسد کی فراہمی پر پورا قابو رکھا جائے۔ حکومتِ ہند

نے روپئے کی مقررہ قیمت کو قائم رکھنے کا انتظام رزرو بنک آف انڈیا کو سپرد کردیا ہی اور اُسے روپئے کی رسار کو ہمیشہ اتنا رکھنا پڑتا ہے کہ جس سے اس کی قیمت نہ تو ایک شلنگ سے زیادہ ہونے پائے نہ اس سے کم۔ اس کو پابند کیا گیا ہی کہ وہ ہندوستان کے روپئے کے بدلے میں انگلستان کا کاغذی سکہ اسٹرلنگ اور انگلستان کے کاغذی سکہ اسٹرلنگ یا سونے کے معاوضے میں ہندوستان کا روپیہ ہر اس شخص کو جو اس کا مطالبہ کرے ایک شلنگ ۶ پنس فی روپئے کی شرح سے فوراً ادا کرے۔ اس کے لئے رزرو بنک کو ایک طرف تو اپنے ذخیرہ محفوظ میں قانوناً اپنے جاری شدہ مجموعی نوٹوں کے بالمقابل کم سے کم پچاس فی صدی سونا یا اسٹرلنگ جمع رکھنے ہوتے ہیں تاکہ روپے کے بدلے میں فوراً اسٹرلنگ کی ادائی کا بندوبست کرسکے اور دوسری طرف اس پابندی کو پورا کرتے ہوئے اُسے نوٹوں کے اجرا کا پورا اختیار ہوتا ہی جس کے ذریعے وہ اسٹرلنگ کے بدلے میں فوراً روپے کی ادائی کا انتظام کرسکتا ہی۔

ملکی معاملات اور لین دین میں تو عموماً کسی شخص کو روپئے کے معاوضے میں اسٹرلنگ حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور گورنمنٹ اور رزرو بنک آف انڈیا کی ان کوششوں کا جو وہ روپئے کی قیمت کو ایک شلنگ چھ پنس کی برابر رکھنے کے لئے کیا کرتی رہتی ہی کبھی احساس بھی نہیں ہوتا لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں لین دین کرتے ہیں انھیں البتہ یا تو باہر کے ملکوں کے سکوں کی جو انھیں اپنے برآمد کردہ مال کے معاوضہ میں دوسرے ملکوں میں ملتے ہیں اور جو ہندوستان میں نہیں چل سکتے، ہندوستانی روپے میں تبدیل کرانا ہوتا ہی یا درآمد کردہ مال کی قیمت غیر ملکوں کو ادا کرنے کے لئے ہندوستانی روپے کو جو باہر کے ملکوں میں نہیں چل سکتا باہر کے سکوں میں تبدیل کرانا ہوتا ہی اور اس لئے ان کے لئے روپے کی یہ قیمت اور شرح مبادلہ غیر معمولی اہمیت رکھتی ہی۔

اب اگر یہ صورت ہوتی کہ حکومت ہند نے روپئے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس انگلستان کے سونے کے سکے یعنی ساورن کی شکل میں مقرر کی ہوتی تو ہندوستان مبادلات خارجہ میں انگلستان کے کاغذی سکہ کا بالکل محتاج نہ ہوتا کیونکہ ہندوستان کا تاجر رزرو بنک میں روپیہ داخل کرتا اور اس کے معاوضے میں ساورن یعنی سونا ایک شلنگ چھ پنس

کی شرح سے بنک سے حاصل کرکے اپنے غیر ملکی قرض خواہوں کے حوالے کردیتا اور انگلستان
کی درمیانی کڑی اس کے لئے لازمی اور ناگزیر نہ رہتی۔ لیکن دراصل صورت یہ نہیں ہے
ہندوستان کے روپئے کی قیمت انگلستان کے کاغذکے سکے یعنی اسٹرلنگ کی صورت
میں مقرر کی گئی ہے۔ اس لئے میادے کے ہر موقع پر اس درمیانی کڑی کا اشتراک عمل
اس کے لئے لازمی ہوگیا ہے۔ دوسرے ملکوں کا جب وہ قرض ادا کرتا ہے تو اسے انگلستان
کے کاغذی سکہ اسٹرلنگ کو ضرور درمیان میں لانا پڑتا ہے اور اسی طرح جب اسے دوسرے
ملکوں سے قرض وصول کرنا ہوتا ہے تب بھی یہ درمیانی کڑی موجود رہتی ہے۔ قرض
ادا کرتے وقت وہ ہندوستان کا روپیہ رزرو بنک آف انڈیا میں داخل کرتا ہے اور یہ بنک
اپنے ذخیرہ اسٹرلنگ میں سے اسے اسٹرلنگ ادا کردیتا ہے جس سے وہ اپنے قرض خواہوں
کا مطالبہ بیباق کرسکتا ہے۔ اس ادائی کے بعد رزرو بنک کے ذخیرہ محفوظ میں اسٹرلنگ
کی جتنی کمی ہوتی ہے۔ اسی کے مطابق وہ اپنے اعتباری روپیوں کو مسترد کرکے ان کی رسد
کو کم کردیتا ہے۔ جب معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی ہندوستان کو باہر کے ملکوں سے
قرض وصول کرنا ہوتا ہے تو اس صورت میں رزرو بنک آف انڈیا کے ذخیرہ محفوظ میں
اسٹرلنگ زیادہ ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور ان کی ضمانت پر وہ ہندوستان میں اعتباری
اور وضعی روپیوں کی رسد کو بڑھا دیتا ہے اور ہندوستان کے ان لوگوں کو جن کا مطالبہ
واجب الوصول ہے روپیہ ادا کردیتا ہے۔

مالیاتِ ہند کے بارے میں جو بحث جاری تھی اس کے سلسلے میں ہندوستان کے نظام زر
یہ آخری پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں افراطِ زر کے مسئلے
بالکل ایک نئی صورت اختیار کرلی جیساکہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ حکومتِ ہند نے موجودہ
لک میں اپنے بجٹ کے خسارے کو تو بلاشبہ کثیر مقدار میں نوٹ چھاپ کر پورا نہیں کیا اور اس لحاظ
ذاتی طور پر اس نے افراطِ زر سے کبھی کام نہیں لیا۔ لیکن حکومت برطانیہ کی طرف سے

جو جنگی مصارف ہندوستان میں کرنا پڑے اور جن کی ادائی برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ کی صورت میں کی گئی اور جو رزرو بنک کے ذخیرہ اسٹرلنگ کے بڑھانے کا موجب ہوئے ان کی ضمانت پر رزرو بنک آف انڈیا نے البتہ بہت کثرت سے روپے کے نوٹوں کو چھاپ کر برطانیہ کے قرضوں کو ہندوستان میں بے باق کیا۔ قانونی اور نظری اعتبار سے ممکن ہے رزرو بنک آف انڈیا کی اس ساری کارروائی میں کوئی سقم یا مالیاتی نقص نہ ہو۔ کیونکہ روپے کی مقررہ قیمت میں اس کی وجہ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہ حسب سابق ایک شلنگ ۶ پنس پر قائم رہی ۔ بلکہ حالات اتنے موافق ہو گئے تھے کہ اگر رزرو بنک سے کہا جاتا تو وہ اس کی قیمت کو اور بہت زیادہ بڑھا سکتا تھا۔ لیکن ان نظری اور قانونی موشگافیوں سے عملی حقائق کو زیادہ عرصے تک جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ روپئے کی خارجی قیمت ضرور مستحکم بنیاد پر قائم تھی لیکن مبادلاتِ خارجہ تجارتِ خارجہ اور ذرائع نقل وحمل کی راشن بندی اور کنٹرول کی وجہ سے ہندوستانی خریدار اس کے فائدے سے محروم تھا۔ ملک کے اندر روپئے کی حقیقی قیمت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ کا سلسلہ جاری تھا۔ مصارفِ زندگی بہت بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کی ذمہ داری بہت بڑی حد تک ان نئے نوٹوں پر عائد کی جا سکتی تھی۔ جو رزرو بنک آف انڈیا، اسٹرلنگ کے اضافہ پذیر ذخیرے کی ضمانت پر چھاپ چھاپ کر جاری کر رہا تھا۔ شروع شروع میں وزیر مالیات اور حکومت کے دوسرے ہوا خواہوں نے لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا چاہا کہ ہندوستان میں افراطِ زر نہیں ہے۔ لیکن بعد میں ناقابلِ انکار شہادتوں کی موجودگی میں ان کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان میں "افراطِ زر کا خلا" (INFLATIONARY GAP) موجود ہے، یعنی جتنے نئے نوٹ رزرو بنک کی طرف سے قرضوں کو بیباق کرنے کے لئے چھاپ کر جاری کئے جاتے ہیں وہ تمام کے تمام جلد رزرو بنک میں واپس آکر مسترد نہیں ہو جاتے بلکہ ان سے بازاروں میں لوگ خریداری کا کام لینا جاری رکھتے ہیں اور اس طرح بازاروں کی

قیمتوں کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس "افراطِ زر کے خلا" کو پر کرنے کے لئے وزیر مالیات نے ایک طرف تو وہ کارروائیاں اختیار کیں جن کا تذکرہ نئے محاصل کے عائد کرنے کے سلسلے میں اوپر کیا جا چکا ہے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر ہندوستانیوں سے قرض لینے کا کام شروع کیا گیا تاکہ نئے جاری شدہ نوٹوں کو قیمتوں کے بڑھانے کا موقع نہ مل سکے لیکن یہ کارروائیاں بعد میں اختیار کی گئیں اور داخلی قیمتوں کی موجودہ گرانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں حکومتِ ہند کو جیسا چاہیئے تھا ویسی کامیابی ابھی تک نہیں ہوسکی۔

بہرحال یہ موضوع ایک جداگانہ بحث چاہتا ہے۔ ہم نے دراصل اسٹرلنگ کے ذخیروں میں جو غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے نظامِ زر کے پیشگی مطالعے کو ضروری سمجھا تھا۔ اس لئے اس تمہیدی گفتگو کے بعد دوبارہ ہم اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

موجودہ جنگ کے زمانے میں ایک طرف تو ہندوستان کا توازن تجارت بہت موافق ہوگیا یعنی ہندوستان نے برطانیہ اور دوسرے ملکوں کو اپنا مال برآمد زیادہ کیا اور ان کا مال درآمد کم کیا اس زاید برآمد کی قیمت انھوں نے رزرو بنک میں اسٹرلنگ جمع کرکے اور اس کی ضمانت پر روپے کے نوٹ چھپوا کر ہندوستانی تاجروں کو ادا کرائی۔ دوسرے سلطنت برطانیہ اور دوسری متحدہ حکومتوں کی طرف سے جو فوجی مصارف ہندوستان میں کئے گئے ان کی ادائی بھی اس طرح ہوئی کہ رزرو بنک میں اسٹرلنگ جمع کئے گئے اور ان کی ضمانت پر روپے کے نوٹ ہندوستان میں چھپوا کر ہندوستانی صناعوں، ٹھیکیداروں، تاجروں اور مزدوروں کے مطالبوں کا بھگتان کیا گیا۔ تیسرے حکومتِ ہند نے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کچھ اور بھی ایسے متفرق اخراجات ہندوستان میں کئے جن کی ادائی حکومتِ برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ میں کی گئی۔ جو رزرو بنک کے ذخیرہ محفوظ میں جمع ہوئے اور ان کی بنیاد پر روپے کے نوٹ چھاپ کر ہندوستان کے لوگوں کے مطالبے بیباق کئے گئے۔ غرض ان مختلف طریقوں سے رزرو بنک آف انڈیا کے ذخیرہ محفوظ

میں اسٹرلنگ تیزی کے ساتھ جمع ہوتے رہے۔

جب اسٹرلنگ بہت زیادہ جمع ہوگئے تو ان کے ذخیرے سے فائدہ اُٹھانے کی ایک صورت یہ نکالی گئی کہ حکومتِ ہند کے ذمے جو قرض اسٹرلنگ کی صورت میں واجب الادا تھا اس کو بیباق کرنے کی کارروائی اختیار کی گئی۔ یہ قرض ۱۹۳۸-۳۹ء میں یعنی جنگ سے پہلے تین ارب ۴۶ کروڑ ۲۰ لاکھ تھا۔ اب اس کے بیشتر حصے کو بیباق کر دیا گیا ہے اور صرف ۱۴ کروڑ باقی رہ گیا ہے جو اس لئے نہیں ہو سکا ہے کہ اس کا ادا کرنا حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس کے قرض کے بیباق ہوجانے کی وجہ سے ہندوستان کی مالی حالت بہت مضبوط ہوگئی ہے اور بین الاقوامی منڈی میں اس کا اعتبار بہت بڑھ گیا ہے۔ خارجی مقروضیت کی وجہ سے اس کی سیاسی ترقی میں جو ایک رکاوٹ حائل تھی وہ دور ہوگئی ہے۔ لیکن اس قرض کے ادا کرنے کے بعد بھی رزرو بنک کے ذخیرۂ اسٹرلنگ میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اجتماع اور اضافے کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۵ء کو تیرہ ارب ۶۲ کروڑ کے اسٹرلنگ فاضلات رزرو بنک میں موجود تھے۔ ہندوستان کی حیثیت مقروض ملک کی جگہ اب قرض خواہ ملک کی ہوگئی ہے۔ برطانیہ نے بیسیوں سال کے دوران میں جو رقم ہندوستان کو آہستہ آہستہ قرض دی تھی۔ ہندوستان نے تین چار سال کی مختصر مدت میں نہ صرف اسے ادا کر دیا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ قرض کا بوجھ خود برطانیہ پر لاد دیا ہے۔

اس تبدیلی کا خلاصہ ذیل کے جدول میں اسٹرلنگ کی رسد کے ذرائع اور اس کے استعمال کے طریقوں کو درج کرکے پیش کیا گیا ہے:-

رسد کے ذرائع:-

۱۔ اگست ۱۹۳۹ء میں رزرو بنک کے پاس اسٹرلنگ کا ذخیرہ	۶۴ کروڑ روپے
۲۔ جنوری ۱۹۴۵ء تک رزرو بنک کی طرف سے اسٹرلنگ کی خریداری	۱۰ ارب ۳۳ کروڑ روپے

۳۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو اسٹرلنگ کی ادائی — ۱۲ ارب ۵۴ کروڑ روپے

میزان — ۱۹ ،، ۴۲ ،، ،،

استعمال کے طریقے :۔

۱۔ اسٹرلنگ قرضے کی ہندوستان کی طرف سے ادائی — ۴ ارب روپے

۲۔ دیگر مصارف اسٹرلنگ — ۲ ،، ۴۸ کروڑ روپے

۳۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے آخر میں رزرو بنک میں اسٹرلنگ کا ذخیرہ محفوظ — ۱۳ ،، ۴ ،، ،،

میزان — ۱۹ ،، ۴۲ ،، ،،

اسٹرلنگ کے قرضے کی ادائی کے علاوہ ہندوستان نے دوسرے حسب ذیل اسٹرلنگ کے مطالبوں سے اپنے آپ کو بری الذمہ کرلیا ہے :۔

۱۔ ریلوے کے سالانہ سود کو یکبارگی ادا کردیا اور ان کے قرضے کے تمسکات کو بیباق کردیا — ۲۴ ملین پونڈ

۲۔ کمپنی کے انتظام میں جو ریلیں تھیں انھیں خرید لیا — ۲۸ ،، ،،

۳۔ چیٹ فیلڈ کمیٹی کے سلسلے کے قرض کو ادا کردیا — ۸½ ،، ،،

۴۔ غیر موثر مطالبوں کی ادائی کو حکومت برطانیہ کے سپرد کردیا۔ — ۱۵ ،، ،،

ان سب کاموں کے کرنے کے باوجود ہندوستان کے پاس کثیر مقدار میں اسٹرلنگ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس مسئلے نے کہ اسے جنگ کے بعد کس طرح استعمال میں لایا جائے بہت اہمیت اختیار کی ہے۔ گذشتہ سال جب ہندوستان کے وزیر مالیات سر جیرمی رائسمین

انگلستان گئے تھے تو انھوں نے برطانیہ کے محکمۂ مال کے عہدہ داروں سے اس کے بارے میں کچھ گفتگو کی تھی اور آیندہ کے فیصلوں کے لئے زمین کو ہموار کیا تھا۔

جولائی ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے شہر برٹین وڈز میں جو بین الاقوامی زر کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ہندوستان کی طرف سے ۵ اشخاص کا ایک وفد بھیجا گیا تھا جس میں ہندوستان کے وزیر مالیات سر جیرمی رائس مین۔ رزرو بنک آف انڈیا کے گورنر سر سی، ڈی، دیش مکھ اور حکومت ہند کے معاشی مشیر ڈاکٹر سر تھیوڈور گریگری کے علاوہ سر شان مکھم چیٹی اور مسٹر اے، ڈی شراف شامل تھے۔ اس کانفرنس میں بین الاقوامی ذخیرہ زر اور بین الاقوامی بنک کے قیام کے مسئلوں پر متحدہ اقوام کے مندوبین نے غور وخوض کیا تھا ہندوستانی وفد نے اس موقع پر اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلے کو وہاں اٹھایا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ بین الاقوامی ذخیرۂ زر کی معرفت ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات بھی ادا کردئے جائیں تاکہ ہندوستان اپنی معاشی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے دنیا میں جہاں چاہے مشینیں اور ضروری سامان خرید سکے۔ لیکن کانفرنس نے اس تجویز کو اس بنیاد پر نامنظور کر دیا تھا کہ بین الاقوامی ذخیرہ زر اپنے وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے اس ذمے داری کو پورا نہ کرسکے گا۔

اس لئے اب اسٹرلنگ فاضلات کی ادائی کا معاملہ براہ راست برطانیہ ہی سے طے کرنا ہوگا۔

حکومت ہند کا محکمہ مالیات تعمیر مابعد جنگ کے لئے روپے کی فراہمی کے مسئلے پر بھی غور کر رہا ہے۔ ۱۹۴۴ء کا بجٹ پیش کرتے وقت وزیر سر جیرمی رائس مین نے بیان کیا تھا کہ اگر حالات موافق ہوئے تو جنگ کے بعد چوتھے یا پانچویں سال میں ایک ارب سالانہ کی تو فیر تعمیر مابعد جنگ کے کاموں کو پورا کرنے کے لئے نکالی جاسکے گی۔ موافق حالات سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر (۱) متحدہ بین الاقوامی کوشش سے روزگار اور

پیداوار دولت کو مکمل طور پر جاری رکھا گیا۔ (۲) فوج کی برطرفی کی رفتار معقول حد تک تیز رہی اور (۳) ملک کی اہلیت ادائی محصول سے حکومت نے مستقل مزاجی کے ساتھ پورا پورا فائدہ اُٹھانا جاری رکھا تو ابتدائی ایک دو سال کے خسارہ کے بعد اس توقیر کو حاصل کرنا ممکن ہوگا

اس کے علاوہ اگر رعایا سے قرض لینے کے ان طریقوں کو جنھیں جنگ کے زمانے میں دریافت کیا گیا ہے جاری رکھا گیا تو یہ توقع ہرگز بے جا نہیں ہے کہ تعمیر ما بعد جنگ کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے جنگ کی اولین پنج سالہ مدت گذرنے کے بعد دس ارب روپیوں کو فراہم کیا جاسکے گا۔ اس رقم میں نجی افراد کی سرمایہ کاری شامل نہیں ہے جس کے بارے میں عاملہ حکومت ہند کی منصوبہ ساز کمیٹی کا اندازہ تھا کہ اس ذریعے سے بھی پانچ ارب روپیہ فراہم ہوسکے گا۔ صوبوں اور ریاستوں کی حکومتوں کے وسائل بھی اس رقم میں شامل نہیں کئے گئے ہیں۔

سر جرمی رائس مین کی یہ رائے تھی کہ اولین پنج سالہ مدت کے بعد کی پنج سالہ مدتوں میں مالی وسائل کی ترقی دونی اور چوگنی رفتار یعنی ہندسی تناسب سے ہوتی رہے گی۔ لیکن انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس نتیجے کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ سازی کو معقول مالی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔ انفرادی منصوبوں کو اس طرح تیار کرنا ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں اور ایسی اسکیموں کو ترجیح دینا ہوگی جو بلا واسطہ طریقے پر دولت اور خوش حالی کی ترقی کا موجب ہوں گی اور اپنی ترقی سے سرکاری آمدنی کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گی۔

اپنی آخری بجٹ کی تقریر میں سر جرمی رائس مین نے ما بعد جنگ کی مالیات کے بارے میں اپنے خیالات کو اور واضح صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ جنگ کے بعد سرکاری محاصل کو بڑھانے کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ زراعتی جایداد کے علاوہ باقی جائداد پر محصول جائداد لگاکر
۲۔ زراعتی آمدنی پر انکم ٹیکس لگاکر۔
۳۔ محصول کروڑ گیری سے جنگ کے فوراً بعد تو بے مثال آمدنی بڑھائی جاسکے گی لیکن اس کے بعد آمدنی گھٹ جائے گی۔ لیکن پھر بہت سے سالوں تک آمدنی اضافہ کی طرف مائل رہے گی۔ لیکن جب صنعتوں کو ترقی ہونا شروع ہوگی تو آمدنی کے اس ذریعے میں توسیع نہیں ہوسکے گی بلکہ مستقل زوال شروع ہوجائے گا۔
۴۔ مرکزی محاصل اکسائز پر پہلے سے زیادہ بھروسہ کرنا پڑے گا۔
۵۔ محاصل فروخت یا مقررہ مدت کی بکری کے محاصل کی توسیع کرنا ہوگی۔

اس کے علاوہ سر جرمی رالیس مین نے یہ کہا کہ حکومت اپنی آمدنی کے ذرائع میں اضافہ کرنے کے لئے بعض صنعتوں کو بھی اپنی ملکیت اور انتظام میں لے سکتی ہے۔

غرض جنگ کا اثر ہندوستان کی مالیات عامہ پر اور اعتبارات سے چاہے کتنا ہی مضرت رساں کیوں نہ رہا ہو لیکن اس لحاظ سے بہت خوش گوار پڑا ہے کہ اس کی وجہ سے تعمیری کاموں کے لئے روپئے کی فراہمی کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں اور حکومت کے لئے کسی تعمیری کام کو یہ عذر کرکے ٹالنا آسان نہیں رہا ہے کہ اس کے لئے وسائل فراہم نہ ہوسکیں گے۔ لارڈ ویول ہندوستان کے موجودہ وائسرائے نے اپنے عہدے کا چارج لینے سے پہلے انگلستان میں ایک تقریر کی تھی جس کا یہ اقتباس اس ضمن میں دلچسپی سے خالی نہیں۔

"مجھے یہ بات ہمیشہ بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کے لئے کتنا ہی روپیہ کیوں نہ طلب کیا جائے اس کی فراہمی میں کبھی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی قوم نے آج تک امن کے زمانے کی خرابیوں یعنی افلاس، جہالت بے روزگاری اور بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے اس پیمانے پر روپیہ

فراہم نہیں کیا ہے جس پر جنگ کے لئے کیا جاتا ہے، جب ہم اپنا روپیہ اور
کوشش اسی آزادی اور اسی جذبے کے ماتحت جو ہم ہٹلر کے خلاف استعمال
کر رہے ہیں ان خرابیوں کے دور کرنے کے لئے بھی استعمال کرنے لگیں گے
تب حقیقت میں ترقی کا کام شروع ہوگا ۔ جس ملک میں میں جا رہا ہوں (یعنی
ہندوستان) وہاں افلاس، جہالت اور بیماری کا مقابلہ اتنے بڑے
پیمانے پر کرتا ہے جتنا شاید دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں کرتا ہے۔"
وائسرائے ہند کی یہ تقریر ہمارے مستقبل کے وزرا مالیات کے لئے ایک چیلنج
ہے کیا وہ اس چیلنج کو قبول کریں گے ؟

روس میں عورتوں کی اصلاح و ترقی اور بچوں کی نگہداشت

بالشویکوں نے روسی قوم کی اصلاح و ترقی کا کام مردوں سے نہیں بلکہ عورتوں سے شروع کیا۔ یورپ اور امریکہ میں عورتوں کی آزادی کی تحریکیں یوں تو متفرق طور پر تقریباً ایک صدی سے چل رہی تھیں اور آہستہ آہستہ عورتوں کے لئے مردوں کے برابر حقوق حاصل کئے جارہے تھے لیکن روس میں یہ کام نہایت تھوڑے عرصے میں ایک ہمہ گیر منصوبہ کے ماتحت کیا گیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی عورتوں کو نہ صرف زمیندار اور سرمایہ دار کے استحصال ناجائز سے آزاد کیا گیا۔ بلکہ باپ اور شوہر کے بے جا اقتدار کی بندشوں کو بھی ختم کیا گیا اور ان کی حیثیت اور ان کے مرتبہ کو ہر لحاظ سے مردوں کے برابر قرار دے دیا گیا۔ چاہے معاملہ شہری حقوق کا ہو، چاہے آمدنی کے حصول اور اس کے صرف کا۔ چاہے رہنماؤں کی جگہوں پر تقرر کا، ہر معاملے میں عورت کو مختار بالذات بنا دیا گیا اور انسانی تعلقات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا اور ایک نئے نظام کے ماتحت لایا گیا۔

روس کی عورتوں کی حالت انقلاب سے پہلے بہت خستہ اور ابتر تھی۔ روس کی آبادی کا دسواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اسلام نے اپنی ترقی کے ابتدائی روشن دور میں عورتوں کی حیثیت میں ایک انقلابی بلندی پیدا کی تھی لیکن اس کے شاندار کارنامے کو روس اور دیگر اسلامی ملکوں کے مسلمان ایک زمانہ ہوا بھلا چکے تھے۔ ہندوستان کی طرح، روس کے مسلمانوں میں بھی، پردے کا رواج عام تھا اور عورتیں تمام حقوق سے محروم تھیں۔ وہ گیارہ برس کی عمر میں اپنے شوہر کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی تھیں اور ان سے لونڈیوں اور باندیوں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ قانونی طور پر اس کے قریب ترین عزیز کی ملکیت میں پہنچ جاتی تھیں اور ان کا شمار گھر کے برتن بھانڈے، بھیڑ بکری اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ کیا جانے لگتا تھا

اور بالکل ان ہی چیزوں کی طرح انھیں بھی کسی اچھے گاہک کے ہاتھ فروخت کیا جا سکتا تھا۔
جن عورتوں کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا ان کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں تھی۔ انھیں اپنے شوہر کے مقابلے میں کسی قسم کا کوئی قانونی حق حاصل نہ تھا۔ زار روس کے شہری قانون میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کردی گئی تھی کہ "عورت کو ہر معاملے میں شوہر کی اطاعت کرنا چاہیے اور کبھی بھی اس کی نافرمانی نہیں کرنا چاہیے" (دفعہ ۱۰۷ جلد دہم) وہ اجرت پر کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتی تھی۔ (دفعہ ۲۲۰۲ جلد دہم) اگر کوئی عورت معلم، نرس یا ٹیلیگراف اپریٹر بن جاتی تھی تو شادی ہو جانے پر فوراً برطرف کردی جاتی تھی۔ شادی شدہ عورت کو عام طور پر پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا بلکہ شوہر کے پاسپورٹ پر بیوی کا نام درج کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ شوہر کے بغیر اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے اجازت حاصل کئے بغیر کہیں چلی جاتی تھی تو پولیس والے ایک مفرور قیدی کی طرح پکڑ کر گھر واپس پہنچا دیتے تھے۔ نہایت ظالم اور غیر موزوں شوہر سے بھی عورت کسی صورت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ شوہر اگر طلاق کے لئے رضامند بھی ہو جاتا تھا تب بھی یہ صورت ممکن نہیں تھی۔ تقریباً تمام کسان عورتیں اور شہر کی تین چوتھائی عورتیں ناخواندہ تھیں۔ ٹالسٹائی نے اپنے ڈرامے "تاریکی کی طاقت" میں روس کی دیہاتی عورت کی حالت کا نقشہ کسان میٹریش کی زبانی ان الفاظ میں کھینچا ہے "کسان کی عورت کیا ہے محض ایک نکمی اور ردی چیز۔ یہ نپٹ اندھی اور بہری ہے۔ یہ بالکل کچھ نہیں جانتی۔ اس نے کبھی کچھ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ ایک مرد تو کسی شراب خانہ یا جیل خانہ یا فوج میں جہاں اسے دوسرے آدمیوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے کچھ سیکھ بھی لیتا ہے لیکن ایک عورت سے کیا توقع کی جا سکتی ہے، کیا اسے کوئی پڑھاتا ہے؟ اس کو سکھانے والا تو بس ایک ہی ہوتا ہے یعنی وہ شراب میں مدہوش مزیک (کسان) جو اس پر اپنے کوڑے برساتا ہے اور یہی تعلیم کی وہ کائنات ہے جو اسے میسر آئی ہے۔"

غرض روس کی نصف بالغ آبادی کی حالت ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت کچھ اس قسم کی تھی۔

انقلاب کے ایک ہی سال بعد نومبر ۱۹۱۸ء میں سارے روس کی مزدور اور کسان عورتوں کی کانفرنس ماسکو میں منعقد کی گئی جس میں ۲۰۰۰ مندوبین شریک ہوئیں۔ یہ سوویٹ روس کی دس لاکھ مزدور عورتوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ عورتوں کے اندر انقلاب نے ایک حرکت پیدا کر دی تھی اور ان کی یہ تحریک آپ ہی آپ چل رہی تھی۔ روس میں عورتوں کی آزادی کی تحریک کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ عورتوں کی قانونی یا انتخابی نا اہلیتوں کو دور کیا جائے بلکہ ان کی معاشی اور خانگی ماتحتی کو دور کرنا بھی مساوی اہمیت رکھتا تھا، لینن نے ایک موقع پر کہا تھا " سوشلزم کی فتح اس وقت تک ناممکن ہوگی جب تک کہ انسانیت کا پورا نصف حصہ یعنی محنت کش عورتیں، مردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے سے معذور رہیں گی اور وہ گھر اور خاندان کے اندر غلاموں جیسی زندگی بسر کرتی رہیں گی "۔ یہی وجہ تھی کہ روس کے تمام قوانین اور عاملہ کے احکامات میں جنسی مساوات کو ایک بنیادی اصول قرار دیا گیا۔ چاہے عورت شادی شدہ ہو چاہے تنہا۔ ہر صورت میں رائے دہندگی کے معاملے میں اس کی اہلیت مرد کے مساوی تسلیم کی گئی۔ سرکاری عہدوں پر تقرری کے لئے اُسے مردوں کے مساوی موزوں سمجھا جانے لگا۔ وہ پوری آزادی کے ساتھ ٹریڈ یونین، کوآپریٹو سوسائٹی اور دیگر تمام انجمنوں کی رکن بننے لگی ایک ہی طرح کے کاموں کے لئے اُسے وہی معیاری اجرت دی جانے لگی جو مردوں کو دی جاتی تھی اور اُسے ہر قسم اور ہر درجے کی ملازمت اور روزگار کے لئے مردوں کے برابر موزوں سمجھا جانے لگا۔ شادی سے پہلے جن چیزوں پر اس کی ملکیت قائم ہوتی تھی، شادی کے بعد ان چیزوں پر اس کی ملکیت جاری رہتی تھی۔ شادی کے زمانے میں رشتۂ ازدواج کے دونوں فریق جو چیز بھی حاصل کرتے تھے اس میں دونوں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ شادی کو طلاق کے ذریعے ختم کرنے کے سلسلے میں عورت کو بھی وہی حقوق دیئے گئے جو مردوں کو حاصل تھے۔ شادی کے

زمانے میں جو اولاد پیدا ہوتی تھی طلاق کے بعد اس کی کفالت اور رشتہ ازدواج کے دونوں فریق میں سے جو بھی حاجت مند ہو اس کے نان نفقہ کی ذمّے داری مساوی طور پر قبول کرنا پڑتی تھی۔ ان تمام حقوق ہی کی بنیاد پر لینن نے ۱۹۲۰ء میں اس بات کا دعوےٰ کیا تھا کہ دنیا میں روس کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں عورت کو ان محرومیوں اور نا قابلیتوں سے جن کا وہ رسم ورواج یا قانون کی بنا پر شکار رہتی اتنے مکمل اور غیر مشروط طریقے پر آزاد نہیں کیا گیا جیسا کہ دول ہائے متحدہ اشتراکی روس میں کیا گیا ہے" قانونی طور پر مرد اور عورت میں مکمل مساوات قائم کردی گئی ہے اور ہر جگہ اس کو خلوص کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ عورتوں کو معاشری تنظیم قانون اور حکومت کے کام میں پوری طرح شریک کیا جارہا ہے۔ تمام درسگاہیں ان کے لئے کھلی ہوئی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی جماعتی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو ترقی دے سکتی ہیں۔ مشترک مطبخ، پبلک طعام خانے، دھوبی گھر مرمت کی دکانیں شیر خوار بچّوں کی پناہ گاہیں، کنڈر گارٹن، بچوں کے گھر اور ہر قسم کی دوسری درس گاہیں، قائم کی جارہی ہیں۔ روس اپنے پروگرام کی اس شق کو کہ ہر گھر کے جدا جدا معاشی اور تعلیمی فرائض جماعت کے مشترکہ انتظام میں لے آئے جائیں سرگرمی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عورت گھر کی غلامانہ مشقت اور مرد کی ماتحتی سے آزاد ہو جائے گی اور وہ اپنی قدرتی صلاحیتوں اور میلانوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھا سکے گی۔ بچوں کی پرورش بھی گھر کے مقابلے میں بہتر ماحول میں کی جانے لگی ہے۔ ہمارے ملک میں مزدور عورتوں کی حفاظت کے لئے جیسے قوانین ہیں دنیا میں ایسے کہیں نہیں ہیں۔ ٹریڈ یونین کے عہدہ دار قوانین کی تعمیل کراتے رہتے ہیں۔ زچگی کے ہسپتال، ماؤں اور بچوں کے لئے گھر۔ مادریت کی تعلیم گاہیں (جہاں عینی مشاہدوں سے ماں بننے کی تعلیم دی جاتی ہے) بچوں کی نگہداشت کے لئے لکچروں کا کورس ماؤں کو یہ سکھلانے کے لئے کہ اپنے بچوں کی اور خود اپنی خبر گیری کس طرح کرنی چاہئے نمائشیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں قائم کی جارہی ہیں۔ جو عورتیں بے روزگار یا بے سہارا ہیں ان کے

گذر بسر کرنے کے انتظامات کے لئے بھی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی جارہی ہے۔"[5]

یہ بیان تحریک کے آغاز کے وقت کا ہے لیکن اب تقریباً بیس پچیس برس گذرنے کے بعد جب ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آزادی کے نتائج نہ صرف عورتوں کی عملی آزادی کی صورت میں بہت شاندار برآمد ہوئے ہیں بلکہ اس کا اثر عورتوں کی دماغی اور جسمانی نشوونما پر بہت پسندیدہ ثابت ہوا ہے۔ اس دوران میں نہ صرف ان کی تندرستی اور طوالت عمر میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کے ذہنی کارنامے اور ہر شعبۂ زندگی میں ان کی کامیابیاں نہایت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہیں ۱۹۱۷ء میں عورتوں میں ناخواندوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا لیکن اب بالغوں میں بہت کم ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو کم از کم پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتے۔ مدرسوں میں لڑکیوں کا تناسب تقریباً اتنا ہی ہے جتنا کہ لڑکوں کا ہے۔ روس میں مزدوروں کی جو کمی نہ صرف صنعتوں اور ہلکی صنعتوں میں بلکہ زراعت اور وزنی صنعتوں میں پائی جاتی تھی عورتوں کے آزاد ہوجانے کی وجہ سے اس میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے۔

روس میں معلموں اور ڈاکٹروں کی فہرست میں عورتوں کی تعداد دو تہائی کے قریب ہے اور مخصوص طور پر تربیت یافتہ ماہرانِ زراعت میں ان کا تناسب بہت زیادہ ہے سائنس کی تحقیقات کے ہر شعبے میں ان کی اکثریت ہے۔ ان سند یافتہ صنعتی ماہروں میں جو پنج سالہ یونیورسٹی نصاب پورا کرتے ہیں۔ اور جنھیں سالانہ روز افزوں تعداد میں مشین سازی، مشین کیمیادی اور بجلی کے کارخانوں میں بھرتی کیا جاتا ہے، عورتوں کا تناسب تقریباً ایک تہائی ہے ریل چلانے والوں اور ریل کے انتظامی عملہ میں بھی اُن کی تعداد بہت خاصی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورتیں ہر پیشے میں کام کرتی ہوئی ملتی ہیں حتیٰ کہ فوج تجارتی بیڑہ اور ہوائی جہاز میں بھی عورتیں کام کرتی ہیں یہ سفارت کے کام پر بھی مامور کی جاچکی ہیں۔ وزیر مالیات بھی رہ چکی ہیں اور

---

[5] "سوویٹ روس کی عورتیں" از فینا ہیلے (۱۹۴۳) صفحہ ۹۶-۹۷

سینکڑوں عورتوں کو غیر معمولی خدمات کے صلے میں لینن کے تمغے اور سُرخ پرچم کے تمغے بھی عطا کئے گئے ہیں۔

روس کی عورتیں اور مادریت کی ذمہ داری | لیکن عورت کی اصلاح و ترقی کا کام صرف اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا کہ اُسے قانونی اور سیاسی بندشوں سے آزاد کر دیا جائے یا معاشی محرومیوں سے اُسے نجات دلادی جائے۔ عورت کے ذمے ایک مخصوص فریضہ عائد کیا گیا ہے جس کو نہایت زبردست پبلک اہمیت حاصل ہے اور اس کی انجام دہی میں اُسے نہ صرف اپنی تندرستی کو سخت خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے بلکہ سرمایہ دارانہ ملکوں میں اس کے مالی بوجھ سے بھی والدین کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ ان ملکوں میں محض زچگی اور شیر خوار بچے کی نگہداشت کے خرچ بعض وقت اتنے ہو جاتے ہیں کہ اُجرت پیشہ طبقہ ان کے بوجھ سے عمر بھر چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا اور مزمن افلاس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ صدیوں تک ایسے موقعوں پر نجی خیر و خیرات کے ذریعے امداد کی جاتی رہی۔ کہیں کہیں (مثلاً انگلستان میں) غربا کی امداد کے لئے جو سرکاری انتظامات تھے اور جن کے قبول کرنے کی وجہ سے آدمی اپنے ہم چشموں میں ذلیل اور کم حیثیت سمجھا جانے لگتا تھا ان میں اس امداد کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ موجودہ صدی میں بعض ملکوں نے اپنے معاشری بیمے کے قومی انتظامات میں زچگی کے زمانے کی ایک مختصر اور ناکافی امداد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ لیکن بالشوکوں کے یہاں ابتدا ہی سے حاملہ عورت کو سرکار کی طرف سے جملہ سہولتیں اور رعایتیں فراہم کرنا نہایت ضروری سمجھا گیا تاکہ وہ اپنے فرائض کو جو اس پر ماں، دولت آفریں کارکن اور شہری کی مختلف حیثیتوں سے عاید ہوتے ہیں حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔ جس طرح ایک مرد کو وہ تمام مصارف سرکار کی طرف سے ادا کر دئے جاتے ہیں جو وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے دوران میں اپنی طرف سے کرتا ہے۔ اسی طرح عورت کو بھی اپنے مخصوص فرائض منصبی یعنی بچہ داری کے ذیل میں جو غیر معمولی مصارف اُٹھانا پڑتے ہیں ان کی ادائی کی ذمے دار سرکار ہوتی ہے

اور سوویٹ سرکار کی طرف سے اس کے اس درد اور بے آرامی کے ساتھ جو اس سلسلے میں ناگزیر طور پر اُسے برداشت کرنا پڑتی ہے انتہائی ہمدردی کی جاتی ہے روس میں بچہ داری کے جملہ مصارف کو جہاں تک ممکن ہے مفوضہ فرائض منصبی کی انجام دہی کے مصارف میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

اگر کوئی عورت شہر یا دیہات میں اجرت یا تنخواہ پر یا تو خود ملازم ہوتی ہے یا اس کا شوہر ملازم ہوتا ہے اور وہ ماں بننے والی ہوتی ہے تو سوویٹ سرکار سب سے پہلے تو حمل کے زمانے میں اس کی طبی نگہداشت کا بلا معاوضہ انتظام کرتی ہے۔ پھر زچگی کے ہسپتالوں میں اس کا داخلہ کراتی ہے۔ ۱۲ سے ۱۶ ہفتے تک کی رخصت با تنخواہ دیتی ہے (یعنی ۶ سے ۸ ہفتے کی رخصت وضع حمل سے پہلے اور اتنی ہی مدت کی رخصت وضع حمل کے بعد) اس دوران میں طبی نگہداشت اور امداد کا مسلسل انتظام رکھتی ہے جب وہ طبی طور پر تندرست قرار دے دی جاتی ہے تو اپنی پرانی جگہ پر دوبارہ مقرر کئے جانے کی مستحق ہوتی ہے اور ہر ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اُسے بچہ کو دودھ پلانے کی مہلت دی جاتی ہے بچے کے کپڑوں کے لئے بھی اُسے روپیہ دیا جاتا ہے اور پہلے سال کے دوران میں بچے کی غذا کے لئے بھی ایک ماہانہ عطیہ دیا جاتا ہے اور بچوں کی سرکاری پرورش گاہ میں بچہ کے لئے جب تک اس کی عمر دو مہینے اور ۵ سال کے درمیان رہتی ہے ایک نشست محفوظ کر دی جاتی ہے تاکہ جب ماں کام کر رہی ہو تو سرکاری دایہ اس کے بچے کی نگرانی کرتی رہے۔ سوویٹ سرکار کی طرف سے ان تمام رعایتوں کا منشا یہ ہے کہ عورت ماں بننا ایک لعنت، مصیبت یا حقیر اور تکلیف دہ چیز نہ سمجھے بلکہ جتنا طبعی طور پر ممکن ہے ماں بننے کے بعد بھی ہر پیشے میں اُسے کام کرنے کی اتنی ہی آزادی حاصل رہے۔ اپنے کام میں اس کی دولت آفرینی کی اہلیت اتنی ہی زیادہ اور اس کی آمدنی اتنی ہی اچھی رہے جتنی کہ ماں بننے سے پہلے تھی۔

<u>بچوں کی نگہداشت</u> | روس میں ولادت سے لے کر کنڈر گارٹن یا ابتدائی مدرسے کے داخلے

تک بچوں کی نگہداشت کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا گیا ہے۔ یہ انتظام ابھی تک سارے ملک میں نہیں پھیل سکا ہے، لیکن تیزی کے ساتھ شہروں سے شروع ہو کر دیہاتوں میں پہنچتا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں بہ ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے ذمّے بچوں کی پوری دیکھ بھال سپرد کی گئی ہے۔ وہ انھیں غذا بھی کھلاتے ہیں، کپڑے بھی پہناتے ہیں۔ نہلاتے دھلاتے بھی ہیں۔ پڑھاتے بھی ہیں۔ تربیت بھی دیتے ہیں اور ان کی تفریح و دلبستگی کا بھی انتظام کرتے ہیں۔

ان اداروں میں سب سے اول تو "مرکز مشاورت" کا نمبر آتا ہے۔ جس کے فرائض میں ہر بچے والی ماں کو مشورہ دینا داخل ہوتا ہے۔ زچگی کے زمانے سے ان کے مشوروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر، نرسیں اور مشیر قانونی مستقل طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ دودھ کے مطبخ بھی ہوتے ہیں جہاں سے بچوں کو روزانہ دودھ کا راشن تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کو چھوڑنے سے باز رکھیں اور اگر اس میں وہ کامیاب نہ ہوں تو ان کے بچوں کے پالنے کا مناسب انتظام کریں۔ اس کام کے لئے سب سے پہلے تو وہ حاملہ عورتوں پر نگرانی رکھتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور ہمت بڑھاتے ہیں اور انھیں ضروری قانونی مشورے دیتے ہیں۔ اگر اس میں وہ ناکام رہتے ہیں تو پہلے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بچوں کو دوسرے لوگ گود لے لیں۔ جب یہ بھی ممکن نہیں ہوتا تو وہ ان مخصوص اقامت خانوں میں جو اسی کام کے لئے ان کی زیر نگرانی رکھے گئے ہیں۔ بچوں کو داخل کر لیتے ہیں۔

مرکز مشاورت کے بعد بچوں کی نگہداشت کے کام میں دوسری منزل یہ ہے کہ پرورش گاہوں (کریشز) کا انتظام کیا جائے جس میں دو مہینے کی عمر سے بچوں کی نگہداشت کی جانے لگتی ہے اس نگہداشت کی مختلف موقعوں پر ضرورت ہوتی ہے مثلاً جب اُن کی ماں اپنے کام پر جاتی ہے یا شام کے وقت کلب میں جاتی ہے یا تفریح کے لئے نکلتی ہے۔ ریل کے اسٹیشنوں اور

ریل کے ڈبوں میں بھی ان پرورش گاہوں کا انتظام رکھا جاتا ہے تاکہ سفر کرتے والی ماؤں کو اپنی اولاد کی وجہ سے کسی مخصوص زحمت اور دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس قسم کی پرورش گاہیں روس میں بہت زیادہ ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ ماں کو جہاں تک ہو سکے بچوں کی مسلسل نگہداشت کے سخت اور جاذب توجہ کام سے آزاد کیا جا سکے۔ چنانچہ جہاں کہیں اس قسم کی پرورش گاہیں موجود ہیں وہاں دن کے کم از کم ایک تہائی حصے کے لئے ماں اپنے بچے کی ذاتی نگہداشت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اور ان پرورش گاہوں کا خرچ اسے خود برداشت نہیں کرنا پڑتا بلکہ سرکار ان کا انتظام کرتی ہے

مشاورت کے مرکزوں، دودھ کے مطبخوں اور پرورش گاہوں کے علاوہ ملک کے اندر آیہ خانوں، گہوارے کے مدرسوں اور کنڈرگارٹنوں کا بھی ایک جال بچھا ہوا ہے جو روز بروز زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ ان سب انتظامات کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری سے بڑی حد تک کپڑے کی ذمہ داری سے ایک جزئی حد تک اور طبی نگہداشت کی ذمہ داری سے مکمل طور پر والدین بچے کی پیدائش سے لے کر سات آٹھ برس کی عمر تک بڑی حد تک بری ہو گئے ہیں اور یہ کام سرکار نے خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ لیکن یہ ذمہ داری اس ... گئی ہے کہ بچوں کو اپنے گھر اور اپنی ماں کی ذاتی نگرانی سے علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ لوگوں میں امداد اور خیرات کا کوئی باعث ذلت احساس پیدا نہیں ہونے دیا گیا ہے اور نہ لوگوں میں والدین کی ذمے داری کو کسی طرح کم کیا گیا ہے۔ خانگی زندگی کی یک جہتی اور آزادی میں اگر اس کی وجہ سے کوئی خرابی یا ابتری پیدا ہوئی ہے تو وہ بلا شبہ اس سے کم ہے جتنی کہ سرمایہ دار ملکوں میں طبقہ متوسط یا طبقہ اعلیٰ کے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

انضباط تناسل روس کی شرح پیدائش اور شرح اضافہ آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں مانع حمل طریقوں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہوگی لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے روس میں انضباط تناسل کی اختیاری کوششیں ہالینڈ، آسٹریلیا، فرانس، جرمنی، انگلستان

اور امریکہ سے بھی کم کی جاتی ہیں۔ وہاں ماں بننا اور بچے رکھنا ایسی مصیبت نہیں ہے جیسی کہ دوسرے ملکوں میں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں مانع حمل طریقوں کو استعمال کرنا یا ان کے بارے میں گفتگو کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ بلکہ صورت اس کے برعکس ہے۔ شہروں میں اس موضوع پر نوجوان اور بوڑھے آزادی سے بحث کرتے ہیں۔ تعلیمی پوسٹروں اور طبی مشوروں میں بھی اس کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے "مشورہ کی چوکیوں" سفری ہسپتالوں اور کلینک میں اس کے بارے میں ہدایت اور تعلیم کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا ہے اور لوگ اس سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اور اس معاملے میں جو بے تکلفی اور آزادی پائی جاتی ہے اس کو بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

غرض عورتوں اور بچوں کے لئے روس میں بہتر حالت پیدا کرنے کی یہ کوششیں ہیں جو کی جا رہی ہیں۔

دلی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

ضمیمہ

لاہوری برادری کے ممتاز لوگوں کا تعارف | لاہوری برادری صناع برادری ہے۔ صنعت میں جو لوگ نامور ہیں وہی برادری کے ممتاز آدمی ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کا شمار اہل ثروت میں ہے یا نہیں اس لئے یہاں پر ہم صنعت کے صرف ان ماہروں کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے کمال ہنرمندی میں ساری برادری میں ممتاز ہیں۔ علمی پیشوں اور ملازمت کے پیشے کے ماتحت چند نام خانہ پری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح مرحوم صناعوں کے نام محض حوالے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

ڈزائنر عبدالرؤف صاحب، پہاڑ گنج زیورات کے نمونوں کا نقشہ بنانے میں مشہور ہونہار کاریگر ہیں اور تمام ہندوستان کے جوہری ان سے رجوع کرتے ہیں۔

انگریزی | منشی ممتاز الدین صاحب، پہاڑ گنج۔ انگریزی نگ (جپائی) میں انگریزی وضع کے کام کے استاد ہیں۔

سادہ کار، متعلقہ صنعتوں کے ساتھ | (۱) چودھری محمد یوسف صاحب، کوچہ رائے مان۔ اُن کے بزرگ قلعہ دہلی میں کام کرتے رہے۔ یہ شاہی صناع کہلاتے ہیں۔

۲۔ محمد اصغر صاحب، کوچہ تاجار مشہور سادہ کار اور جوہری ہیں متمول اور برادری میں بااثر ہیں

۳۔ حاجی حبیب احمد صاحب، پہاڑ گنج۔ اعلیٰ درجے کے سادہ کار ہیں۔ ضمنی خصوصیات شکار کی بے مثل مہارت ہے جو باپ دادا سے ورثے میں چلی آتی ہے۔ یہ برادری کے ممتاز چودھری ہیں۔

(۴) عنایت الرحمٰن صاحب ، پہاڑ گنج ۔ نامور اور اعلیٰ درجے کے استاد ہیں ۔ ان کے والد مرحوم کو اُن کے صنعتی کمال کے اعتراف میں امیر حبیب اللہ والی کابل نے ۲۰۰ ماہوار وظیفہ دیا اور افغانستان سے کچھ کاریگر اُن سے سادہ کاری سیکھنے کے لئے بھیجے تھے

(۵) سعادت اللہ ، باڑہ ہندوراؤ ۔ بڑھیا سادہ کاروں میں ان کا شمار ہے ضمنی صنعت فن آتش بازی میں ان کو کمال مہارت ہے ۔ شاہی زمانے کی صنعت آتش بازی میں بے نظیر ہیں

(۶) نیاز احمد عرف نیازی ۔ صدر بازار ۔ گلٹ اور چاندی کے کام کے مانے ہوئے کاریگر ۔ فنِ بیراکی کے زبردست استاد ہیں ۔ ہندوستان کے سینکڑوں نامی پیراک ان کے شاگرد ہیں ۔

مذکورہ بالا ماہرین صنعت کے علاوہ مندرجہ ذیل سادہ کار بہت مشہور کاریگر ہیں :۔ الطاف احمد ، سادہ کار ، پہاڑ گنج ۔ حافظ عبدالعلیم سادہ کار ، پہاڑ گنج ۔ محمد احمد عرف محمد سادہ کار جمیل الرحمٰن ، امین الرحمٰن سادہ کاران ۔ اخلاق احمد ، سادہ کار ۔ فخر الدین ، سادہ کار ۔

مصور | استاد عبدالکریم مرحوم ۔ عبدالحمید مرحوم (پہاڑ گنج) اور محمد حسین مرحوم (کوچہ نٹوں) پچھلے برسوں میں مشہور ہند استاد مصور رہے ہیں ۔ ہاتھی دانت کی پلیٹ پر تصویر بنانے کے کام میں یہ دہلی کے سب سے بڑے استاد تھے ۔ ریاستیں ان کی سرپرستی اور قدر افزائی کرتی تھیں ۔ ان کے کام کے بعض نمونے آگرہ اور دہلی کے قلعہ کی آرٹ گیلری میں دیکھے جا سکتے ہیں ان اساتذہ فن کے انتقال کو کچھ ہی سال گذرے ہیں ۔ موجودہ نسل کے نامی مصور مندرجہ ذیل ہیں اور خاص شہرت رکھتے ہیں :۔

(۱) محمد ظفر صاحب نبیرہ مشہور استاد محمد فضل مصور ۔ احسن خاں صاحب مصور ۔

نقاش | عبداللہ نقاش اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نقاش مشہور طلاکار نقاش رہے ہیں دونوں کا انتقال ہو گیا ہے ۔ حبیب الرحمٰن نقاش برادری کے نہایت ممتاز اور مشہور ہنر

نقاش تھے۔ افسوس ہے چند برس پہلے وہ جوان موت مر گئے۔ ان کی اعلیٰ درجے کی گل کار نقاشی اور طلاکاری کے نمونے دہلی کے لال قلعے۔ سلطان نظام الدینؒ کے آستانے کی دیواروں اور وائسرائے ہاؤس دہلی کے ایوان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ صنعت لاہوریوں کی خصوصیت تھی لیکن اس صنعت کے کمال کا مالک کوئی لاہوری کاری گر اب نظر نہیں آتا۔ بظاہر یہ صنعت لاہوریوں سے اب ختم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

پیتل کی صنعت، ظروف سازی | خلیفہ نثار احمد صاحب، پہاڑ گنج۔ برنجی ظروف سازی میں تمام دہلی میں ممتاز ہیں۔ سینکڑوں اس صنعت میں ان کے شاگرد ہیں۔ یہ برادری کے چودھری ہیں۔

استاد سراج الدین، محلہ گڑھیا، ظروف سازی میں باکمال استاد ہیں۔ مذکورہ بالا استادوں کے علاوہ پیتل اور چاندی کی صنعت ظروف سازی اور چاندی کے بڑے کام میں مندرجہ ذیل کاری گر ممتاز ہیں:۔

محبوب بخش صاحب۔ نور احمد صاحب۔ بشیر الدین صاحب، حفیظ احمد صاحب عمر فاروق صاحب۔ شیخ نیاز الدین صاحب۔ آخر الذکر کیمسٹری اور سائنس کے نازک اور پیچیدہ آلات بنانے میں مشہور کاری گر ہیں۔

گھڑی ساز | عبدالحیٔ صاحب، کوچہ رائے مان۔ دہلی کے تمام گھڑی سازوں میں سب سے بڑے استاد ہیں۔

لوہے اور مشین اور موٹر وغیرہ کے مستری | محمد صدیق۔ محمد ابراہیم کاکران۔ محمد یامین، کٹرہ بڑیاں۔ عبدالحمید، عبداللطیف (انبالہ) مستری محمد ہاشم، محمد قاسم، محمد اعظم نامور لوگوں میں ہیں۔ آخر الذکر اعلیٰ درجے کے الکٹریشن اور مشینی کاموں کے بہت مشہور ماہر ہیں۔۔۔ پیتل اور لوہے کی صنعتوں کے مذکورہ استاد جدید ترصنعتی اشیاء بالکل ولایتی اشیاء کے مقابلے میں بنانے میں مانے ہوئے کاری گر ہیں۔ چنانچہ برادری کے

کاری گردن نے بلو لیمپ، اسپرٹ اسٹوو، سیفٹی ریزر، سائیکل کے پرزے بڑی مشینوں اور آلات کی مدد کے بغیر تیار کئے ہیں اور بازار میں بہت مقبول ہیں۔

مہرکن | چودھری ظہیرالدین صاحب نبیرہ استاد بدرالدین مہرکن کے علاوہ مندرجہ ذیل مہرکن اپنے کام کے اچھے کاریگر ہیں۔

عبدالرحمن صاحب، ضمیرالحق صاحب، محمد بشیر صاحب۔

لکڑی کے خرادی | محمد سلطان صاحب، خراد کے کام کے مشہور کاریگر ہیں۔

نعل بند | مغل صاحب (کشمیری دروازہ) استاد نعل بند ہیں۔

شمشیر ساز، بندوق ساز | بشیر احمد صاحب جاگیر دار اور مشہور ماہر شمشیر سازی ہیں محمد عثمان صاحب (سبزی منڈی) بندوق سازی اور متعلقہ کاموں کے ماہر ہیں۔

ٹھپے ساز | لاہوریوں کی یہ نہایت اہم مگر گمنام صنعت ہے۔ اللہ بخش قلب ساز اس فن میں دور دور جواب نہیں رکھتے تھے۔ اب اُن کے بیٹے محمد فاروق صاحب (پہاڑ گنج) اس کام کے اچھے کاریگر ہیں۔

زیور فروش، سادہ کار MANUFACTURING JEWELLERS | محمد احمد صاحب، دریبہ کلاں۔ فیض محمد صاحب، محمد سلطان صاحب سعیدالرحمن صاحب۔ عنایت الرحمن صاحب۔

تاجر | سعیدالحسن، نورالحسن۔ صدر بازار۔ فیاض الدین، سلیم الدین۔ حاجی عبدالغفار عبدالستار صدر بازار۔ محمد اسحٰق، امپورٹ اکسپورٹ ایجنٹ

دفتر کے ملازم | محمد ظفر صاحب، عبدالعلی صاحب، محمد ادریس صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب بی اے۔ عنایت احمد صاحب بی اے۔ حافظ ضمیرالدین صاحب بی اے

ڈاکٹر | رفیق الدین صاحب۔ ایم، بی، بی ایس (کوچہ استاد حامد) کلینک انچارج، ٹی بی ہسپتال، دہلی۔

وکیل | رشید احمد صاحب بی اے، ایل، ایل، بی، ایڈووکیٹ (کوچہ نٹواں)

شاعر | محمد حسن صاحب صوفی، کوچہ نٹوان۔ انھوں نے درویشی اختیار کرلی ہے کلام میں پختگی، سادگی اور سوز و گداز کی کیفیت ہے۔

حوالہ | مضمون میں ہم نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کی سند ہم کسی ذمے دار شخص یا کتاب سے نہ دے سکیں۔ مضمون کے دوران میں البتہ گنجلک سے بچنے کے لئے حوالے نہیں لکھے گئے۔ اس لئے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

راقم نے معلومات فراہم کرنے میں اپنے برسوں کے مشاہدے کے علاوہ لاہوری برادری کے بزرگوں سے مدد لی ہے۔

غیر ملکی کتابوں میں اس برادری کا حال تو کیا ملتا، زیور سازی کی صنعت کے ذکر میں بھی ہماری تلاش فی الحال بے نتیجہ رہی۔ لی بان کی کتاب تمدن ہند مترجمہ سید علی میں اس عظیم صنعت پر چند سطریں لکھی ہیں۔ اس میں زیور سازی کے کمال کا سہرا ہندو صناعوں کے سر رکھا ہے اور مسلمانوں کا نام تک نہیں لیا۔ سائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۱۱ء) میں البتہ (Jewellery) کے ذیل میں سادہ کاروں کی صنعت کے کمال کا اعتراف کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ انگلستان میں زیور سازی کے عظیم الشان مشینی کارخانوں کی صنعت کا ماخذ ہندوستانی صناع ہے جواب بھی باوجود بے سروسامانی ولایتی پرزے کے جواب میں اپنی مہارت کا کمال پیش کرتا ہے۔

اردو کتابوں میں صرف دو کتابیں ہیں جن میں برادری کا ذکر ضمناً چند سطروں میں اور اس کی صنعت کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ پہلی کتابوں میں سید یوسف بخاری دہلوی کا مجموعۂ مضامین بازگشت ہے جس میں دلّی کی سادہ کاری اور مہرکنی پر مضامین ہیں۔ یوسف صاحب کے مضمون کا ذکر ہم اپنے مضمون میں لفظ سادہ کاری کی بحث میں کرچکے ہیں۔ انھوں نے خلوص اور محنت سے مضمون لکھا ہے۔ نیارے کو بھی انھوں نے لاہوریوں میں شامل کردیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ لاہوری برادری والے کو نیاریا بھی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے

ہم کسی ماہر سرحق کو خیال کریں کہ یہ اچھا یکر قصاب بھی ہو سکتا ہے نیارا سادہ کاری کارخانوں کے اس کوڑے کو کہتے ہیں جس میں چاندی سونے کے ذرات ملے ہوتے ہیں۔ نیاریا دہ کاری گر ہے جو اس کوڑے کو کئی دن ناند میں بھگو کر اور بیسیوں بار چھان نتھار کر جو مرکب دھات نکلے اسے کٹھالی میں آگ پر رکھ کر کیمیادی مسالوں سے سونا چاندی الگ کر لیتا ہے۔ نیاریا یہ کوڑا کبھی تخمینی قیمت ادا کر کے خود خرید لیتا ہے کہ جتنا سونا چاندی اس میں نکلے اس کی قسمت کبھی سادہ کار اُسے مزدوری اور برآمد سونے کی کوئی کسر بطور انعام دیتا ہے۔ نیارے کی آمدنی سے کارخانے میں لازماً مٹھائی بانٹی جاتی ہے، کچھ حصہ کاریگر ، کو نقد ملتا ہے اور بڑا حصہ مالک سادہ کار خود رکھ لیتا ہے —— یہ نیاریا ہرگز لاہوری برادری کا نہیں ہوتا۔ دلی کے ادنیٰ طبقوں مثلاً برف والوں میں سے ہوتا ہے اور اکثر ہندو ہوتا ہے —— سادہ کار جو سونے چاندی کی کھوٹ تیزابی اعمال سے الگ کرتا ہے وہ ایک مختصر کام اور سادہ کاری کا ضمنی عمل ہے۔ اسے تصفیہ کہئے اور سادی اصطلاح میں سودھنا کہئے۔ بہر حال یہ سودھنا کئی من کوڑے میں سے نہیں ہوتا بلکہ کھوٹے سونے یا کھوٹی چاندی کی ڈلی میں سے ہوتا ہے! بحیثیت مجموعی یوسف صاحب کا مضمون داد کا مستحق ہے۔

دوسری کتاب انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ کتاب فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ہے جو ظفر الرحمٰن صاحب کی تالیف ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں زیور سازی کی اصطلاحات اور اوزاروں کے نام لکھے ہیں۔ یہ بہت مفید اور خاصی مکمل فہرست ہے۔ سادہ کاری سے متعلق فنی اصطلاحات اور اوزاروں کے نام ہم اپنے مضمون میں دینا چاہتے تھے۔ لیکن فرہنگ اصطلاحات کے ہوتے ہوئے یہ طول عمل ہے۔ البتہ فرہنگ میں اصلاح و ترمیم کی ابھی گنجائش ہے۔ بہت سے اوزاروں کے نام انھوں نے نہیں لکھے۔ بہت سی اصطلاحیں خود کام کے سلسلے کی نہیں لکھیں۔ بہت سی چیزیں غلط لکھی ہیں، مثلاً لاہوری برادری کو

کے بارے میں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ پرداز کو پرتاج لکھا ہے اور لطف یہ کہ اُسے پر اور تاج سے مرکب بتایا ہے۔ حالانکہ دلّی کا مسلمان سادہ کار کبھی پرتاج نہیں کہتا۔ سب پرداز کہتے ہیں۔ پھر یہ لفظ فارسی اردو تمام قدیم وجدید لغتوں میں نہایت صراحت کے اپنے اصطلاحی معنوں کے ساتھ لکھا ہوا موجود ہے۔ اس کا مصدر پرداختن ہے۔ جس کے معنی مکھنا، لینا، سنوارنا، نقش بنانا وغیرہ ہیں۔ سادہ کار کے ٹھیے یعنی کونڈے میں لکڑی کا جو پایہ (کلّا) لگا ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ایک چھوٹی سی لکڑی ہوتی ہے جس پر زرہ رکھ کر سادہ کار کام کرتا ہے، اس لکڑی کو کوئی سادہ کار باڑ نہیں کہتا۔ اس کا نام بینی ہے۔

مندرجہ بالا دو کتابوں کے علاوہ بہت سی ضمنی معلومات کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل کتابوں کو سامنے رکھا ہے۔

۱۔ آثار الصنادید — سرسید — ۱۸۴۹ء — لاہوری صناعوں کا ذکر

۲۔ مرأت الاشباہ — حکیم احسن اللہ خاں محمد مرتضیٰ خاں — ۱۸۵۰ء / ۱۸۶۳ — " "

۳۔ دریائے لطافت — انشاء اللہ خاں — دہلی میں لاہوری برادری کے محلے کا ذکر

۴۔ مسلمانوں کی صنعت وحرفت — فان کریمر، ترجمہ مولوی جمیل الرحمٰن — ۱۹۳۲ء — عراق میں سونے چاندی کی صنعت کا عروج

۵۔ بادشاہ نامہ — ملا عبدالحمید لاہوری — ۱۶۳۸ء — سادہ کار کا ذکر (بحوالہ معین الآثار)

۶۔ عمل صالح — محمد صالح — ۱۶۴۸ء — لاہوری مہنہوں کا ذکر

۷۔ معمارِ تاج (مضمون) — عبداللہ چغتائی (بحوالہ معین الآثار) (در رسالہ کارواں لاہور) — ۱۹۳۴ء — " "

۸۔ لاہور کا ایک مہندس خاندان — مولانا سید سلیمان ندوی " — " " "

۹۔ لاہوری برادری کا شائع کردہ متفرق لٹریچر (حسبِ اطلاع مضمون معمارِ تاج) اور رسالوں کے فائل۔

پہاڑ گنج، دہلی

مختار احمد جامعی

حالاتِ حاضرہ[1]

مابعد جنگ

جنگ کے بارے میں بہت گفتگوئیں ہو رہی تھیں، منصوبے بنائے جا رہے تھے، تیاریاں کی جا رہی تھیں، لیکن کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ "مابعد جنگ" اس قدر جلد آ جائے گا۔ یہ ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا ہے اور اس کے مسئلے جتنا خیال تھا اس سے زیادہ پیچیدہ نظر آ رہے ہیں۔

جن ملکوں میں جنگ لڑی گئی ہے یا جو مختلف قسم کے بموں کا شکار رہ چکے ہیں وہاں تباہی براہ راست پھیلی ہے اور ان کے بہت سے شہروں، صنعتوں، بندرگاہوں، ریلوں، پلوں، نہروں، پشتوں، بندوں، جہازوں اور رہنے کے مکانوں اور گھر کے ساز و سامان وغیرہ وغیرہ کو از سرِ نو تعمیر کرنا ہے۔ ایک ماہر نے صرف یورپ کی جنگ میں ملکیت کا جس قدر نقصان ہوا ہے اس کا تخمینہ ایک کھرب دس ارب ڈالر کیا ہے۔ اگر محض یورپ کو جنگ سے قبل کی حالت پر دوبارہ واپس لانا ہے تو اس نقصان کی تلافی ضروری ہے پھر یورپ کے علاوہ ملکیت کا جو نقصان چین، جاپان، جنوب مشرقی ایشیا، برہما وغیرہ میں ہوا ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے۔

مرمت، تجدید یا قائم مقامی کے اس کام کی تین مختلف شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کام فاتح اقوام کو خود اپنے ملکوں اور اپنے مقبوضات میں کرنا ہے، دوسرے ان ملکوں میں جو دشمن کی غلامی میں آ گئے تھے اور جنھیں اب آزاد کر دیا گیا ہے اور تیسرے مفتوح اقوام کے ملکوں میں۔ ظاہر ہے پہلا کام سب سے مقدم ہے۔ اس کے بعد دوسرے کا نمبر ہے اور سب سے آخر میں تیسرے کام کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔ پہلی نظر میں اس آخری کام کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑے سے غور و تامل سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب تک فاتح اقوام اس کام کو بھی انجام نہیں دیں گی وہ نہ تو مفتوح اقوام

[1] اس مضمون کے علاوہ اس رسالے کے باقی تمام مضامین آج سے دو مہینے پہلے مرتب کئے جا چکے تھے اور یہ مضمون ۲۰ اگست ۱۹۴۵ء کو لکھا جا رہا ہے۔ (مدیر)

سے کوئی تاوان وصول کر سکیں گی نہ اپنی اور تمام دنیا کی صنعت و تجارت کو پوری طرح ترقی دے سکیں گی اور نہ چین و آرام سے بیٹھ سکیں گی۔

روس کے علاوہ یورپ کے جتنے ملک جنگ میں شریک رہے ہیں۔ ان سب کی معیشت میں ملکی اور خارجی تجارت کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کی زندگی کا تمام تر دار و مدار نقل و حمل، درآمد و برآمد، خرید و فروخت اور اعتبار و بنک کاری کے اوپر تھا۔ یہ سب کچے مالوں اور غذا کے سامانوں کی ایک بہت بڑی مقدار باہر سے درآمد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء سے پہلے فاتح اور مفتوح ملکوں کو چھوڑ کر محض یورپ کے آزاد کردہ ملکوں کی درآمد کا تخمینہ چودہ کروڑ دس لاکھ ٹن سالانہ کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں امریکہ کی درآمد اسی زمانے میں صرف ڈیڑھ کروڑ سالانہ کے درمیان رہتی تھی یہی حال ان ملکوں کی برآمد کی تجارت کا تھا۔ درآمد کی ادائی بڑی حد تک برآمد کے ذریعے ہو جاتی تھی اور جو تھوڑی کسر رہ جاتی تھی وہ سیاحوں کے خرچ۔ جہازوں کے کرایہ اور غیر ملکوں میں لگے ہوئے سرمایہ کے سود سے پوری ہو جاتی تھی۔

جب ان ملکوں پر جرمنوں نے قبضہ کیا تو یہ اپنی سابقہ درآمد سے محروم ہو گئے۔ لیکن جرمنوں کے "نئے نظام" نے ایک حد تک اُن کے اس نقصان کی تلافی کی اور یورپ بڑی حد تک اپنی ضرورتوں کی تکمیل خود اپنے وسائل سے کرنے لگا۔ اس سے ان ملکوں کی زندگی کا معیار پست ضرور ہو گیا لیکن اس پست سطح پر اس کے اندر خاص استحکام اور ثبات پیدا ہو گیا۔

لیکن اتحادیوں کی فتح کے بعد ان ملکوں کی زندگی میں دوبارہ ابتری پیدا ہوئی اور اس مرتبہ کی ابتری نہایت سخت اور جاں گسل ہے۔ ان ملکوں کی حالت کا نقشہ حسب ذیل طریقے پر کھینچا جا سکتا ہے:-

(۱) نئے نظام کی تباہی جس کی وجہ سے جرمنی سے درآمد کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے کچے مال درآمد کرنے کا کوئی دروازہ نہیں کھلا ہے۔

(۲) ہر قسم کی نقل و حرکت اور رسل و رسائل کی مسدودی کیونکہ ملیوں، سرنگوں اور ریل کی لائنوں کو یا تو اتحادیوں نے تباہ کر دیا ہے یا جرمنوں نے۔

(۳) اس لئے ہر ملک اپنے وسائل پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے۔ کارخانے کچے مالوں کے جمع کئے ذخیروں پر چل رہے ہیں اور جب اس کے کچھ حصے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں تو کارخانوں کا چلنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ اور تدریجی طور پر بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

(۴) زر کی مشکلات بھی کسی نہ کسی شکل میں رونما ہو رہی ہیں جن کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ محصول وصول کرنے میں دشواری ہے۔ استعمال کی چیزوں کی رسد کی کمی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اتحادی فوجوں کی بڑی تعداد کی موجودگی کی وجہ سے افراط زر کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ یہ فوجیں جنگ کے سلسلے میں بھی غیر محدود قوت خرید سے کام لے رہی ہیں اور ان کے سپاہی انفرادی طور پر بھی نجی خرچ زیادہ کر رہے ہیں۔

(۵) ہر قسم کی روشنی، قوت محرکہ اور گرمی پہنچانے والے ذرائع کی قلت رسد۔

(۶) غذا کی قلت، چور بازاروں کی کثرت اور غذا اور سامان کی گرانی۔

(۷) بندرگاہوں میں سامان کو اتارنے، چڑھانے اور رکھنے کی دشواریاں۔

(۸) سمندر پار کے ملکوں سے، سونے یا مبادلات خارجہ کے ذخیرۂ محفوظ یا تجارتی قرضوں کے بغیر خریداری کا عدم امکان اور

(۹) ان سب سے زیادہ یہ بات کہ چونکہ اتحادی قبضہ کی ابتدائی منزلوں میں تمام طاقت اتحادی کمانڈران چیف کے ہاتھ میں تھی اس لئے وہ حالات موجود نہیں تھے جن میں ملک کی کوئی حکومت چاہے اس کا خیال، رجحان اور سیرت کیسی ہی کیوں نہ ہوتی۔ کسی قسم کا کوئی معاشی منصوبہ بنا سکتی تھی۔

غرض آزاد کئے ہوئے ملکوں میں ہر جگہ ایک غیر زبان بولنے والی فوج کا قبضہ۔ جنگ کی شدید غارت گری، ناکافی اور گراں غذا، غیر معمولی طور پر سخت سردی، ناکافی کوئلہ، نقل و حمل کے ذرائع کا فقدان، ضروری کچے مالوں کی نایابی اور اضافہ پذیر بے روزگاری کا دور دورہ جاری ہے۔

مفتوحہ ملکوں کا حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ان کا مستقبل مکمل تاریکی میں ہے اور وہ فاتحوں کے رحم وکرم پر ہیں۔

فاتح ملکوں میں انگلستان میں رہنے کے مکانوں کی سخت قلت ہے۔ بندرگاہوں کی تباہی اور جہازوں کی کمی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ روس اور چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں بھی بڑی زبردست تباہی ہوئی ہے۔

ان سب ملکوں کی نظر امریکہ کی امداد پر ہے۔ اگر امریکہ امداد دے سکا تو ان کا کام آسانی سے چل سکے گا۔ ورنہ تجدید ومرمت کے کام میں بڑی دیر اور مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے براہِ راست تباہی تو تقریباً بالکل نہیں ہوئی ہے، لیکن ہماری معاشی زندگی پر اس کا بڑا انقلاب انگیز اثر پڑا ہے۔ چار پانچ سال سے برابر ہندوستان کی حیثیت "مشرق کے اسلحہ خانے" کی سی رہی ہے۔ اس کو اپنے پورے وسائل جنگ کے سامان فراہم کرنے میں لگا دینا پڑے ہیں۔ ہندوستان کے لاکھوں آدمی فوج میں براہِ راست بھی بھرتی ہوئے اور اس سے بہت زیادہ تعداد میں جنگی کارخانوں، مدافعت کے دوسرے کاموں اور جنگ کے مختلف محکموں اور دفتروں میں کام کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں حکومت ہند اور حکومت برطانیہ نے جنگ کے پانچ سالوں میں مدافعت کے کام پر تقریباً ۲۸ ارب روپیہ خرچ کیا ہے اور اس خرچ نے ہماری معاشی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اب کہ جنگ ختم ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے یہ خرچ باقی نہیں رہ سکے گا اور اس کی کمی کے ساتھ ساتھ ہماری معاشی زندگی میں بھی ابتری کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

حکومت ہند کو اس بات کا پہلے سے خیال تھا اور اس کی پیش بندی کرنے کے لئے اس نے سنہ ۱۹۴۳ء سے مابعد جنگ کی تعمیر نو کے مسائل پر غور وتوجہ شروع کردی تھی۔ اس کام میں برابر ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ اب تعمیر نو اور منصوبہ سازی کا ایک مستقل محکمہ وجود میں آگیا ہے۔ وائسرائے کی عاملہ کی تعمیری کمیٹی نے ترقیاتِ مابعد جنگ کے بارے میں نومبر ۱۹۴۳ء میں جو رپورٹ

شائع کی تھی اس میں تجدید و مرمت کے ان کاموں کو جنھیں جنگ کے ختم ہونے کے بعد فوراً کرنا ہوگا حسب ذیل عنوانات کے ماتحت تقسیم کیا تھا:۔

(۱) مدافعت کی خدمات سے برطرف کئے ہوئے لوگوں اور جنگی صنعت وغیرہ سے خارج کئے ہوئے مزدوروں اور ملازموں کو امن کے زمانے کے کاموں میں لگانا اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام کرنا۔

(۲) زائد فوجی ذخیروں، سامانوں، زمین اور عمارتوں کو نظم و ترتیب کے ساتھ فروخت کرنا

(۳) صنعت کو جنگ کے کام سے امن کے کام میں منتقل کرنا۔

(۴) نگرانیوں کا امن کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ختم کرنا یا ان میں ضروری ترمیم کرنا

لیکن اس رپورٹ کے لکھتے وقت بلکہ آخر وقت تک جنگ کے اس قدر جلد ختم ہونے کی کسی کو اُمید نہیں تھی۔ اس لئے اندیشہ یہ ہے کہ حکومت اپنی تعمیری اسکیموں کو ابھی تک مکمل نہیں کر پائی ہے۔ اس کے علاوہ وہ حالات جو تعمیر و ترقی کی کوششوں کے لئے سازگار ہو سکتے تھے وہ بھی ابھی تک پیدا نہیں کئے گئے ہیں یعنی نہ تو قومی حکومت کی ابھی تک تشکیل ہو سکی ہے اور نہ ہندوستان کے آئینی تعطل کو ابھی تک دور کیا جا سکا ہے۔ اگرچہ شملہ میں رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کر کے اور مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے انتخابات کا اعلان کر کے وائسرائے نے اس کی جانب صحیح قدم ضرور اُٹھایا ہے لیکن اس کارروائی کی تکمیل میں بہت دیر لگے گی، اور اس اثناء میں لوگوں کی پریشانی اور مصیبت کا جاری رہنا لازمی سا معلوم ہوتا ہے۔

غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور دنیا کو امن کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ابھی بہت کافی انتظار کرنا پڑے گا۔

اِعلان

ہندستانی اکیڈمی یو۔ پی الہ آباد کی مجلس عاملہ نے اردو کی مطبوعہ کتابوں پر پانسو روپئے سالانہ انعام دینے کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ

۱۔ ہر سال مندرجہ ذیل مضمونوں میں سے ایک پر سلسلہ وار انعام دیا جایا کرے گا۔

(الف) شعر اور ڈراما۔

(ب) ناول اور مختصر افسانے

(ج) مضامین (عام اور انتقادی)

(د) تاریخ اور حیات گرامی

(ہ) فلسفہ

(و) نیچرل سائنس

۲۔ انعام ۱۹۳۵ء میں شعر اور ڈراما کی کتابوں پر دیا جائے گا۔

۳۔ شعر اور ڈراما کی صرف ان کتابوں پر غور کیا جائے گا جو ۳۱ مارچ ۱۹۳۳ء کے بعد شائع کی گئی ہیں۔

پبلک اہل علم حضرات اور تابعین و ناشرین سے درخواست ہے کہ ہندستانی اکیڈمی کو مندرجہ بالا تاریخ کے بعد شائع شدہ شعر اور ڈراما کی کتابوں کے متعلق تفصیل سے مطلع فرمائیں تاکہ ابتدائی انتخاب کے وقت ان پر غور کیا جا سکے، اور منتخب کتابوں کے متعلق ججوں کی کمیٹی فیصلہ کر سکے۔

منیجر ہندوستانی اکیڈمی۔ الہ آباد

سجاد حیدر یلدرم

ہما خانم — سجاد حیدر یلدرم کا نام اُردو ادب میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ تو تو ان کے طرزِ نگارش کی تقلید کی گئی اور ان کی کتاب "خیالستان" کو پڑھا گیا اور سر دُھنا گیا۔

"ہما خانم" میر حجازی کے ایک فارسی ناول کا ترجمہ ہے سجاد حیدر یلدرم کے قلم نے اس میں کچھ خوبیوں کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ حجازی کے بانکپن اور یلدرم کی شوخی نے ہما خانم کو حیاتِ جاوید بخشی ہے۔ قیمت مجلد عـہ ر

خیالستان	۳ر	جلال الدین خوارزم شاہ	عـہ ر	حکایات و احساسات	عـہ ر
ثالث بالخیر	۸ر	لیلیٰ مجنوں	۱۴ر	جنگ و جدال	۱۲ر
اسیرِ اُلفت	۱۲ر	پُرانا خواب	۱۰ر	زہرہ	۱۰ر

پُرانا خواب اور دیگر افسانے عـہ ر

ماہِ نو — ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے "ششو" کا ترجمہ۔ از جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی۔ ٹیگور فطرتِ انسانی کا باکمال مصور ہے خصوصاً بچوں کے حسیات اور ان کے خیالات کی جیسی سچی تصویریں اس نے کھینچی ہیں وہ اور کہیں نظر نہ آئیں گی۔ عـہ

گیتان جلی	عـہ	میرا لڑکپن	عـہ ر	خاموشی	عـہ ر
کون کسی کا	عـہ ر	پھول اور کلیاں	عـہ ر	الجھن	عـہ ر
کودنی	عـہ ر	چوکھیر والی	۳ر		

چند اور کتابیں

وقارِ حیات۔ نواب وقار الملک کی سوانح عمری۔ مصنفہ محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی۔ صہ ر

کارنامہ پہلوی۔ رضا شاہ پہلوی کے حالاتِ زندگی اور ملکِ ایران کی داستان۔ از سید محمد حسن صاحب بلگرامی۔ للعہ ر

مناجات و نصائح۔ خواجہ عبداللہ انصاری صاحب کا فارسی کلام جو چھوٹی سائز پر دو رنگ میں نہایت خوش نما چھپا ہے۔ عـہ ر

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

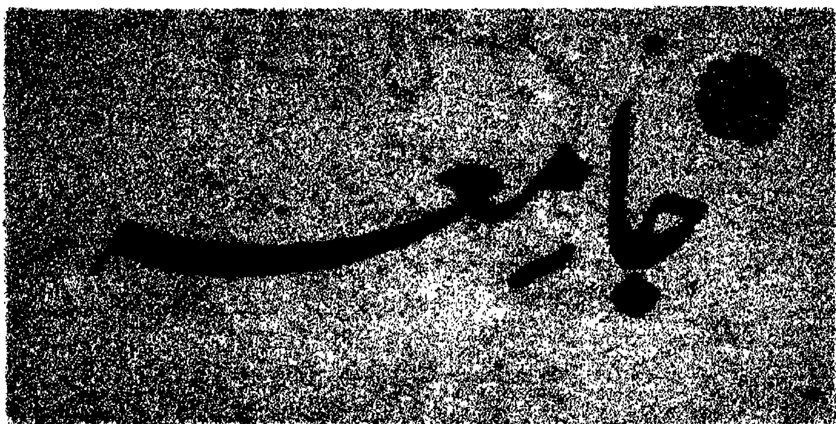
رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

WHAT SCIENCE CAN PRODUCE



PRODUCTS OF INTERNATIONAL STANDARD & QUALITY

CHEMICAL, INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES LTD., BOMBAY—8.



مکتبہ جامعہ دہلی

انشاء کی تعلیم

یعنی

مضمون نویسی پر ایک کتاب

از سید وقار عظیم صاحب ایم اے۔ بی ٹی۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہے اور اس عنوان پر بہت مفید کتاب ہے۔ قیمت عہ؎

تاریخ الامت مکمل از الحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ پروفیسر تاریخ اسلام سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں۔ آٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہے قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفہ پر حاوی ہے قیمت مکمل سٹ ۱۸ للعہ

پردۂ غفلت (ڈرامہ) ڈاکٹر عابد حسین	عہ؎	نقش آخر (ڈرامہ) ڈاکٹر اشتیاق قریشی	عہ؎
انتخاب میر۔ مولوی نور الرحمن	عہ؎	باعبانی پروجیکٹ (اسکولوں کے لئے)	۲؎
سیاسیات کی پہلی کتاب	۸ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر
بادشاہ (پرلس کا ترجمہ)	سے؎	عہد نبوی میں نظام مملکت	سے؎

ننھی مرغابی	۵ر	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	سرکار دو عالم	عہ؎
تانبیل خاں	۵ر	مقناطیس کی کہانی	۵ر	رسول پاک	عہ؎
چیتو متو	۵ر	بجلی کی کہانی	۷ر	خلفائے اربعہ	ہہ؎
لال مرغی	ہر	بجلی اور مقناطیس کی کہانی	۸ر	دس جنتی	۱۰ر
دو بھائی	۸ر	سمندر کا عجائب خانہ	عہ	بنیوں کے قصے	۱۰ر
عقاب	۸ر	عقائد اسلام	ہر	محاسن اسلام	عہ؎
ایورسٹ کی داستان	۵ر	ارکان اسلام	۶ر	قومی نظمیں	۸ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ۱	۷ر	ہمارے نبی		بچوں کا کھلونا	۱۲ر
″ ″ ″ ۲	۸ر	ہمارے رسول	۱۰ر	محنت (ڈرامہ)	۷ر
دنیا کے بچے	۱۰ر	سرکار کا دربار	عہ	شریر لڑکا	۶ر
قاعدہ	ہر	دس سبق	ہر		

ان پڑھ بالغوں کے لئے پوری سو کتابوں کا مکمل کورس ۲۵ للعہ

ہمارا مکمل پتہ: **مکتبہ جامعہ دہلی**

جامعہ

زیر ادارت :۔ پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۔ ۴ ۔ نمبر ۱۲ | بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء | سالانہ چندہ صر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے ، آکسن ۔ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

اگر

آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا
مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو **اُردو اکادمی**
کی رکنیت قبول فرمائیے اور قواعد وضوابط
ایک کارڈ لکھ کر طلب کیجئے۔

ناظم اُردو اکادمی
مکتبہ جامعہ، قرول باغ
دہلی

برطانیہ کی مزدور پارٹی

برطانیہ کے گذشتہ انتخابات میں مزدور پارٹی کو بڑی اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اسے بہت سے لوگ ایک نہایت انقلابی واقعہ سمجھتے ہیں۔ "سرمایہ داروں کی حکومت کا زمانہ ختم ہوا، اب مزدور حکومت کریں گے"۔ ۱۹۱۷ء میں یہی بات روس میں کہی گئی تھی، اور ۱۹۴۵ء میں یہی بات برطانیہ کے لئے[1] کہی جارہی ہے لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔

وہاں اس کے معنی تھے قتل وخون، تباہی وغارت گری، انتشار و ابتری، زمینداروں سرمایہ داروں، مذہب کے اجارہ داروں اور زارشاہی کا مکمل استیصال اور مزدور طبقے کی آمریت۔

یہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ ۱۰۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں مسٹر چرچل نے رہنا چھوڑ دیا ہے ان کی جگہ مسٹر اٹیلی رہنے لگے ہیں۔ ایوان قانون ساز میں حکومت کی نشستوں پر مسٹر چرچل کی قیادت میں تحفظ پسند پارٹی کے نمائندے نہیں بیٹھتے۔ اب ان کی جگہ مزدور پارٹی کے نمائندے مسٹر اٹیلی کی رہنمائی میں بیٹھنے لگے ہیں، اور سرکاری طور پر تسلیم شدہ مخالف پارٹی کی جگہ تحفظ پسند پارٹی نے لی ہے۔

بہرحال ایوانِ عوام میں مسٹر چرچل اور مسٹر اٹیلی اب بھی آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ دونوں میں پہلے کی طرح اب بھی نوک جھوک ہوتی ہے۔ ملک معظم، ایوانِ امرار، ملک معظم کی حکومت، ملک معظم کی مخالف پارٹی، انگلستان کا تحریری اور غیر تحریری دستور وضابطہ مزدور پارٹی کے برطرف کئے جانے اور اس کی جگہ تحفظ پسند پارٹی کے دوبارہ برسر اقتدار

---

[1] مزدور پارٹی جیسا کہ آگے تفصیل سے بتلایا جائے گا، برطانیہ میں پہلے بھی دو مرتبہ حکومت کرچکی ہے، لیکن اُس وقت اُسے وہ اکثریت حاصل نہیں تھی جو اب ہے۔

آجانے کا امکان ——— سب بدستور موجود ہیں ۔ تمام کارروائیاں معمول کے مطابق ہوتی ہیں ۔ سابق حکومت کی تمام خارجی اور داخلی پالیسیوں کے تسلسل کو کم از کم فی الحال قائم رکھا گیا ہے ۔ ان میں جو تبدیلیاں بھی کی جائیں گی وہ بہت تدریجی طریقے پر ہی کی جائیں گی ۔

انگلستان کی پارلیمنٹ کی کارروائیاں ، رکاوٹوں اور جوابی رکاوٹوں ، شہ اور جوابی شہ کا ایک مجموعہ ہوتی ہیں ۔ اس لئے اس کا کوئی کام عجلت سے نہیں ہو سکتا ۔ دیر طلبی اور تاخیر ، غور اور تامل اس کے خمیر میں رچے بسے ہوئے ہیں ۔ ملک معظم کی حکومت کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ملک معظم کی بیدار اور بے درد مخالف پارٹی جسے زندہ رہنے اور اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرنے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا ایسا ہی قانونی حق ملا ہوا ہے جیسا کہ خود اسے اور جسے وہ کسی طرح بہ خیر نہ فنا اور معدوم کر سکتی ہے اور نہ اس کا منہ بند کر سکتی ہے ، برابر اس کی تاک اور گھات میں ہے اور اس کی رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی فکر میں ہے ۔ اس کی ہر لغزش پر وہ اس کی گردن پکڑ سکتی ہے اور اڑنگا مار کر نیچے گرا سکتی ہے اور رائے دہندوں کو اس سے منحرف کر کے اپنا طرفدار بنا سکتی ہے اور اس طرح آئندہ کے انتخابات میں اپنی اکثریت کا دوبارہ انتظام کر سکتی ہے ۔ اس لئے اس کو مخالف جماعت کے اعتراضوں ، نکتہ چینیوں ، ترمیموں اور مبادل تجویزوں کی روشنی میں اپنی ابتدائی تجویزوں اور قانونی مسودوں کو دوبارہ ایسی شکل دینی ہوتی ہے جس سے مخالف پارٹی کے زہریلے ڈنک کا اثر زائل ہو سکے اور رائے دہندوں کو غلط اور بدظن کرنے کی جو کوششیں اس نے کی تھیں ان کی تلافی ہو سکے ۔ اس کے معنی عموماً یہ ہوتے ہیں کہ حکومت کو میانہ روی ، اعتدال ، مصالحت ، اور مفاہمت کی پالیسی سے کام لینا ہوتا ہے وہ اصلاح و ترقی کے صرف ان کاموں کو ہاتھ میں لیتی ہے جن کی ضرورت لازمی اور ناگزیر معلوم ہوتی ہو اور جن کے لئے پریس اور پلیٹ فارم پر عرصے سے شورش و ہنگامہ برپا رہ چکا ہوتا ہے ۔

اور جن کی تائید اور مخالفت میں جتنا کچھ کہنا اور کرنا ہے وہ سب کہا اور کیا جا چکا ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب نیا قانون بنتا ہے تو لوگ نئے حالات سے مطابقت کرنے کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہ جاتے ہیں۔ وہ انھیں ناقابل مضر سمجھ کر ان کو رضاکارانہ طریقے پر قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہاں جوابی انقلابات یا رجعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

انگلستان میں مزدور پارٹی کے برسر اقتدار آجانے سے ایک عام آدمی کو فوری طور پر اس بات کا احساس مشکل ہی سے ہوسکے گا کہ برطانیہ کی حکومت اور زندگی میں کوئی واقعی انقلاب ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے نتائج ایسے ہی دور رس ثابت ہوں جیسے کسی دوسری جگہ بہت شور و ہنگامہ، قتل و بربادی، انتشار و ابتری پیدا کرنے کے بعد حاصل کئے جاتے ہیں اور ان میں رجعت اور ناپائداری کا امکان دوسری جگہوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ثابت ہو۔

پرامن انقلاب کے اس طریقے کو انگلستان ہی نے ایجاد کیا ہے۔ انگلستان میں بڑی سے بڑی تبدیلیاں ایسی ہی خاموشی سے ہوئی ہیں، کہ جس میں نہ خون بہتا ہے، نہ تکلیف ہوتی ہے اور نہ کسی کو ان کے بہت زیادہ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوتا ہے ۱۶۸۸ء کا پرامن انقلاب اسی طرح ہوا تھا۔ ۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۴ء میں برطانیہ کے دستور میں جو بنیادی تبدیلیاں کی گئیں ان سے انگلستان کی رعایا کو وہ حقوق مل گئے جنھیں حاصل کرنے کے لئے فرانس کو متعدد خونی انقلابات سے گذرنا پڑا تھا۔

۱۸۳۲ء کی اصلاحات سے بیچ کے طبقے کے لوگوں، تاجروں اور دکانداروں کو یہ حق ملا کہ وہ اپنے نمائندوں کو پارلیمنٹ میں بھیج سکیں۔ ۱۸۶۷ء کی اصلاحات سے یہ حق شہر کے کاریگروں کو بھی مل گیا کہ وہ ایوان عوام کے اراکین کے انتخاب میں اپنی رائے دے سکیں اور ۱۸۸۴ء کی اصلاحات نے زراعتی مزدوروں کو بھی اس حق میں شریک کر لیا۔

بعد کو یہ حق عورتوں کو بھی مل گیا۔ یہاں تک کہ اب برطانیہ کی تمام بالغ آبادی کو یہ حق مل گیا ہے۔ ایوان امرا کی حیثیت برابر گھٹتی چلی گئی یہاں تک کہ اب تمام اہم معاملوں میں فیصلہ کن اختیار ایوان عوام ہی کو حاصل ہے۔ ایوانِ عوام میں اکثریت رکھنے والی جماعت ہی کو اپنی کابینہ کے ذریعے حکومت کی رہنمائی کرنے کا حق ملا ہوا ہے اور ہر معاملہ میں ایوان عوام ہی کابینہ سے جواب طلب کر سکتا ہے۔

برطانیہ کی قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو مٹاتی نہیں بلکہ انھیں بے ضرر بنا دیتی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو ختم نہیں کیا گیا۔ نام کے لئے بادشاہ کو وہ تمام اختیارات اب بھی حاصل ہیں جو تاریخ کے پچھلے زمانے میں اسے دراصل حاصل تھے۔ وہ حکومت کی رہنمائی کرتا ہے۔ جنگ اور امن کا اعلان کرتا ہے۔ فوج بحری اور ہوائی بیڑہ کا انتظام کرتا ہے۔ مسودۂ قوانین کو منظور یا نامنظور کرتا ہے پارلیمنٹ کو بلاتا اور برطرف کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ان تمام اختیارات کو اپنے وزیر اعظم کی مرضی کے بموجب انجام دیتا ہے۔ اس کے وزرا کی کابینہ اس کے نام سے سب کام کرتی ہے اور اپنے کاموں کے لئے ایوانِ عوام کو اور اس کی معرفت رائے دہندوں کو خود ہی جواب دہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ تمام غلطیاں اس کے وزرا کرتے ہیں اس لئے انھی سے ان کی باز پرس کی جاتی ہے۔

ایوانِ امرا کو جس کے اراکین کا انتخاب نہیں کیا جاتا بلکہ جو یا تو موروثی ہوتے ہیں یا انھیں بادشاہ نامزد کرتا ہے باقی رکھا گیا ہے۔ قانون سازی کے وقت ایوان امرا کی منظوری ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ ایوان عوام کی۔ لیکن ہر کابینہ کا بادشاہ سے نئے امرا بنوانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جب کبھی ایوان امرا کی اکثریت، ایوان عوام کے منظور کئے ہوئے کسی اہم قانون کی مخالفت کرتی ہے تو کابینہ انھیں اس بات کی دھمکی دے سکتی ہے کہ ہم اپنے اختیار سے کام لے کر نئے امرا بنوا دیں گے اور تمھاری اکثریت کو اقلیت میں تبدیل

کردیں گے۔ اور اس دھمکی سے دب کر وہ ایوان عوام کے منظور کردہ قانون کی خود بھی منظوری دے دیتے ہیں۔

اس لئے ہرچند انگلستان کا دستور محدود شہنشاہیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعتاً وہ ایسی ہی جمہوریت ہے جیسی کہ امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ اسی مماثلت کی بنا پر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ برطانیہ بغیر اس بات کا ڈھنڈورا پیٹے ہوئے کہ وہ ایک اشتراکی مملکت ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور مزدور پارٹی کی حالیہ کامیابی سے اس اشتراکی رجحان کی تکمیل ہوگئی ہے جس کی انگلستان میں ایک عرصے سے آہستہ آہستہ نشوونما ہو رہی تھی۔

انگلستان میں مزدوروں کی تحریک کو مختلف منزلوں سے گذرنا پڑا۔ ابتدا میں مزدوروں کو متحد ہونے کی بھی آزادی حاصل نہیں تھی۔ بچوں، عورتوں اور مردوں سے نہایت بیدردی کے ساتھ ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جاتا تھا اور انھیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے بیشتر حصے میں، سرمایہ داروں کا نیا طبقہ اور سیاسی مفکر، انفرادیت کے حامی بنے رہے یعنی وہ ملک کی رعایا کے باہمی معاملات میں ان کے آزادانہ معاہدے کو کافی سمجھتے تھے۔ اور اس معاملے میں حکومت کی مداخلت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس اصول عدم مداخلت کو پہلا نقصان فیکٹری کے ان قوانین سے پہنچا جن کی ابتدا لارڈ ایشلے ثانی، ارل آف شیفٹس بری نے کی تھی۔ اس کے بعد مزدوروں کی موافقت میں قانون سازی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں اور بچوں سے کام لینا کانوں کے اندر ممنوع اور فیکٹریوں میں محدود کر دیا گیا۔ تعلیم کو مفت کیا گیا، میونسپلٹیوں ڈسٹرکٹ بورڈوں کو مزدوروں اور کاریگروں کے لئے مکانات فراہم کرنے کے اختیارات دئے گئے۔ کام کے گھنٹے محدود کئے گئے۔ جسم کو نقصان پہنچنے کی صورت میں مزدوروں کو ہرجانہ ملنے لگا۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن سے ملاحوں اور دوسرے لوگوں کے لئے جو خطرناک کام

میں مصروف تھے ۔ زندگی کے ضائع ہونے کے امکانات کم ہوگئے ۔ فنی اور اعلیٰ تعلیم کے ایسے انتظامات کئے گئے جن سے غریب لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے ۔ بے روزگاروں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھی قانون بنائے گئے ۔ قانون امداد غربا کی سختیوں کو کم کیا گیا ۔ بڑھاپے کے زمانے میں پنشن کا انتظام کیا جانے لگا ۔ مزدوروں کی انجمن سازی کو جائز اور ان کی انجمنوں کے اختیارات کو وسیع کیا گیا ۔ ان انجمنوں کے ذریعے متحد ہوکر مزدور اپنی اُجرتوں میں اضافہ کرانے لگے ۔ مالکوں کے خلاف ہڑتال اور غدار مزدوروں کے خلاف دھرنا دینے کا انھیں حق مل گیا ۔ ہڑتال کے زمانے میں انجمن کے سرمایے کو مزدوروں کے گذر بسر کے لئے صرف کرنے کو بھی جائز سمجھا جانے لگا ۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں میں باہمی مشاورت کے لئے بھی قانون بنائے گئے تاکہ بغیر ہڑتال کئے باہمی سمجھوتے سے اختلافات کو طے کیا جا سکے

یہ بہت اہم مراعات ہیں جو مزدوروں کو قانون نے عطا کی ہیں ۔ لیکن یہ قوانین اس وقت بنائے گئے جب مزدور پارٹی برسر حکومت نہیں تھی ۔ انھیں یا تو دوسری پارٹیوں کے ہمدرد ، نیک دل ، فیاض اور انسان دوست افراد نے بنوایا یا ایسے قدامت پسند زمینداروں نے جو نئے سرمایہ داروں کے مخالف تھے یا ان لوگوں نے جو مزدوروں کے ووٹ سے منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں پہنچے تھے ۔ لیکن بعد کے زمانے میں خود مزدوروں کے درمیان سے بھی ان کے کچھ نمایندے پارلیمنٹ میں پہنچنے لگے اور ان کی یہ تعداد ہر انتخاب میں برابر بڑھتی چلی گئی ۔ یہاں تک کہ آج ایوان عوام میں غالب اکثریت رکھنے کی وجہ سے انگلستان میں ان کی حکومت قائم ہوگئی ہے ۔ آئیے برطانیہ کے مزدوروں کی اس تحریک کے تدریجی ارتقا اور نشو ونما پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے ۔

یوں تو مزدوروں کی سرگرمیاں متحدہ صورت میں ایک عرصے سے جاری ہیں ۔ ان کا کچھ استدارتو اسی وقت سے ہوگئی تھی جب اٹھارھویں صدی کے شروع زمانے میں

مزدوروں کا ایک جداگانہ طبقہ سرمایہ داروں کے بالمقابل نمودار ہوا تھا یعنی ایسا طبقہ جو زمین رہنے کے مکان، کام کی جگہ، اوزاروں مشینوں، کچے مالوں اور اپنی تیار کی ہوئی چیز کی ملکیت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ جس کے پاس فروخت کرنے کے لئے صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی یعنی محنت کرنے کی صلاحیت جسے وہ روزانہ کے حساب سے یا ہفتہ، مہینہ اور سال کے حساب سے یا اپنے کام کی مقدار کے حساب سے، فروخت کرتا یا کرایہ پر اٹھاتا تھا۔ ایسے مزدور چونکہ بڑی تعداد میں ایک ہی فیکٹری اور ایک ہی شہر کے اندر کام کرتے تھے۔ اس لئے ان میں اتحاد اور اشتراک کے مواقع زیادہ پیدا ہوگئے تھے۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے اس رجحان کو اور زیادہ ترقی ہوئی اور مزدوروں کی اس تحریک نے دو مختلف گروہوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کیا۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ موجودہ نظام کو بنیادی طور پر بدلے بغیر کام نہیں چلے گا۔ سرمایہ داری نظام اور اس کی مقرر کی ہوئی حکومت خرابی کی اصل جڑ ہیں۔ پہلے حکومت کو بدلا جائے بعد میں سرمایہ داری نظام کو۔ تب مزدوروں کو کوئی فائدہ حاصل ہو سکے گا۔ دوسرا گروہ حکومت یا سرمایہ داری نظام میں تبدیلی کو ضروری نہیں سمجھتا تھا اور اس انقلاب کے لئے انتظار اور قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی حالت میں معمولی بہتری پر قانع تھا وہ اپنی مخصوص صنعت کے آجروں سے، صرف اپنی انجمن کے اراکین کی اجرت میں اضافہ یا موجودہ اجرتوں کا قیام یا کام کے اوقات کی کمی وغیرہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے دل میں اپنے ملک یا ساری دنیا کے مزدوروں کے پورے طبقے کا زیادہ درد نہیں تھا اس کی وفاداریاں صرف اپنی انجمن تک محدود تھیں۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے ان کے امتیازی فرق کو ذرا مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ روزمرہ عملی زندگی میں ان کے اندر حقیقتاً اتنا بعد نہیں تھا۔ دونوں کا مقصد چونکہ مزدوروں کو فائدہ پہنچانا تھا۔ اس لئے یہ تحریکیں آج کی طرح شروع سے اکثر ایک دوسرے میں مدغم

ہوتی چلی آئی ہیں۔

لیکن مزدوروں کے اتحاد کی ان دونوں ابتدائی کوششوں کو جائداد اور سرمایہ کے مالکوں نے جو حکومت کی مشین پر بھی قبضہ کئے ہوئے تھے، سختی کے ساتھ کچل دیا جس کی وجہ سے انھیں ایک عرصے تک کھلے طور پر منظم ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔

اُنیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ تحریکیں ریڈیکلزم، سوشلزم، ٹریڈ یونین ازم اور چارٹزم کے مختلف ناموں سے چلائی گئی تھیں۔ ان تحریکوں کو پورے طور پر ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ان میں اپنے رہنماؤں کے شدید اختلافات کے باوجود اکثر باتیں مشترک تھیں۔ ریڈیکل جماعت کے لوگ مزدوروں کے مسئلہ کا حل، پارلیمنٹ میں اصلاح جاری کرکے اور مزدوروں کو سیاسی حقوق دلاکر کرنا چاہتے تھے۔ سوشلسٹ زمین اور سرمایہ پر مزدوروں کا قبضہ کرانا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چیزوں کے اندر چونکہ قدر و قیمت صرف محنت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کل قیمت کے مستحق صرف مزدور ہیں۔ لیکن یہ ابتدائی سوشلسٹ، قانونی جبر کے ذریعے۔ انفرادی ملکیت کے حقوق کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اختیاری امداد باہمی، رضاکارانہ اشتراک اور انسانی ہمدردی اور محبت کے فطری جذبے اور تقاضے کے ذریعے اس کام کو کرنا چاہتے تھے۔ ان جذباتی سوشلسٹوں کے مقابلے میں انیسوی صدی کے وسط میں، انقلابی سوشلسٹ پیدا ہوئے جن کا سب سے زیادہ مشہور رہنما کارل مارکس تھا۔ یہ طبقہ وارانہ جنگ اور خونی انقلاب کے قائل تھے اور حکومت کی طاقت کو مزدوروں کے ہاتھ میں لانا اور اس کے ذریعے دولت آفرینی کے وسائل کو نجی مالکان جائداد سے جبریہ چھیننا اور ان کی ملکیت کو اجتماعی سرمایہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن انگلستان میں مارکس کا اثر یورپ کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہوا، اور انگلستان کی مزدور تحریک نے انقلابی رنگ کبھی قبول نہیں کیا۔ ہنڈمین نے ضرور ۱۸۸۱ء میں سوشل ڈیماکریٹک فیڈریشن قائم کی۔ لیکن فےبین سوسائٹی جسے سڈنی وب اور برنارڈ شا نے ۱۸۸۴ء میں قائم

کیا تھا اس کے اثر کو زائل کر دیا۔ فیبین ازم کی تحریک طبقہ وارانہ جنگ اور خونی انقلاب کی معتقد نہیں تھی۔ یہ طبقہ متوسط کی رائے کو تعلیم و پروپیگنڈا کے ذریعے اپنا ہم خیال بنا کر حکومت کی مشین پر قبضہ کرنا اور تدریجی طور پر زمین اور صنعتی سرمایہ کی ملکیت کو نجی افراد کے ہاتھ سے جماعت کے ہاتھ میں منتقل کرانا چاہتی تھی۔

چارٹزم کی تحریک اس بے اطمینانی کا نتیجہ تھی جو ۱۸۳۲ء کی آئینی اصلاحات میں مزدوروں کی حق تلفی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن یہ وقتی جوش دکھلا کر ٹھنڈی پڑ گئی۔

ان تحریکوں میں اپنے دیرپا اثر اور نتائج کے لحاظ سے سب سے اہم تحریک ٹریڈ یونین ازم یعنی مزدوروں کی انجمنوں کی تحریک تھی جسے ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

(باقی)

سہارنپور کی سکنائی جائداد کا جائزہ

میری خوش نصیبی سے میری تحقیقات جولائی ۱۹۶۳ء سے چند مہینے پہلے سہارنپور میونسپلٹی نے ہاؤس ٹیکس عائد کرنے کے لئے سہارنپور کے جملہ مکانات کے بارے میں صرف کثیر کے بعد ایک مکمل فہرست تیار کرائی تھی جس میں میونسپلٹی کے ہر حلقے کے لئے محلہ وار، گھروں کی نوعیت، اُن کے مالکوں اور رہنے والوں کے نام اور ان کے واقعی یا امکانی کرایوں اور مجوزہ ہاؤس ٹیکس وغیرہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کی گئی تھیں۔ یہ چیز میری تحقیقات کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اور میں مولوی فضل الرحمٰن صاحب چیرمین میونسپل کمیٹی سہارنپور کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے ان قیمتی رجسٹروں سے مجھے فائدہ اُٹھانے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ ہفتہ تک میونسپل کمیٹی کے دفتر میں ان رجسٹروں پر کام کیا اور ان سے معلومات کو اخذ کیا۔ جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے دیہات قصبات اور ان شہروں کی جہاں جدید صنعت و تجارت کا ابھی زیادہ غلبہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ یہاں تقریباً ہر شخص کا اپنا ذاتی یا خاندانی مکان ہوتا ہے، چاہے وہ پھوس ہی کا کچا گھروندا کیوں نہ ہو، شہر سہارنپور کے بارے میں میں نے کوئی باقاعدہ تحقیقات تو نہیں کی۔ لیکن جہاں تک میں اندازہ کرسکا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اگرچہ یہاں کرائے کے مکانوں میں رہنے والے پردیسیوں کی تعداد بہت خاصی ہے لیکن جن لوگوں کا سہارنپور آبائی وطن ہے، ان میں سے تقریباً ہر شخص کے پاس اپنا ایک ذاتی یا خاندانی مکان ہے۔ میونسپل کمیٹی نے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے سہارنپور کے مکانوں کے بارے میں جو تحقیقات کرائی وہ ہمہ گیر تھی۔ اس میں شہر کے کسی مکان کو چاہے اس کی حیثیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو تحقیقات کی حدود سے مستثنیٰ نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے سکنائی مکانات کی

ملکیت کی فرقہ وارانہ تقسیم معلوم کرنے کا مجھے پورا موقع حاصل تھا۔ اگرچہ یہ کام دیرطلب ضرور تھا کیونکہ تمام مکانوں کی میزان جیسا کہ میں آگے صحیح صحیح بتلاؤں گا، بیس پچیس ہزار تک پہنچی تھی۔ لیکن میرا مقصد چونکہ محض مکانوں کی فرقہ وارانہ تقسیم معلوم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ سکنائی جائداد کے ذریعے مسلمانوں اور غیرمسلموں کی نسبتی خوش حالی کا اندازہ کرنا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی تحقیقات کو محدود کر دینا ضروری سمجھا، چنانچہ میں نے اپنی تحقیقات سے ان مکانوں کو خارج کر دیا۔ جن کا کرایہ یا حیثیت دس روپے ماہوار یا ایک سو بیس روپے سالانہ سے کم درج کی گئی تھی۔ اس ایک سو بیس روپے سالانہ کرایہ کا مفہوم مکان کی بازاری قیمت کے لحاظ سے کیا سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بارے میں میں نے مولوی عبدالحق صاحب وکیل سہارنپور سے مشورہ کیا جن کو اپنی وکالت کے سلسلے میں ان معاملات سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ صاحبِ موصوف نے ازراہِ عنایت سکنائی جائداد کی بازاری مالیت نکالنے کا ایک آسان قاعدہ مجھے بتلایا جس پر بازار میں بھی عمل درآمد ہوتا رہتا ہے اور اس کو میں ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) ۳ر سیکڑہ ماہوار کے حساب سے مہینے کی آمدنی کو چھ سو سے ضرب دے لیجئے تو آپ کو جائداد کی مالیت معلوم ہو جائے گی۔

(۲) ۴ر " " " " چار " " " " "

(۳) ۸ر " " " " تین " " " " "

(۴) ۱۲ر " " " " دو " " " " "

(نوٹ) یہ موٹا تخمینہ ہے ورنہ ۸ر اور ۱۲ر کے لئے تو فارمولا بالکل صحیح نکلتا ہے لیکن ۳ر کی جگہ دو آنے آٹھ پائی اور ۴ر کی جگہ پانچ آنے چار پائی سے حساب لگانا ضروری ہوتا ہے جب حساب ٹھیک بیٹھتا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی بتلایا کہ دور اُفتادہ محلوں میں جائداد کا حساب ۸ر سیکڑہ کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ بازار نخاسہ میں جو غیراہم بازار ہے ۸ر سیکڑہ کے

حساب سے اور بازار شہنشاہی، بازار موہر گنج ، بازار شہید گنج جو تجارت کا مرکز ہیں ۴؍ اور کبھی ۳؍ کے حساب سے بھی۔ چنانچہ جب جامع مسجد کے لئے جس کے مولوی صاحب موصوف بھی متولی ہیں۔ بازار شہید گنج میں دکانیں خریدی گئیں۔ تو ان کے ایک تہائی حصے کے لئے جس کا کرایہ تیس بتیس روپے ماہانہ ہے، دس ہزار کی قیمت ادا کی گئی۔ یہ دکانیں پختہ ہیں لیکن صرف ایک منزلہ ہیں۔

بعض محلوں میں گز گتی کے حساب سے مکان فروخت ہوتے ہیں مثلاً محلہ شاہ ولایت میں پندرہ روپے تا بیس روپے اور بعض اوقات پچیس روپے تا تیس روپے فی گز کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں اور محض خالی اراضی جس پر مکان نہیں ہوتا۔ آٹھ سے پندرہ روپے فی گز تک جیسا اس کا موقع ہو فروخت کی جاتی ہے۔

بنگلہ کوٹھیوں کا حساب یہ ہے کہ انبالہ روڈ، پٹھان پورہ ، سول لائن اور اسٹیشن روڈ پر ۴؍ کے حساب سے۔ اگر کوٹھی شہر سے زیادہ دور ہو گی جیسے بیہٹ یا سرساوے کی سڑک پر تو ۲؍ یا ۱؍ کے حساب سے۔

لیکن ان تمام سودوں میں ذاتی عنصر کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور اس میں خریدار اور فروخت کنندہ دونوں کی ضرورت کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال مولوی صاحب موصوف کے اس بیان کی روشنی میں دس روپے ماہوار کرایہ کے مکان کی بازاری قیمت محل وقوع اور خریدار و فروخت کنندہ کی نسبتی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولی حالات میں دو ہزار اور چھ ہزار روپئے کے درمیان قرار دی جا سکتی ہے۔

لیکن سہارنپور کے زیادہ تر مکان ایسے ہیں جن میں مالکان مکان خود رہتے ہیں۔ اس لئے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے ان مکانوں کی حیثیت تشخیص کرنے کے واسطے جو لوگ مقرر کئے گئے تھے انھیں ان کے امکانی کرایے کا اندازہ خود کرنا پڑا۔ اس اندازہ میں ظاہر ہے انصاف سے کام لیتے ہوئے وہ شبہہ کا فائدہ مالک مکان ہی کو دے سکتے تھے اور

اس کا کم ترین امکانی کرایہ ہی تشخیص کر سکتے تھے۔ لیکن میں نے ذاتی طور پر جس قدر تحقیقات کی اس سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ بہت سے ایسے مکان جن کا کرایہ دس روپے ماہوار رکھا گیا ہے انھیں اگر کرایے پر اُٹھایا جاتا یا مالک مکان اسی حیثیت کے مکان کو بازار میں کرایے پر حاصل کرنا چاہتا تو اس کو واقعی کرایہ بیس روپے اگر نہیں تو کم از کم پندرہ روپے ضرور ادا کرنا پڑتا۔ اس لئے میری رائے میں مکان کی صحیح قیمت نکالنے کے لئے اوسط سرمایہ کے نرخ کو قبول کرنا چاہیے۔ یعنی دس روپے ماہوار کرایے کے مکان کی مالیت چاہے وہ کسی محلے میں کیوں نہ ہو کم سے کم چھ ہزار قرار دینا چاہئے۔ اور اس قیمت کو انفلیشن (افراطِ زر) سے پہلے کی قیمت ماننا چاہئے۔ لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے اور اس کے منوانے کے لئے میرے پاس کوئی قطعی ثبوت اور فیصلہ کن شہادت موجود نہیں ہے۔

بہر حال مندرجہ ذیل فرقہ وارانہ تحقیقات میں صرف وہ مکان شامل کئے گئے ہیں جن کا ماہانہ کرایہ کم سے کم دس روپے ہے اور اپنی اس تحقیقات کے نتائج کو میں نے حسب ذیل طریقے پر ترتیب دی ہے :-

۱۔ میزان حلقہ ہائے میونسپلٹی شہر سہارن پور = ۵

۲۔ میزان محلہ جات = ۱۳۱

۳۔ میزان کل مکانات = ۱۸۰۹۵۴

۴۔ میزان ایک سو بیس روپے سالانہ اور اس سے زیادہ حیثیت کے جملہ مکانات = ۲۰۴۰۵

۵۔ " " " " " " مسلم " =۹۵۳

۶۔ میزان چھ سو سے بارہ سو روپے سالانہ کے کل مکانات = ۱۲۱

۷۔ " " " " " مسلم " = ۳۴

۸۔ میزان بارہ سو روپے سالانہ اور اس سے زائد کے کل مکانات =۳۲

۹۔ " " " " " مسلم " =۵

۱۰- میزان کل رہائشی مکانات و بنگلہ و کوٹھی و بلڈنگ و کوارٹرز جن کی حیثیت ایک سو میں روپے یا اس سے زائد سالانہ ہے = ۲٫۵۲۱

۱۱- میزان مسلم رہائشی مکانات و بنگلہ و کوٹھی و بلڈنگ و کوارٹرز جن کی حیثیت ایک سو میں روپے یا اُس سے زائد سالانہ ہے۔ = ۵۳۳

۱۲- میزان چھ سو سے بارہ سو روپے سالانہ کی حیثیت کے کل رہائشی مکانات وغیرہ = ۶۹

۱۳- " " " " " مسلم " " = ۱۴

۱۴- میزان بارہ سو اور زائد روپیہ سالانہ کی حیثیت کے کل رہائشی مکانات وغیرہ = ۱۳-

۱۵- " " " " مسلم " " = ×

نام محلہ	نوعیت محلہ	کل	میزان مکانات ودکانات احاطے وغیرہ — ۲۰ روپے سے زید — کل	مسلم	۶۰ سے ۱۲۰ روپے تک — کل	مسلم	۲۰۰ روپے سے زائد — کل	مسلم	رہائشی مکانات — ۱۲۰ روپے سے زائد — کل	مسلم	۶۰ سے ۱۲۰ روپے تک — کل	مسلم	۱۲۰ روپے سے زائد — کل	مسلم	کیفیت
سول لائن سول لائن مختلف سڑکوں پر	کوٹھیاں و بنگلے	۷۶	۷۶	۱۵	۳۵	۷	۲	×	۷۶	۱۵	۳۵	۷	۲	×	
〃 〃 〃 〃	بلڈنگ و کوارٹر	۲۰۴	۲۰۱	۳۶	۱۷	۱	۸	×	۲۰۱	۳۶	۱۷	۱	۸	×	
〃 〃 〃 〃	فیکٹری آفس وددکان وسنا ہال	۵۰	۴۶	۳	۲	×	۳	×	×	×	×	×	×	×	
〃 〃 〃	میزان	۵۳۰	۳۲۳	۵۴	۵۴	۸	۱۳	×	۲۷۷	۵۱	۵۲	۸	۱۰	×	
جنوبی ۵۳ مختلف محلوں میں	〃	۵,۵۲۵	۱,۰۶۱	۴۲۷	۲۳	۱۵	۵	۲	۳۰۹	۲۳۹	×	×	×	×	
غربی ۳۸ 〃 〃	〃	۲,۶۹۳	۲۰۰	۹۶	۲	×	×	×	۱۰۲	۵۲	×	×	×	×	
شمالی ۲۹ 〃 〃	〃	۳,۰۵۷	۲۵۹	۵۸	۱۳	۳	۵	۱	۲۲۱	۴۰	۲	×		×	
شرقی ۲۸ 〃 〃	〃	۵,۱۲۹	۳۶۲	۱۰۸	۲۶	۶	۵	۲	۳۳۲	۱۱۲	۱۳	۶	۲	×	
۵ ۱۳۱ 〃 〃	میزان کل	۸,۹۵۴	۲,۳۰۵	۹۵۰	۲۱	۳۲	۳۲	۵	۱,۵۲۱	۵۳۳	۶۹	۳	۱۳	×	

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت

کھیل کا صحیح مفہوم | معمولی جراثیم اور کیڑے پانی میں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چڑھتے اور اترتے ہیں۔ مرغابیاں سطح آب پر ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں۔ مچھلیاں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہیں۔ درختوں پر بلبل چہچہاتے ہیں۔ ہرن میدانوں میں چھلانگیں مارتے ہیں۔ شیر خوار بچہ دودھ سے سیر ہو کر اِدھر اُدھر شیشی کو حرکت دیتا ہے یہ اور اس قسم کے جملہ حرکات کھیل کہلاتے ہیں یعنی کھیل سے مراد وہ بے ساختہ جسمانی حرکات ہیں جن سے ایک قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے اور یہ زندگی کا جز لاینفک ہے۔ کھیل کی تفہیم کے سلسلے میں ایک محقق یوں رقم طراز ہے۔ "کھیل فطری ورزش اور جسمانی و دماغی خوشی ہے" فرڈبل لکھتا ہے "کھیل عالم طفلی کی ہونہار کلیوں کی شگفتگی ہے" ویبسٹر ڈکشنری میں کھیل کی تعریف یوں لکھی ہوئی ہے "کوئی ورزش یا حرکات کا سلسلہ جو بغرض تفریح کیا جائے" اسٹانڈرڈ ڈکشنری میں کھیل کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے "کھیل وہ عمل ہے جو بے مقصد یا بہ غرض انبساط کیا جائے"

ایک شیر خوار بچہ بھوک لگنے کی وجہ سے دودھ کی شیشی حاصل کرنے کے لئے جو جدوجہد کرتا ہے وہ کھیل نہیں ہے کیونکہ یہ جدوجہد اس کی ذاتی ضرورت کی تکمیل کرتی ہے اور دودھ پی لینے کے بعد شیشی کو اِدھر اُدھر جو حرکت دیتا ہے وہ کھیل ہے اگرچہ دونوں حالتوں میں حرکات ایک ہی قسم کی ہوں گی۔ مگر عضویاتی کیفیت مختلف ہوگی۔ اگر ہم کھیل اور کام کے فرق پر بھی غور کریں تو کھیل کی صحیح تفہیم ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکا محض مدرس کے خوف و ڈر سے گیمس میں حصہ لیتا ہے تو یہ گیمس کام کی نوعیت اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ یہ بیرونی تحریک سے متاثر ہیں اور جب خوشی خوشی اقلیدس کے مسئلے محض طبع آزمائی کے لئے حل کرے گا تو یہ دلچسپ کھیل ہو جائیں گے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ کھیل اور کام میں فرق رجحان طبع پر موقوف ہے مشاغل

کی نوعیت پر نہیں۔ پس کھیل سے مراد ایسے مشاغل و مصروفیات ہیں جن سے ذاتی ضروریات کی تکمیل نہ ہو بلکہ جبلی تقاضہ کی۔

کھیل کے متعلق نظریے | ماہرینِ نفسیات نے کھیل کے متعلق جو مختلف اور دلچسپ نظریے پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

نظریہ فاضل توانائی | جس طرح ایک ریلوے انجن میں زیادہ بھاپ پیدا ہو جاتی ہے تو زائد بھاپ کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی بچوں میں، جو قوت و توانائی بلا صرفہ مجتمع رہتی ہے اس کے اخراج کے لئے کھیل ضروری ہے۔ اس نظریے کے پیش کرنے میں ہربرٹ اسپنسر اور شیلر المانوی شاعر و فلاسفر متفق ہیں۔ لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ بیمار آدمی جوں ہی تندرست ہو جاتا ہے کھیل میں حصہ لیتا ہے۔ بچے باوجود تکان کے برابر کھیلتے رہتے ہیں۔ معمر حضرات دیگر مصروفیات میں تھک جانے کے باوجود کھیلتے ہیں۔

نظریہ تیاری | مختلف کھیلوں کے ذریعے بچے ان مشاغل و حرکات کی مشق کرتے ہیں جو آئندہ زندگی میں انھیں پیش آنے والے ہوتے ہیں۔ اس نظریے کا پیش کرنے والا پروفیسر کارل گروس جرمنی کا عالم نفسیات ہے۔ لیکن اس نے شاید اپنے اس نظریے پر نظر ثانی نہیں کی کیونکہ اگر یہ بربنائے حقیقت ہوتا تو معمر افراد کیوں کھیلتے اور بچے اپنی آئندہ زندگی کی مصروفیت سے ناواقف رہتے ہیں مگر کھیلتے ہیں۔

جبلی نظریہ | اس کو نسلی اعادہ کا نظریہ یا نظریہ کلچری ادوار بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اعصابی عادات اور افعال ماضیہ کا اعادہ یعنی اسلاف کی کارگذاریوں کا اعادہ کھیل کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نظریے کا پیش کرنے والا ڈاکٹر جی اسٹانلی ہال ہے لیکن اس کے پیش نظر حسب ذیل واقعات نہیں تھے کہ بچہ بلحاظ کلچر کھیل نہیں کھیلتا۔ معمر افراد کلچری ادوار ختم کر چکنے کے باوجود کھیلتے ہیں۔ بچے موجودہ سائنٹیفک کھیلوں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

نظریہ رشک ورقابت | نقالی قوت ایجاد اور دوسروں کی نسبت اپنی کامیابی ظاہر کرنے کی خواہش بچہ کھیل کے ذریعے پوری کرتا ہے۔ اس نظرئے کا پیش کرنے والا میگڈوگل ہے۔ لیکن اس نے حسب ذیل حقائق کو نظر انداز کیا کہ شیر خوار بچہ شیشی اور اون کے گولے سے بلا رشک ورقابت کھیلتا ہے اور جو کھیل رشک ورقابت کے جذبے کے تحت کھیلے جاتے ہیں اُن کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔

تفریحی نظریہ | زندگی کی الجھنوں اور افکارات سے نجات پانے کے لئے قدرتی طور پر افراد کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ اس نظریے کے پیش کرنے والے نے یہ نہیں غور کیا کہ بچے بہ نسبت بالغوں کے کھیلوں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں اور فارغ البال اور خوش حال افراد کو ہی کھیلوں میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

کھیل کاہلی کا ردِ عمل ہے | کاہلی اور تساہل سے بچنے کے لئے افراد کھیل کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ لیکن اس نظریے سے اس امر کی تشریح نہیں ہوتی ہے کہ ہم روزمرہ کے ضروری اور ناگزیر دھندوں سے اکتا جاتے ہیں اور پھر کھیل میں کیوں حصہ لیتے ہیں۔

توازنی نظریہ | کھیل ایسی فعلیت ہے جو دماغی اور جسمانی قوتوں کو توازن میں رکھتی ہے اس نظریے کا پیش کرنے والا مسٹر پیاٹرک امریکن فلاسفر ہے۔ لیکن اس نے غور نہیں کیا کہ دماغی کام کرنے والے بھی کھیلتے ہیں۔

حیاتیاتی نظریے | اس کی رو سے کھیل جسم کی ساخت اور نمو پر منحصر ہے۔ یعنی کھیل کے حرکات و مشاغل ایسے ہوتے ہیں جو بڑھتے ہوئے جسم کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ضروری اور موزوں ہوں اسی لئے عمر کے ہر مرحلے پر مختلف اقسام کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ اس نظریے کی پیش کرنے والی خاتون مس ایلٹس ہے۔ اس نظریے کا تعلق حقیقت سے معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر جوزف لی بھی اس کی تائید کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں "کھیل بالیدگی کے لئے بے حد ضروری ہے"۔

کھیلوں کے اقسام | بلحاظ نوعیت کھیلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دیسی کھیل اور دوسرے انگریزی کھیل۔ دیسی کھیلوں سے کبڈی، گلی ڈنڈا۔ درختوں پر چڑھ کر پھل توڑنا تالاب یا دریا میں تیرنا۔ دیسی کسرت کرنا۔ مگدر پھرانا وغیرہ اور انگریزی کھیلوں سے مراد کرکٹ، ہاکی، اور فٹ بال وغیرہ۔ ماہرین کا خیال ہے کہ انگریزی کھیلوں کی بہ نسبت دیسی کھیل زیادہ مفید ہیں۔ کیونکہ ہمارے بزرگ صرف دیسی کھیل ہی میں حصہ لینے کے باعث ہم سے زیادہ صحت مند اور قوی الجثہ ہوتے تھے اور ان کھیلوں میں صرفہ بہت ہی کم ہے علاوہ ازیں بلحاظ مکان کھیلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ درون دروازہ، کھیل مثلاً شطرنج، بلیرڈ وغیرہ اور دوسرا بیرون دروازہ، کھیل مثلاً فٹ بال، کرکٹ اور والی بال وغیرہ۔

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت | تمام ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ تعلیمی ترقی کے سلسلے میں کھیلوں کی ضرورت ایسی ہے جیسے توانا اور تندرست جسم کے لئے عمدہ غذا کی۔ ایک عام ضرب المثل بھی اس حقیقت کو یوں بے نقاب کرتی ہے کہ تندرست دماغ تندرست جسم میں ہی رہتا ہے مشر پیاٹرک امریکن فلاسفر کے خیال کے مطابق کھیل دماغی اور جسمانی قوتوں میں توازن برقرار رکھتا ہے۔ طلبہ جب دماغی کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو کھیل نہ صرف دماغی تھکن کو دور کرتے ہیں بلکہ دماغ کی کھوئی ہوئی توانائی کی تکمیل کرتے ہیں۔ طلبا کی تعلیمی مصروفیت اس قوت کا مظاہرہ ہے جو دماغ کے ریشوں اور اعصابوں کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جلانے کا فعل خون کی آکسیجن انجام دیتی ہے۔ ان کے جلنے کی وجہ سے ایک طرف توانائی پیدا ہو کر ممد و معاون مصروفیت ہوتی ہے تو دوسری طرف مسموم فضلہ تیار ہو کر باعث ذہنی یا اعصابی یا دماغی تکان ہوتا ہے۔ اس مسموم فضلہ کو ہٹانے کے لئے تازہ خون کے دورہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ پسینہ وغیرہ کے ذریعے خارج ہو جائے۔ تازہ خون کا دورہ اور پسینہ کا اخراج جسمانی حرکات مثلاً کھیل، ڈرل وغیرہ پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہر تعلیمی ساعت

کے اختتام پر ایک منٹ کی ڈرل کے لئے اسی وجہ سے زور دیا جاتا ہے۔

عموماً طلبا رتنگ و تاریک کروں میں بیٹھ کر محنت شاقہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں ضعف معدہ کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ یہ شکایت کھیلوں میں حصہ لیتے رہنے سے بہت جلد رفع ہو جاتی ہے۔ کھیلوں سے نہ صرف جسمانی صحت مندی حاصل ہوتی ہے بلکہ بہادری اطاعت، ایمان داری اور اشتراک عمل جیسے اعلیٰ صفات پیدا ہوتے ہیں روایت ہے کہ ایٹن اسکول کے کھیل کے میدان میں جنگ واٹرلو میں فتح یابی حاصل ہوئی تھی۔ غرض تعلیم میں کھیلوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کھیلوں کی وجہ سے طلبہ بام عروج پر پہنچے ہیں اور دنیا میں ان کے کارنامے مثل آفتاب کے روشن رہتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے بعض ماہرین تعلیم کھیلوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ کھیل ہی تعلیم کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ اور کھیل ہی کی بدولت طالب علم کو صحیح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

وینل پولنگ لکھتا ہے :-

Give me the direction of the play life of the youth of this generation and I will dictate the path tomorrow.

کھیل کی اسپرٹ | کھیل کی اسپرٹ سے مراد وہ رجحان طبعی ہے جو درجہ نشوونما کے موافق ہو اور جس کی بدولت مصروفیات کی انجام دہی برضا و رغبت ہو۔ آج کل ماہرین تعلیم اس کھیل کی اسپرٹ کو مدرسے میں رواج دینے کے کوشاں ہیں تاکہ طلبا ر بغیر مدرس کی تحریک کے خوشی خوشی تعلیمی مصروفیات میں حصہ لیں تاکہ تعلیم مفید اور موثر ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ طلبا ر جب اس اسپرٹ کے زیر اثر مدرسے کی مصروفیات میں حصہ لیتے ہیں تو ان کو ترک کر کے گھر جانا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔

کھیل اور جسمانی تربیت | قدیم زمانے میں بچوں کو اپنے والدین کے کام کاج میں حصہ ملتا تھا

جس کی وجہ سے وہ طاقتور اور جسیم ہوتے تھے ۔ موجودہ زمانے میں بچوں کو ان کی اوائل عمری ہی میں درسگاہ میں شریک کرا دیا جاتا ہے ۔ پس ان کی جسمانی تربیت اور صحیح نشو و نما کے لئے مدرسے میں کھیل ہی موزوں ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ان کے تمام اعضاء کی اچھی اور عمدہ تربیت ہوتی ہے اور وہ قوی اور طاقتور بن سکتے ہیں ۔ جسمانی قوت اور توانائی جیسا کہ اکثر ماہرین تسلیم کرتے ہیں ، اخلاقی سیرت کا ایک جزو ہے کیونکہ پُرخطر مواقع پر ثابت قدم رہنے اور دل کو مضبوط کر کے جرأت اور دانشمندی سے کام لینے کے لئے اچھی جسمانی قوت اور توانائی کی ضرورت ہے ۔

کھیل اور عقلی تربیت منظم کھیلوں میں جب بچے حصہ لیتے ہیں تو ان کو ان میں توجہ ، تفکر اور تخیل کو کام میں لانا پڑتا ہے ۔ جس کی وجہ سے ان کی اچھی تربیت ہوتی ہے فیصلہ کی تربیت کھیل میں بہت اہم ہے ۔ فوری و درصحیح فیصلہ کے لئے کھلاڑی کو اچھا مشاق ہونا ضروری ہے مثلاً فٹ بال کے کھیل میں ایک سیکنڈ کے اندر گیند کو ٹھوکر لگانے کے لئے سمت زاویہ اور قوت کا فوراً صحیح فیصلہ کرنا پڑتا ہے ۔ ورنہ غلط فیصلہ پر بڑی شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے اس لئے کھیلوں میں فیصلہ کی تربیت نقلی مضامین سے زیادہ ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں کھیلوں میں بچہ اپنی ذات کو فراموش کر کے کھیل کے حرکات میں منہمک رہتا ہے ۔ یہ خود فراموشی رہنمائی کے لئے راستہ صاف کرتی ہے ۔

کھیل اور معاشرتی تربیت کھیل میں حصہ لینے سے بچہ بخوبی معلوم کر لیتا ہے کہ ہم صحبتوں کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہے سادہ منظم کھیلوں اور ان کے مقابلوں میں مثلاً ، ہاکی فٹ بال اور کرکٹ میں بچوں کو شریک کرا کے اشتراک باہمی کے جذبات کی بخوبی تربیت کی جا سکتی ہے ۔ چونکہ بچہ اپنی ٹیم کی خاطر اپنی انفرادی حیثیت کو مٹا دیتا ہے ۔ اس لئے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

کا حقیقی درس بچے کو کھیل ہی سے بخوبی حاصل ہو سکتا ہے ۔ اپنے لیڈر کی اطاعت ۔ فرمانبرداری

اور اس کا احترام کرنا۔ کھیلوں کی وجہ سے ہی بچہ عمدگی سے سیکھتا ہے۔ کسی نے بجا کہا ہے کہ "کھلاڑی پن ہی اخلاقیات کا اولین سادہ اساس ہے۔"

کھیل اور عملی تربیت | خود اعتمادی۔ قوت عمل اور معینہ مقصد کامیاب زندگی کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کا حصول حقیقی طور پر کھیلوں میں حصہ لینے سے ہوتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ تھوڑا سا علم بھی شامل کر لیا جائے تو شاندار نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کام خواہ کتنا ہی دلچسپ ہو۔ دو تین گھنٹوں کی محنت کے بعد انسان تھک جاتا ہے مگر جو بچے کھیلوں میں زیادہ عرصے تک حصہ لے کر بلا تھکن محنت و مشقت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ کام کو بھی بلا تھکن انجام دے سکتے ہیں۔ جفاکشی اور تندہی کے مظاہرے کھیل ہی کی بدولت نمایاں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں حرکات و سکنات میں آسانی و تناسب کھیل ہی کی وجہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ طالب علم کی عملی زندگی میں کھیل کس قدر معاونت پیدا کر دیتے ہیں۔

کھیل اور شہریت | کھیل کے میدان میں تمام حصہ لینے والوں کی حیثیت یکساں رہتی ہے۔ یہاں امیر و غریب کا امتیاز نہیں رہتا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت اور دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کا سبق کھیل ہی میں عملی طور پر ملتا ہے۔ اخلاقی اور مدنی تربیت کے جو مواقع کھیل میں حاصل ہوتے ہیں وہ کسی نصابی مضمون سے نہیں ہوتے۔ رضاکارانہ خدمات کی انجام دہی کا سبق کھیلوں کے ہی میدان سے حاصل ہوتا ہے۔ ٹیم کے ساتھ پوری وفاداری اپنی انفرادیت پر غالب آ جاتی ہے۔ جس سے شہریت اور جمہوریت کا صحیح احساس پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم اس اہم نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کھیل کو تعلیم کے سب سے بڑے ارکان میں سے ایک سمجھا جانا مناسب اور ضروری ہے۔ تعلیم سے مراد اُس صلاحیت اور عقل تمیزی کی تربیت ہے جو عملی زندگی کے کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کام میں لائی جاتی ہے۔ یہ تربیت کھیلوں کے اہم حصہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

محمد مختار احمد بی ایس سی
ٹوپ۔ ایڈ۔ اردو فاضل

زرعی ترقی کے لئے حکومت ہند کا منصوبہ

ذیل میں اس یادداشت کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جسے زراعت اور فلاحت حیوانات کی ترقی کے لئے زرعی تحقیقات کی شاہی کونسل کے مشاورتی بورڈ نے حکومت ہند کے لئے تیار کیا ہے۔

مسئلہ | ہندوستان کی سب سے اہم غذا اناج ہیں۔ یعنی چاول، گیہوں اور جوار باجرا ہندوستان کی اکثر غذاؤں کے ساتھ دالیں بھی ملاکر کھائی جاتی ہیں۔ چکنائی حاصل کرنے کے لئے اکثر لوگ نباتی تیل اور گھی کو استعمال کرتے ہیں۔ دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں ملک کے بعض حصوں اور بعض گروہوں میں اگرچہ خاصی مقدار میں کھائی جاتی ہیں لیکن اکثر حصوں میں غریبوں کی بڑی تعداد ان کا استعمال بہت کم کر پاتی ہے۔ غذا کے بارے میں جو پیمائشیں کی گئی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی تیس فی صدی آبادی یعنی دس کروڑ سے زائد آدمیوں کو عام زمانوں میں ضرورت سے کم غذا میسر آتی ہے۔

پھر غذا محض مقدار کے لحاظ سے ناکافی نہیں ہوتی بلکہ اس کی نوعیت بھی ناقابل اطمینان اور غیر متوازن ہوتی ہے۔ چکنائی کا استعمال بلا استثنا کم کیا جاتا ہے۔ چاول کھانے والوں کی غذا میں عموماً چونے کی کمی ہوتی ہے اور ہندوستان کی اکثر غذاؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں حیاتین بہت کم ہوتے ہیں۔

مقصد | ہندوستان میں خاص خاص غذاؤں کی سالانہ پیداوار کا اوسط تقریباً حسب ذیل قرار دیا جا سکتا ہے:۔

اناج ... ... ۶ کروڑ ٹن

دالیں ... ... ۵۰ لاکھ ٹن

چکنائیاں اور تیل ... ... ۱۹ " "

پھل	۶۰	لاکھ ٹن
ترکاریاں	۹۰	" "
دودھ[۱]	۲ کروڑ ۳۰	" "
گوشت مچھلی اور انڈے	۱۵	" "

بظاہر پیداوار کی یہ مقداریں بہت کثیر معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ماہرینِ غذائیات نے مناسب اور متوازن غذا کی جو کم ترین مقدار مقرر کی ہے اس کے مقابلے میں ۴۰ کروڑ آبادی کے لئے ان سے ناکافی غذا حاصل ہوتی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے غذا کی پیداوار میں حسب ذیل اضافے کرنا ضروری ہیں۔

اناج میں دس فی صدی۔ دالوں میں بیس فی صدی چکنائی اور تیلوں میں دو سو پچاس فی صدی۔ پھلوں میں پچاس فی صدی۔ ترکاریوں میں سو فی صدی۔ دودھ میں تین سو فی صدی مچھلی اور انڈوں میں تین سو فی صدی۔

اس لئے قومی خود کفالت کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے پیداوار کے اتنے اضافہ فی صدی کو کم ترین مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اس نصب العین کی تکمیل کے سلسلے میں دودھ اور جانوروں کی محنت کی مقدار کے بڑھانے کی جو ضرورت ہوگی اسے جانوروں کے لئے کافی چارہ مہیا کرکے ہی پورا کیا جاسکے گا۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس کے لئے کھلی اور دیگر دودھ بڑھانے والی غذاؤں کی مقداریں چار سو فی صدی اور چارہ کی مقداریں پچپن فی صدی اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔ آخر میں غذائی فصلوں اور تجارتی فصلوں کے درمیان بھی ایک مناسب توازن پیدا کرنا ہوگا تاکہ لوگوں کو نہ صرف کافی غذا کھانے کو میسر آئے بلکہ ان کی قوت خرید بھی بڑھے، جس سے کہ وہ کپڑا اور دوسری وہ سہولتیں فراہم کرسکیں جو ایک زیادہ مکمل اور زیادہ خوش حال زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

---

[۱] اس میں سے صرف ۷۰ فی صدی یعنی ۲۰۲ لاکھ ٹن دودھ کی صورت میں ورنہ باقی مکھن اور گھی کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مختلف اسباب کی بنا پر، اکثر فصلوں کی پیداوار فی ایکڑ بہت کم ہے۔ مزروعہ رقبہ کا ⅘ حصہ بارانی ہے اور اس کی کامیابی کا دارومدار تمام تر بارش پر ہوتا ہے۔ بیشتر علاقہ میں بارش یا تو غیر یقینی ہوتی ہے یا نا وقت ہوتی ہے۔ کاشتکار اپنی مجبوریوں یا ناواقفیت کی بنا پر اپنی زمین سے اور بارش اور آبپاشی کی سہولتوں سے جتنا فائدہ اُٹھانا چاہئے اتنا نہیں اُٹھاتا۔ وہ اپنی فصلوں میں یا تو ناکافی کھاد ڈالتا ہے یا سرے سے ڈالتا ہی نہیں ہے کاشتکاروں کی اکثریت بیجوں کی بہترین اور ترقی یافتہ قسموں کا استعمال نہیں کرتی۔ کاشت کا معیار پست ہے اور دقیانوسی ہل ہی واحد اوزار ہے جس سے کہ عام طور پر کام لیا جاتا ہے نقصان رساں جانوروں اور فصلوں کی بیماریوں کی کوئی روک تھام نہیں کی جاتی کھیت میں گھاس پات خوب اپنی مرضی کے مطابق اُگتی رہتی ہے اور زمین کا ڈھال اس قسم کا ہوتا ہے کہ اوپر کی زرخیز مٹی کٹ کٹ کر باہر بہہ جاتی ہے اور بارش اور سطح کے پانی کو مینڈیں بنا کر اور دوسرے ذرائع اختیار کر کے قابو میں رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی یہ چند وہ امور ہیں جن پر مناسب توجہ کر کے کاشتکار اپنی زمین کی پیداوار میں بلاواسطہ اضافہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح اپنے پالتو جانوروں سے بھی اُسے فائدہ کم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی اول تو چارہ ناکافی مقدار میں دیا جاتا ہے دوسرے ان کی نسل کشی میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ غیر تشفی بخش انتظام اور امراض کی تباہی کی وجہ سے پیداوار فی جانور جتنی ہندوستان میں کم ہے اتنی دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے۔

ذرائع غذائی خود کفالت اور قوت خرید کے اضافہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ تمام قومی وسائل کے بہترین استعمال کی ضمانت کی جائے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے اب تک جو جو طریقے معلوم کئے ہیں ان سب سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے۔ ان ذرائع میں حسب ذیل کو شامل کیا جا سکتا ہے:۔

پانی:۔ فصلوں کی پیداوار پر کسی دوسرے واحد عامل کا اتنا زبردست اثر نہیں پڑتا

جتنا کہ آبپاشی کا پڑتا ہے۔ چاہے وہ مصنوعی ہو یا قدرتی۔ اس کے ذریعے غیر بارانی ریگستان جہاں کوئی فصل نہیں ہوتی پُر بہار اور ثمر دار نخلستانوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ اور غیر یقینی بارش کے علاقوں سے ہر سال یقینی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر ان آخر الذکر علاقوں میں نہ صرف پیداوار کو یقینی بنایا جا سکتا ہے بلکہ جب آبپاشی پر قابو رکھنا ممکن ہوتا ہے تو اُن کی پیداوار کو سو فی صدی تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ غیر بارانی علاقوں کو بارش سے جو فائدہ ہے اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر چونکہ مزروعہ رقبہ کا ⅘ حصہ غیر آبپاشی شدہ ہے۔ اس لئے ملک میں بصورت مجموعی پانی کے تمام ذرائع کے بیش ترین استعمال سے پیداوار کو غالباً پچاس فی صدی تک بڑھایا جا سکے گا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ پانی کے تمام ذریعوں سے بیش ترین فائدہ اُٹھانا نہایت لازمی ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں:-

۱۔ ان دریاؤں کے بہاؤ، رفتار اور سمت کو گرفت میں لانا جن میں پانی کی رسد کافی ہوتی ہے۔ اور ان کے پانی کی تقسیم کے لئے آبپاشی کی نہریں تعمیر کرنا۔

۲۔ جہاں بہاؤ کی آبپاشی ممکن نہیں ہے وہاں براہِ راست دریاؤں یا نہروں سے پانی کو اُٹھانے کے لئے مشینی ذرائع کا استعمال کرنا۔

۳۔ ایسے تہ نشین پانی کے لئے جو آبپاشی کے لئے موزوں ہو۔ نل دار کنوئیں (ٹیوب ویل)، اور کھُلے رہنے والے کنوئیں بنانا اور موجودہ کنوؤں میں سوراخ کرنا (بورنگ)

۴۔ آبپاشی کے لئے چھوٹی تعمیرات بنانا، مثلاً تالاب اور ان میں بارش کا زاید پانی پہنچانا تاکہ اُسے بعد میں استعمال کیا جا سکے۔

۵۔ مٹی کے کٹاؤ کو قابو میں لا کر بند کرنا، اور ڈھلوان زمین کو مختلف سطحوں کے ہموار چبوتروں میں تقسیم کرکے بارش کے پانی کو استعمال کرنا اور کاشت کے موزوں طریقوں کے ذریعے بارش کے پانی کو زمین کے اندر زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنا۔

پانی سے بیش ترین فائدہ اٹھانے کے لئے اولیں شرط یہ ہے کہ وسائل اور ان رقبوں کی جنھیں ترقی دینا ہے مکمل پیمائش کرائی جائے اس کے بعد ضروری اسکیمیں تیار کی جائیں جب یہ باتیں ہو جائیں تب آخری مفصل فیصلے کئے جائیں۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ ان ابتدائی منزلوں سے گذرنے میں ممکن ہے کئی برس لگ جائیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ ترقی کا کام جب تک سب رقبوں کی پیمائش نہیں ہو جائے گی اس وقت تک رکا رہے گا۔ نئی تعمیرات کا کام ہر منفرد رقبہ یا منصوبہ کی پیمائش کے بعد شروع کیا جا سکتا ہے اور اس کے بارے میں اسکیم تیار کی جا سکتی ہے اور مفصل لاگت کے تخمینے کرائے جا سکتے ہیں۔

زمین:۔ زمین سے بیش ترین فائدہ بھی کئی طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے

(الف) ۱۷ کروڑ ایکڑ کے اس مجموعی رقبہ میں سے جو اس وقت پڑتی یا بنجر پڑا ہوا ہے ایسے رقبے کو کاشت میں لانا جس پر فصلوں کا پیدا کرنا نفع بخش بنایا جا سکتا ہے۔ بظاہر مٹی کے کٹاؤ، بارش کی زیادتی یا قلت، انتہائی شوریت اور القلیت اور گہری جڑوں والی گھاس پات نے اس بڑے بنجر رقبہ کو کاشت کے لئے ناموزوں بنا رکھا ہے۔ لیکن بہت سی صورتوں میں نہ تو ان رقبوں کے محل وقوع کا علم ہے جنھیں دوبارہ کاشت میں لایا جا سکتا ہے اور نہ اس بات کا کہ ان کی وسعت کیا ہے۔ اس لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ اس بات کی پیمائش کرائی جائے کہ زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر کاشت نہ کئے جانے کے اسباب کیا ہیں۔ ان پیمائشوں کے بعد زمین کی باریابی کے لئے موزوں اسکیمیں تیار کرائی جا سکتی ہیں۔

(ب) زمین کے کاشت سے خارج ہو جانے کی روک تھام کی جائے۔ اس ذیل میں سب سے اول کام تو زمین کے کٹاؤ پر قابو حاصل کرنا ہے جس کے لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ ہر بڑے طاس کے علاقے کے پانی کو قابو میں رکھا جائے اور زرعی زمین پر سے اس کے گذرنے کا تدارک کیا جائے۔ کیونکہ وہ اس کی زرخیز سطح کو بہائے جاتا ہے۔ (اس اصل مقصد کے حصول کے ضمن میں پانی کو اس طرح بھی گرفت میں رکھا جا سکتا ہے کہ اس سے آبپاشی کا پانی نکل

کا یا دونوں کام لئے جاسکیں ۔ اس معاملے میں بھی پہلی منزل یہ ہے کہ بڑے بڑے طاس کے علاقوں کی پہلے پیمائش کرائی جائے اور بعد میں ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے ضروری اسکیمیں تیار کرائی جائیں ۔

ڈھالو زراعتی زمینوں کو ان تباہ کن اثرات سے محفوظ کرنے کے لئے جو شدید بارش کے پانی یا غیر قابو یافتہ پانی کے بلند سطح سے بہہ کر آنے اور اپنے ساتھ اوپر کی زرخیز مٹی کو بہا کر لے جانے سے رونما ہوتے رہتے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ چبوترہ بندی اور پشتہ سازی کی ایک ملک گیر پالیسی کو اختیار کیا جائے ۔ ان پشتوں کی مناسب تقسیم ، درجہ بندی اور تعداد کیا ہو اس کا فیصلہ کرنے کے لئے بھی گاؤں گاؤں کی پیمائش انجینیروں سے کرانا ضروری ہے ۔ اس کے بعد پشتہ کی ضروری لمبائی کا تعین کیا جاسکے گا اور مقررہ سالوں کی ایک مدت کے لئے پشتہ سازی کا ایک مکمل منصوبہ تیار کیا جاسکے گا ۔

(ج) زمین سے مناسب فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ سائنس کے تجربے اتنے بڑے پیمانے پر کئے جائیں کہ جس کے ذریعے زراعت کے افسر کو یہ موقع حاصل ہو کہ وہ کاشتکار کو بتلاسکے کہ اس کی مخصوص زمین اور اس کی انفرادی ضرورتوں کے لئے کاشت کا کون سا طریقہ موزوں ترین ہوگا ۔ موجودہ زمانے میں بعض معاملات کے بارے میں ہر چند خاصی معلومات موجود ہیں لیکن دوسرے ایسے معاملے بھی ہیں جن کے بارے میں معلومات قطعاً ناکافی ہیں ۔ ان معلومات کے اکٹھا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سارے ملک کی ہر قسمت کے اندر جہاں جہاں اس وقت کوئی تجربی فارم موجود نہیں ہے اس قسم کا فارم قائم کیا جائے ۔

(د) زمین سے بیش ترین فائدہ اُٹھانے کی آخری تدبیر کا تعلق زیادہ تر خود کاشتکار کی ذات سے ہے اور اس میں فصلوں کی پیداوار کو بڑھانا شامل ہے جس کے لئے کاشت کے ترقی یافتہ طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں ۔ مثلاً کھاد دینا ، بہتر بیج کا بونا ، جتائی کے

طریقوں کو بہتر کرنا، نقصان رساں جانوروں اور امراض پر قابو پانا۔

غذائی فصلوں کو کھاد سے جو فائدہ پہنچتا ہے، وہ فصل زمین، آب و ہوا اور آبپاشی کی سہولتوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ مناسب کھاد کی وجہ سے چاول کی فصل میں فی ایکڑ بیس تا ایک سو پچاس فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان کے لئے بصورت مجموعی تیس فی صدی کا اضافہ عملی طور پر قابل حصول تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ گیہوں پر کھاد کے جو تجربے کئے گئے ہیں ان میں صفر سے لے کر ۶۵ فی صدی تک اضافہ ہوا ہے۔ اس فصل کے لئے بصورت مجموعی ۲۰ فی صدی اضافہ لائق حصول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آبپاشی کی سہولتیں بھی حاصل ہوں گی تو اضافہ اور بھی بہت زیادہ ہوگا۔

کھاد کے ایک ہمہ گیر پروگرام میں تمام کھادوں کو شامل کرنا ہوگا اور ان کو کافی مقدار میں پیدا کرنے کے لئے تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی۔ جانوروں کے بارے کے کھاد کا موجودہ زمانے میں صرف چالیس فی صد حصہ زراعتی زمینوں میں پہنچ پاتا ہے۔ اس تناسب کو جب ہی بڑھایا جا سکے گا جب گوبر کے ایندھن کے بدلے میں کسی دوسرے ایندھن مثلاً لکڑی یا معدنی تیل کی کافی رسد مہیا کی جا سکے گی۔ آبپاشی شدہ غذائی فصلوں اور گیہوں اور چاول کے لئے نباتی کھاد کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شہر اور دیہات کے تمام نباتی فضلہ کو کمپوسٹ کھاد بنا کر دوبارہ زمین میں پہنچا دینا چاہیئے۔ کھلی کو بھی بڑی مقدار میں فراہم کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ تلہن کا صرف تیل ہی غیر ملکوں کو برآمد کیا جائے اور ان کی کھلی کو جانوروں کی غذا اور کھاد کے لئے رکھ لیا جائے۔ مصنوعی کھاد خصوصاً سلفیٹ آف امونیا اور بعض علاقوں کے لئے فاسفیٹ کے کھاد بھی سستی قیمت پر بہت بڑی مقدار میں فراہم کرنے چاہئیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں سالانہ پچاس لاکھ ٹن سلفیٹ آف امونیا سے کم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس وقت تین لاکھ پچاس ہزار ٹن سالانہ کی تیاری کا مسئلہ زیر غور ہے۔

بیج کی ترقی یافتہ قسموں کے بونے سے پیداوار فی ایکڑ کو دس تا پندرہ فی صد بڑھایا جاسکتا ہے۔ بیج کو کافی مقدار میں فراہم کرنے کے لئے رجسٹری شدہ بیج بونے والوں کی نگرانی میں، بیج کے بہت سے فارم قائم کرنا ہوں گے اور انھیں بیج کی منظم پیداوار سے منسلک کرنا ہوگا۔ اس بیج کی تقسیم اور اس کی قیمت بصورت جنس یا نقد کی وصول یابی کے لئے پانچ ہزار بیج گودام قائم کرنا ہوں گے۔

بوائی کے طریقوں میں ترقی کا جو علم اب تک حاصل کیا گیا ہے وہ کسانوں کی رہنمائی کے لئے بعض معاملوں میں تو کافی ہے لیکن دوسرے معاملوں میں ناکافی ہے اور جو نئے تجربی فارم آیندہ قائم کئے جائیں گے ان کے لئے ابھی بہت سا کام کرنا باقی ہے تب کہیں زمین اور آب ہوا کی تمام مختلف حالتوں میں کسان کو مکمل رہنمائی فراہم کی جاسکے گی۔ بیلوں سے کھینچے جانے والے ترقی یافتہ اوزاروں کے ایجاد کرنے میں ہندوستان کے مختلف حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عملی تحقیقات کی ضرورت باقی ہے۔ قوت محرکہ سے چلنے والی مشینوں کو جو اہمیت پیداوار کے بڑھانے میں حاصل ہوگی ان کے پیش نظر ٹریکٹروں اور اُن کے اوزاروں اور مشینوں کا درآمد کرنا اور ان سے وسیع پیمانے پر تجربہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔ جب تک اس بات کی پیمائش نہ کی جائے کہ مختلف علاقوں میں قوت محرکہ سے کاشت کی کتنی گنجائش ہے اور اس کی معاشیات کے بارے میں تجربے نہ کئے جائیں اس وقت تک اس قسم کی کاشت کا مستقبل تاریکی ہی میں رہے گا۔

قوت محرکہ کی کاشت کے امکانات سے ملا جلا ایک اور مسئلہ بھی ہے یعنی یہ کہ بیش ترین پیداوار اور بیش ترین بہبود کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کاشت کے کن مختلف نظاموں کی توسیع کے مواقع ہندوستان میں زیادہ موجود ہیں۔ بہت سوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک کھیتوں کی چک بندی نہیں کی جائے گی ان کی پیداوار نہیں بڑھ سکے گی۔ دوسرے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے گاؤں کو اکائی مان کر فصلوں کی

چک بندی کے تجربے کو کامیابی کے ساتھ چلایا ہے۔ اشتمالی کاشت اور امداد باہمی کی کاشت کے حامی بھی موجود ہیں۔ جب تک ملک کے بڑے بڑے رقبوں میں ان تمام نظاموں کا تجربہ نہ کیا جائے اس بارے میں کوئی عمومی بیان دینا کہ ان میں سے کون سب سے بہتر ہے یا یہ مشورہ دینا کہ کسی خاص علاقے یا حالات کے لئے کون سا نظام سب سے زیادہ موزوں ہے ناممکن ہوگا۔ اس کے بارے میں تحقیقاتیں کرانا نہایت ضروری ہے اور ان کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہئے۔

نقصان رساں جانوروں اور بیماریوں سے فصلوں کی کافی حفاظت کرنے سے پیداوار میں گمان یہ ہے کہ اوسطاً پانچ فی صد اضافہ کیا جاسکے گا۔ جب ذخیرہ کے طریقوں میں بھی زیادہ احتیاط برتی جائے گی تو غذائی اناج کی اور زیادہ مقدار کھانے کے لئے محفوظ کی جاسکے گی۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حفاظتی طریقوں کو پوری طرح رائج کرنے سے پہلے نہ صرف مختلف سمتوں میں مزید علمی تحقیقات اور تجربوں کی ضرورت ہے بلکہ کافی بڑے پیمانے پر کیڑا مار اور پھپوند ضائع کرنے والی دوائیں اور ان کے استعمال کرنے کی مشینوں کو بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آلو جیسی پیداوار کو اس عظیم نقصان سے بچانا ہے جو ذخیرہ کے زمانے اس کو پہنچتا ہے تو ہمیں سرد ذخیروں کا بھی خاص کر بیج کے آلوؤں کے لئے انتظام کرنا ہوگا۔

پالتو جانور | ہندوستان کے گلوں اور ریوڑوں کی پیداوار میں اضافہ کا انحصار بہت بڑی حد تک ان کی غذا کی مقدار اور اس کی نوعیت کی بہتری پر ہے۔ یہاں ہر قسم کی غذا کی کمی پائی جاتی ہے۔ بھوسے اور اناج کی ضمنی پیداواروں کی رسد میں تو اس وقت اضافہ ہو سکے گا۔ جب انسانی خوراک کے لئے زیادہ اناج بویا جائے گا۔ لیکن چارہ کی ضرورت کو بہت بڑی حد تک گھاس کو خشک کرنے اور سبز حالت میں گڑھے کے اندر دبانے سے اور چارہ کی زمینوں کے معقول انتظام سے اگر ان میں مناسب توسیع بھی کر دی جائے پورا کیا جاسکے گا۔ تیلہن کی صنعت سے جو کھلی حاصل ہوتی ہے وہ ضرورت کے صرف چوتھائی حصے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کی رسد کے بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ کھلی کی برآمد پر پابندی عائد کی جائے

اور تلہن کی پیداوار بڑھائی جائے۔ چارہ کے لئے بوئی ہوئی فصلیں بھی پالتو جانوروں کے لئے قیمتی غذا فراہم کرتی ہیں لیکن چونکہ ان کے بونے کے لئے اکثر انھی زمینوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی انسانی غذا کے بونے کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو مقابلے میں دوسرے درجے پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود چارہ کی **فصلوں** کی پیداوار بڑھانے کی (خاص طور پر دودھ دینے والے مویشیوں کے لئے) فوری ضرورت ہے اور اس کی طرف مناسب توجہ کرنی چاہیئے۔

آج کل جو مویشی پائے جاتے ہیں ان سے بیشتر کی نسل میں کوئی بات لائق ذکر نہیں ہوتی مویشی کی پیداوار کے بڑھانے کے سلسلے میں دوسرا کام یہ ہے کہ ان کی درجہ بندی کرکے ان کی نسل کو ایسی معروف نسلوں کے معیار تک ترقی دی جائے جن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ ان کے اندر پسندیدہ خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے نسل کشی پر نگرانی رکھنا ضروری ہے اور اسی کے لئے بڑی تعداد میں اعلیٰ نسل کے سانڈ فراہم کرنا چاہئیں۔ اس مقصد کے پیش نظر نسل کشی کے پچاس فارموں سے ابتدا کی جاسکتی ہے۔

پالتو حیوانوں کی پیداوار میں فوری اضافہ دیہات کے بعض روزمرہ کے کاموں کے انتظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے کیا جاسکے گا۔ مثلاً ایسے کاموں سے دودھ دینے والی گایوں کے خشک رہنے کے زمانے کو مختصر کیا جاسکے گا یا ایسے کاموں سے جن کے ذریعے موسم کی سختی سے حفاظت کرکے نئی نسل کی زندگی اور تندرستی کو محفوظ کیا جاسکے گا یا پھر ایسے کاموں سے جن کے ذریعے مناسب طور پر تنظیم وضبط قائم رکھ کر اور ابتدائی طور پر انھیں مصنوعہ شکل دے کر حیوانی پیداواروں کا تحفظ کیا جاسکے گا۔

پھر ضرورت اس کی ہے کہ مندرجہ بالا ترقیوں سے جن اچھے نتائج کے حاصل ہونے کی توقع ہے وہ بیماریوں کے پھیلنے کی وجہ سے برباد نہ ہوجائیں۔ جانوروں کی رائج الوقت وبائی بیماریوں کا تدارک کرنے کے سلسلے میں بہت سی باتیں ابھی دریافت کرنا باقی ہیں

لیکن بیماری کے بارے میں تحقیقات سے جو علم فی الحال حاصل ہو چکا ہے اس کے فوری اور وسیع استعمال کے ذریعے بھی ملک کو زبردست نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔ مزید تحقیقات کے علاوہ سب سے زیادہ فوری ضرورت یہ ہے کہ کافی مقدار میں آدمی فراہم کئے جائیں تاکہ مناسب تدبیریں صحیح وقت پر یعنی بیماری کے جاگزیں ہونے سے پہلے نہ کہ بعد میں استعمال کی جا سکیں۔

پالتو جانوروں کے بارے میں ہزاروں مسائل پر علمی تحقیقات کرنا ضروری ہے اور ان میں سب ہی طرح کی چیزیں شامل ہیں مثلاً افزائش نسل کے طبعی طریقوں میں سائنس کی مداخلت اور فراہمی غذا کی معاشیات سے کر روزانہ زندگی کے ایسی معمولی مسائل تک کہ گاؤں کے مخصوص حالات کی روشنی میں مرغی خانہ کا موزوں ترین نقشہ کیا ہو سکتا ہے۔

حیوانی پیداواروں کی فروخت کی دقتوں کی وجہ سے بھی ان کی پیدائش کو ایک محدود حد تک ہی بڑھایا جا سکتا ہے۔ دودھ کے جمع منتقل اور تقسیم کرنے کے سلسلے میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی نوعیت ہر اس رقبہ کے لئے جس کو کہ دودھ مہیا کرنا ہوتا ہے مختلف ہوتی ہے۔ ان کے مناسب بندوبست کے لئے ابتداءً یہ ضروری ہے کہ رقبہ متعلقہ کی نہایت احتیاط کے ساتھ پیمائش کرائی جائے۔ مکھن سازی کی جدید آلات کو بھی گاؤں میں رواج دینے کی ضرورت ہے اور دودھ کی پیداواروں کو مصنوعہ شکل دینے کے لئے مناسب کارخانے قائم کرنا بھی توسیع وترقی کی ضروری شکلیں ہیں۔ لیکن ان کے لئے بہت زیادہ سرمایہ درکار ہے۔

ملک کے مچھلی کے وسائل سے کبھی کافی مقدار میں اور مسلسل طریقے پر فائدہ نہیں اٹھایا گیا سمندر سے مچھلی پکڑنے کے ترقی یافتہ طریقوں کی آزمائش کرنی اور انھیں ترقی دینی چاہیے جو مچھلی پکڑی جاتی ہے اس کو ہاتھ لگانے، تیار کرنے، ذخیرہ کرنے اور منتقل کرنے کے لئے بھی جدید ذرائع کی تحقیقات کرنا چاہیئے۔ بعض سمتوں میں تو فوری کارروائی کی جا سکتی ہے۔ مثلاً خشکی کے اندر ماہی گاہوں کے میں فوری توسیع، تالابوں، جھیلوں، اور جوہڑوں میں

مچھلی کے مناسب بیج ڈال کر کی جاسکتی ہے۔ بنیادی اور ترقی دونوں طرح کے کاموں میں عملی تحقیقات کی ضرورت ہے تاکہ مزید ترقی کے لئے جو واقفیت ضروری ہے اسے حاصل کیا جا سکے اس صنعت کی نگرانی، تحقیقات اور توسیع کے لئے باقاعدہ تنظیم کی ضرورت ہے جس کا انتظام ایک کل ہند مرکزی ماہی گیری کمیٹی کا تقرر کر کے جس کی سالانہ آمدنی یقینی ہو کیا جا سکتا ہے۔

پیداوار کے اضافہ کے لئے ضروری محرکات | لیکن اس مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری محرک بھی مہیا کرنا لازمی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ کاشتکار کو اپنی حالت کی طرف سے مطمئن کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں جنگ کے زمانے میں اس محرک کو فراہم کرنے کا ایک طریقہ اختیار کیا گیا کہ پیداوار کی کمترین قیمتوں اور یقینی منڈی کی جنگ کے زمانہ اور اس کے ایک سال بعد تک کے لئے کسان کے واسطے ضمانت کر دی گئی۔ ہندوستان میں ابھی حال میں اس قسم کی مشروعات گیہوں، جوار، باجرا اور روئی کی قیمتوں کے لئے کی گئی ہے۔ لیکن اگر کاشتکار سے اس اصلاح و ترقی پر روپیہ اور محنت صرف کرانا ہے جو پیدائش کے اضافہ کے لئے ضروری ہے اور اگر ہندوستان میں مستقبل میں افراط کی معیشت کو پیدا کرنا ہے تو پیداوار کی یقینی فروخت اور نفع بخش قیمتوں کے بارے میں لانبی مدت کے لئے ضمانت کرنا ہوگی، کم سے کم ان غذائی فصلوں کے لئے جو بہت لازمی ہیں اس ضمانت کے ساتھ ساتھ ملک کے مجموعی استحکام اور اطمینان کو قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کی طرف سے اناج کے ایسے ذخیرے رکھے جائیں جو قحط سالی کے زمانے میں کام آسکیں۔

ضروری اصلاحات | پیدائش کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے اہم معاملات جن کی طرف توجہ ضروری ہے حسب ذیل ہیں:۔

کاشتکار کے لئے پٹہ کا کافی حد تک مضبوط اور محفوظ ہونا۔ پرپاسی زمینداروں کا مسئلہ اور رقبہ زیر جوت کا بہت زیادہ منقسم ہونا۔ اگر کسان کو بہترین معاوضہ دلانا اور خریدار کو بہترین پیداوار مہیا کرنا ہے تو کھیت کی پیداوار جن حالات میں موجودہ زمانے میں

فروخت ہوتی ہے وہ بھی اصلاح چاہتے ہیں۔ فروخت کا ایک معقول اور مرتب نظام اسی وقت بن سکے گا جب ایک مقررہ معیاری نوعیت کی چیز کے لئے ایک واجبی قیمت قائم کر دی جائے گی۔ ان معیاروں کی نگرانی کرنے کے لئے منڈیوں کے لئے قواعد و ضوابط بنانا ضروری ہیں۔ اور دکانداروں کو چاہے وہ تھوک ہوں یا خوردہ فروش یا گاؤں کے پھیری والے سب کے لئے لائسنس لینا ضروری کر دیا جائے، اور گاؤں کے اندر فروخت کی تنظیم کو قائم کر دیا جائے۔

یہ نصب العین جو مقرر کیا گیا ہے اسی وقت حاصل ہو سکے گا۔ جب تحقیقات علمی کے سلسلے کو مرکز میں اور صوبوں اور ریاستوں میں خوب ترقی دے دی جائے گی۔ اور ضروری عملہ کو اور ان سہولتوں کو فراہم کیا جائے گا جو تحقیقات کے نتائج کو کسان تک پہنچانے اور زراعت کے روزمرہ کے معمولات میں زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

منصوبے کی کامیابی کے امکانات اس کی اگر ترقی کے لئے جتنے روپے کی ضرورت ہے اسی اس کی تکمیل کی مدت اور اس پر خرچ کا تخمینہ کا انتظام کر دیا جائے اور کسان کے اندر مسلسل کوشش کرنے کے محرکات پیدا کر دئے جائیں اور اس خاکے میں جتنی چیزوں خدمتوں سہولتوں کو ضروری بتلایا گیا ہے ان سب کا بندوبست کر دیا جائے تو زراعتی پیداوار میں سو فی صدی کا امکان ہے۔ پھر چونکہ ان سہولتوں کی فراہمی ان تعمیرات پر ہے جن میں سے بعض ابتدا کرنے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کئی برس لگ جائیں گے اس لئے یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار پندرہ سال سے پہلے دوگنی نہیں کی جا سکے گی گو جنگ کے ختم ہونے سے دس سال کے اندر اندر اس میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔

موجودہ حالات میں اس منصوبہ کی لاگت کا تخمینہ زیادہ تر قیاسی ہو سکتا ہے

کیونکہ بہت سے عامل ابھی تک لا معلوم اور نا قابلِ شمار ہیں۔ لیکن غیر اعادی خرچ کے بارے میں برطانوی ہندوستان کے لئے غالباً یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ سرمایہ کی تعمیر پر دس ارب روپیہ صرف کرنا ضروری ہوگا۔ اس کا اعادی خرچ ۲۵ کروڑ روپے سالانہ سمجھنا چاہیئے۔ جس میں سے تین کروڑ مرکز کو کرنا ہوگا اور ۲۲ کروڑ صوبوں کو۔

حالاتِ حاضرہ

رفتارِ عالم

جنگ کے ساتھ محسوس ہونے والے انقلابوں کا دور ختم ہو گیا، لیکن یہ سمجھنا کہ جنگ کی سخت آزمائش کے بعد کچھ دنوں تک دنیا ایک حالت پر قائم رہے گی اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ البتہ تصادم کے امکانات بہت کم ہو گئے ہیں۔ جاپان کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہی متحدہ اقوام کا ایک دستور مرتب ہو گیا تھا، اور اسی کے ماتحت دنیا کی مختلف سیاسی حلقوں میں تقسیم ہو گئی تھی جس کی بدولت قوت میں توازن پیدا کرنے کی صورت نکالی جا سکتی ہے بغیر اس کے کہ بڑی ریاستوں کی کش مکش خطرناک ہو جائے۔ اس تقسیم کی پوری تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اور شاید اسے وضاحت سے بیان کرنا مصلحت کے خلاف ہو گا۔ بحر الکاہل میں متحدہ ریاستوں کی اغراض کو ترجیح دی گئی ہے، اور چین کو بحر الکاہل کے حلقے میں شامل کرنا غلط نہ ہو گا۔ روس نے چین کی قومی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کر لیا ہے، اور غالباً روس ہی کی کوشش سے قومی حکومت اور چینی کمیونسٹوں میں صلح رہی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روس نے پورے طور پر اور صاف دلی سے متحدہ ریاستوں کا بحر الکاہل اور چین پر حق تسلیم کر لیا ہے مگر دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جاپان کے ساتھ بے جا رعایت کی جا رہی ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاپان قوت کا توازن قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا جائے گا، اور قوت کا توازن روس کے سوا اور کوئی طاقت بگاڑ نہیں سکتی۔ جزائر مشرقی ہند کا مسئلہ ابھی بحث میں نہیں آیا۔ لیکن برہما اور ملایا کا معاملہ طے سمجھنا چاہیے، اور ہند چینی پر فرانسیسی دوبارہ قبضہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہاں کی آبادی ان کی حکومت نہیں چاہتی

اس میں بھی اب کوئی شک نہیں رہا ہے کہ ہانگ کانگ برطانیہ کو واپس ملے گا۔ گویا مشرقی ایشیا میں جنگ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان قوتوں میں سے جو یہاں مقابلہ پر آگئی تھیں، جاپان ایک عرصے کے لئے خارج ہو گیا ہے، اور متحدہ ریاستوں کی حدود مشرقی ایشیا سے مل گئی ہیں۔ چین پہلے کی طرح بیرونی امداد کا محتاج ہے اور اس امداد پر صرف اس کی ترقی ہی نہیں بلکہ اتحاد اور امن و امان کا مدار ہے۔ آگے جو کچھ ہوگا اس میں مقابلہ کرنے والی قوتوں کی دولت اور صنعتی استعداد فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

یورپ کے مسائل بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ وہاں جرمنی نے جن اختلافات سے فائدہ اٹھایا تھا وہ بہت پرانے، شاید ازل سے مقدر ہیں، اور جرمنی کی شکست سے ان کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ روس نے انقلاب کے بعد توسیع کے منصوبے داخل دفتر کر دئے تھے اور اب جو یہ دفتر کھولا گیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ بہت سی کارروائیاں تکمیل کی منتظر ہیں۔ روسی سیاست کی وہی کیفیت ہو گئی ہے جو کسی دفتر کے نگران کی ہوتی ہے جس کے سامنے پرانے کاغذات رکھ دئے جائیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ پڑے کیوں رہ گئے۔ روس نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے، نسلی اور فوجی نقطۂ نظر سے اپنی مغربی سرحد میں ضروری ترمیم کر لی ہے، لندن میں وزیروں کی جو کانفرنس ہو رہی ہے اس میں روسی کوئی مطالبہ اس بنا پر پیش نہ کر رہے ہوں گے کہ وہ روس کی حفاظت کے لئے لازمی ہے۔ اب وہ اس بات کی کسر نکال رہے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد انھیں کچھ نہیں ملا اور پھر قریب بیس برس تک وہ توسیع کے موقعوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پہلی جنگ عظیم میں روس کامیاب ہوا ہوتا تو اسے یقیناً قسطنطنیہ، مشرقی تھریس، بحرۂ ایجین کے کچھ جزیرے، اور ایشیائے کوچک کا ساحلی علاقہ ملتا، اور ان مقبوضات کے ذریعے اسے جو اقتدار حاصل ہوتا اسی کی مناسبت سے وہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اپنے مفاد کی خاطر دخل دیتا۔ اسی بنا پر روس نے اس وقت ترکی سے مطالبہ کیا کہ اسے دردانیال میں برابر کا حق دار مانا جائے، اور اتحادیوں

سے مطالبہ کیا ہے کہ اسے بحر کیسپین کے چند جزیرے، جزائر ڈوڈیکانیز اور اٹلی کی افریقی نوآبادیوں کا ایک حصہ دیا جائے۔ ان مطالبوں سے ترک اور اتحادی دونوں پریشان ہیں، مگر وہ جانتے ہیں کہ روس لڑائی پر آمادہ نہیں ہے، اور ان کی پریشانی ویسی ہی ہے جیسے کسی مدعی کے دعوے دائر کر دینے سے مدعا علیہ کو ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دعوے کو غلط کیسے ثابت کیا جائے۔ ترک دردانیال کے معاملے کو ان ریاستوں کے سامنے پیش کرنے کو تیار رہیں جنھوں نے مونٹرو کے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ غالباً ان کی بریت کے لئے یہ جواب کافی ہوگا۔ مگر اتحادی کیا کریں گے۔ اٹلی سے طرابلس، لبیا، ایرٹریا اور سومالی لینڈ چھینے گئے ہیں اب یہ کس کو دئے جائیں؟ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ متحدہ اقوام کی عملداری میں رہیں اور ایک کمیشن یہاں حکومت کرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں متحدہ اقوام میں سے کسی ایک کی حکومت ہو اور باقی اس کی نگرانی کریں۔ بہر حال فیصلہ متحدہ اقوام کی مجلس حفاظتی کمیٹی کے مستقل اراکین یعنی روس برطانیہ، فرانس، متحدہ ریاستوں اور چین کی سفارش کے مطابق کرے گی اور روسی چاہتے ہیں کہ یہ کمیٹی سفارش کرے کہ اٹلی کی افریقی مقبوضات میں سے کم از کم طرابلس اور ایریٹریا میں متحدہ اقوام کے زیر نگرانی روس کی عملداری ہو۔ انگریز اسے ایک بدیہی بات سمجھتے ہیں کہ دنیا کے اس حصے میں ان کا تسلط ہو، اور جس زمانے میں برطانیہ کا بیڑا سمندر پر راج کرتا تھا، انگریز اپنے حق کو سب سے تسلیم کرا سکتے تھے لیکن اب یہ سند پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے روس کا مطالبہ رد کرنے کے لئے دلیلیں چاہئیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ بحث کرتے وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر بیون کو بار بار غصہ آ جاتا اور وہ میز پر مکے مارنے لگتے۔ مگر مسٹر بیون کی عقل عاجز ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ روس کا مطالبہ مان لیا جائے گا۔ اٹلی کی نوآبادیوں پر برطانیہ کا قبضہ ہے، اور اگر روس — یا متحدہ اقوام — برطانیہ کو بے دخل کرنا چاہتی ہیں تو انھیں جنگ کرنا ہوگی۔ وہ لڑنے پر تیار نہ ہوئیں تو برطانیہ کے قبضہ کو کوئی قانونی شکل دینا ہوگی۔ غالباً ایسا ہی کیا بھی جائے گا۔ لیکن آخری فیصلہ ہونے تک جو بحثیں ہوں گی ان سے روس کو

بھی بڑا فائدہ ہوگا۔ ایک تو یہ بات صاف ہوجائے گی کہ برطانیہ کی سیاست سراسر اغراض پر منحصر ہے اور ان اغراض کو کوئی فضیلت یا تقدس حاصل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ وعدہ کرے گا کہ جب درد انیال کا معاملہ حفاظتی کمیٹی یا متحدہ اقوام کی مجلس یا متحدہ اقوام کی مجلس یا معاہدہ مونترو پر دستخط کرنے والی ریاستوں کے سامنے پیش ہوگا۔ تو وہ روس کی تائید کرے گا، ترکی کا ساتھ نہ دے گا۔

جنوب مشرقی یورپ کے مسائل کو روس کی کج بحثیوں نے بہت پیچیدہ کر دیا ہے۔ خبروں سے کبھی تو معلوم ہوتا ہے کہ روس بعض ریاستوں یا خاص سیاسی پارٹیوں کا حامی ہے، کبھی یقین ہوجاتا ہے کہ یہ بے مہر کسی کا آشنا نہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوب مشرقی یورپ کا ایک جھگڑا طے کیا جائے تو دو نئے پیدا ہوجاتے ہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر روس وہاں کی تحریکوں اور پارٹیوں میں اپنے حامی تلاش کرنے اور انھیں تقویت پہنچانے کے بجائے سب کو شطرنج کے مہرے سمجھے اور جو چال مناسب معلوم ہو چلے۔ اتحادیوں کے لئے اس دوسرے طریقے کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ برطانیہ یونان کو اپنے اثر میں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جو پارٹیاں اس کے موافق ہیں وہ رجعت اور تشدد پسند ہیں۔ اور ان کی سرپرستی کرتے ہیں بدنامی کے بڑے خطرے ہیں۔ یونان کا مطالبہ ہے کہ جنوبی البانیہ اور جزائر ڈوڈکانیز اسے دے دئے جائیں، اور اگر برطانیہ چاہتا ہے کہ یونان اسے اپنا محسن سمجھے، تو اسے یہ علاقے یونان کو دلوانے ہوں گے۔ رومانیہ کے تیل کے کنوؤں اور ریلوں میں برطانیہ کا بہت سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اور اسے کوئی تدبیر کرنا ہے کہ یہ سرمایہ محفوظ ہو جائے یا واپس مل جائے۔ بلغاریہ سے برطانیہ کا کوئی خاص تعلق نہیں مگر بلغاریہ کا مطالبہ ہے کہ اسے جنوبی تھریس میں سمندر تک راستہ دیا جائے، اور بلغاریہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس راستے کی خاطر لڑنے مرنے پر تیار ہوجائیں۔ خصوصاً اگر انھیں خیال ہو کہ روس ان کی مخالفت نہ کرے گا۔ بلغاریہ کی طرح یوگوسلاویہ بھی مقدمے کا ایک فریق ہے۔

جس سے برطانیہ کو کوئی تعلق اور ہمدردی نہیں۔ مگر مقدمہ بہت پیچیدہ ہے۔ یوگو سلادیہ کا مطالبہ ہے کہ اسے ٹریسٹ اور فیوم کی بندرگاہیں دے دی جائیں، اس لئے ان شہروں اور ان کے نواح کی آبادی بیشتر سلاف ہے۔ مارشل تیتو ان دونوں شہروں پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اور اب وزیروں کی کانفرنس کو طے کرنا ہے کہ ان دونوں شہروں کے متعلق کیا سفارش کی جائے۔ اگر روسی مارشل تیتو کے ہم نوا ہو جاتے تو فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا، برطانیہ کو رومانیہ میں رعایتیں حاصل ہو جائیں اور ٹریسٹ اور فیوم یوگو سلادیہ کو مل جاتے۔ مگر روسی سیاست جذبات سے بالکل خالی معلوم ہوتی ہے۔ وہ مارشل تیتو کے حق کو بھی مانتی ہے آسٹریا کی نئی حکومت کی بھی سرپرستی کر رہی ہے، اور اس دلیل کو بحث سے خارج نہیں کرنا چاہتی کہ ٹریسٹ سنہ ۱۹۲۰ء تک آسٹریا کے قبضے میں تھا اور اٹلی نے اتحادیوں کی مرضی کے خلاف اُسے زبردستی حاصل کر لیا۔ اب اگر اتحادیوں کو اختیار ہے کہ وہ اس شہر کو جسے چاہیں دے دیں تو آسٹریا کے حق کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ روسیوں کو جو کچھ لینا تھا وہ لے چکے ہیں، ان کے مفاد کے لئے جو کچھ ضروری تھا وہ انھوں نے بحث کئے بغیر حاصل کر لیا، اب وہ ایسی منطق چھانٹ رہے ہیں کہ جن سے ان کا مطلب واضح نہیں ہوتا اور دوسرے اپنی غرض کو بے حجاب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔



WHAT SCIENCE CAN PRODUCE
Cipla
REMEDIES
PRODUCTS OF INTERNATIONAL STANDARD & QUALITY
CHEMICAL, INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES LTD., BOMBAY—8.

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

تاریخ الامّت (مکمل)

ذوالحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر تاریخ اسلام - سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں - آٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہے - قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفے پر حاوی ہے - قیمت مکمل سٹ ۱۵؍ ۸ر

مت (ڈراما) ڈاکٹر سید عابد حسین	عمر	نقش آخر (ڈراما) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	عمر
انتخاب میر - مولوی نورالرحمٰن	۸ر	باغبانی پروجکٹ (اسکولوں کے لئے)	۱۲ر
سیاسیات کی پہلی کتاب	۸ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر
بادشاہ (پرنس کا ترجمہ)	۸ر	عہد نبوی میں نظام مملکت	۸ر

ننھی مرغابی	۵ر	تانبیل خاں	۵ر	سمندر کا عجائب خانہ	عمر
رولی ٹکس نے پکائی	۹ر	چیو متو	۵ر	عقائد اسلام	۳ر
جادو کا گھر	۸ر	لال مرغی	۲ر	ارکان اسلام	۲ر
لومڑی کا گھر	۸ر	دو بھائی	۸ر	ہمارے نبی	۲ر
بی مینڈکی اور کوا	۷ر	عقاب	۸ر	ہمارے رسول	۱۰ر
بندر اور نائی	۹ر	ایورسٹ کی داستان	۵ر	سرکار کا دربار	عمر
ہیو جیو	۸ر	تاریخ ہند کی کہانیاں نمبر ۱	۷ر	سرکار دو عالم	عمر
پان کھا کر طبلہ بجائے	۸ر	" " " نمبر ۲	۸ر	رسول پاک	۸ر
چل میرے مٹکے ٹمک ٹم	۸ر	ترکوں کی کہانیاں	۷ر	خلفائے اربعہ	عمر
پھر مگیوں کیا خاک ؟	۸ر	دنیا کے بچے	۱۰ر	دس جنتی	۱۰ر
پکڑو دم کے ڈکو	۸ر	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	نبیوں کے قصے	۱۰ر
تارا دھرمی تارا	۸ر	مقناطیس کی کہانی	۵ر	محاسن اسلام	۸ر
بچوں کی کہانیاں	۵ر	بجلی کی کہانی	۴ر	قومی نظمیں	۸ر
جنگو کی بلی	۵ر	بجلی اور مقناطیس کی کہانی	۸ر	بچوں کا کھلونا	۱۲ر

محنت (ڈراما) ۷ر — شریر لڑکا (ڈراما) ۶ر

ہمارا مکمل پتہ :- **مکتبہ جامعہ دہلی**

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴۱ نمبر ۱	بابتہ ماہ اکتوبر ۵۸ء	سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن - محبوب المطابع پریس، دہلی۔

انگریز اور اُن کی تہذیب

براعظم یورپ کے شمال مغرب میں برطانیہ کا جزیرہ واقع ہے جس کا شمالی حصہ اسکاٹستان اور جنوبی حصہ انگلستان اور ویلس پر مشتمل ہے۔ انگلستان کم وبیش ایک مثلث کی شکل رکھتا ہے جو اوپر سے پتلا اور نیچے سے چوڑا ہے۔ شمالی انگلستان، اسکاٹستان کی طرح پہاڑی علاقہ ہے۔ جنوب میں زیادہ تر سرسبز میدان اور جابجا چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کے سلسلے ہیں۔ بے شمار ندیاں اور چشمے زمین پر خاموشی سے بہتے ہیں۔ آب و ہوا شمالی یورپ کے اور سب ملکوں کے مقابلے میں معتدل مگر بے حد تغیر پذیر ہے یوں تو نہ بہت سخت سردی پڑتی ہے نہ تکلیف دہ گرمی، نہ بہت بارش ہوتی ہے نہ شدید طوفان آتے ہیں۔ لیکن موسم اس قدر تیزی سے رنگ بدلتا ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا دم بھر میں کیا ہونے والا ہے، صبح کہر چھایا تھا، ہوا بند تھی اور دم گھٹ رہا تھا۔ دن چڑھے زور سے ہوا چل رہی ہے۔ دوپہر کو آسمان صاف تھا اور دھوپ ناگوار حد تک تیز، سہ پہر کو بارش ہونے لگی اور سردی سے انگیٹھی جلانے کی ضرورت پڑ گئی۔ ایسے ملک کے باشندوں کو بہت چست اور چوکس ہونا چاہیے۔ ہر سمت کی ہوا کے ساتھ چلنے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنا چاہیے۔ چنانچہ واقعی یہ صفات اہل انگلستان میں ہمیشہ سے پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ ملک میں ہر طرح کے جانور چرند پرند نہایت کثرت سے ہیں اور کسی زمانے میں درندے بھی بہت تھے اس لئے شکار ابتدا سے انگریزوں کا خاص مشغلہ رہا ہے اور اس نے ان کی سیرت پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اس نے اُن کے اندر جفاکشی، حزم و احتیاط صبر اور وہ مخصوص خصلت پیدا کر دی ہے جو ان کی اصطلاح میں "Sportman's Sprit" شکاری یا کھلاڑی کی آن کہلاتی ہے یعنی جب تک کامیابی کی خفیف سی امید باقی ہو حریف کو پچھاڑنے کی دل و جان سے کوشش کرنا

لیکن جب ناکامی کا یقین ہو جائے تو کھلم کھلا ہار مان لینا اور اُسے پُروقار سکون کے ساتھ برداشت کرنا، اس کے لئے جو ہمت، دلیری، اخلاقی جرأت اور ضبط درکار ہے وہ انگریز قوم میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ خصوصاً ضبط کے معاملے میں تو دنیا کی کوئی قوم انگریزوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی لیکن اس ضبط میں ان کی جسمانی اور اخلاقی مضبوطی کے علاوہ اُن کی ذہنی اور جذباتی سُستی کو بھی بہت دخل ہے اور شمالی قوموں کی طرح ان میں بھی تخیل کی کمی ہے اور اُن کے احساس کی لَو قلب کی گہرائی میں خاموشی اور آہستگی سے بہتی ہے۔ وہ ہر محرک کا اثر دیر میں قبول کرتے ہیں اور یہ اثر خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو دیکھنے والے کو خفیف معلوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں قدرتی طور پر اپنے جذبات پر قابو حاصل ہے اور ان کے لئے قول و فعل میں ضبط سے کام لینا آسان ہے۔ اس ضبط کا اظہار سب سے زیادہ طنز اور مزاح کے ذریعے سے ہوتا ہے جو انگریز قوم اور اس کے ادب کی سب سے نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی ہیں انگریزوں کا طنز عموماً بات کو بڑھا کر یا گھٹا کر کہنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ جہاں دوسرے اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں پر جھنجھلاتے یا روتے ہیں وہاں انگریز عام طور پر اپنے غم و غصے کو طنز کے پردے میں چھپا کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذمت کے موقع پر وہ مبالغہ آمیز تعریف سے اور تعریف کے موقع پر بہت ہی خفیف اظہار ناپسندیدگی سے کام لیتے ہیں خصوصاً اپنی صفات یا کارناموں کے بیان کرنے میں انگریز کا حجاب، تامل اور طنز آمیز انکسار مشہور ہے غرض ان کے طنز کا مقصد عموماً دوسروں پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اپنے جذبات پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے اور اگر کبھی اسے آلۂ حرب کے طور پر استعمال بھی کرتے ہیں تو نفرت کے زہر میں بجھا کر نہیں بلکہ مزاح کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کرکے۔ مزاح کا بھی سب سے اہم مصرف انگریز کے ہاں یہی ہے کہ جو چیز ناگوار ہے اس کے مضحک پہلو کو نمایاں کرکے تلخی اور مایوسی کے جذبات کو دھیما کیا جائے۔ دوسرا کام اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ جو شخص فکر و عمل کے بندھے ٹکے راستے کا اخلاق و معاشرت کے رسمی معیار سے انحراف کرے، خواہ وہ مجنون ہو یا حکیم۔ مجرم ہو

یا مصلح، اسے تضحیک کی زنجیر میں جکڑ کر پھر پرانی ڈگر پر لانے کی کوشش کی جائے غرض انگریزوں کا ضبط اپنی بہترین شکل میں حکیمانہ اعتدال اور درویشانہ صبر اور بدترین شکل میں دہقانی جمود اور بے حسی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

حقیقت میں دہقانیت کا رنگ جو عہد وسطیٰ میں سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا انگلستان میں اور ملکوں کے بہت بعد تک چھایا رہا، اس لئے کہ یہ الگ تھلگ جزیرہ ہونے کی وجہ سے براعظم کی تہذیبی تحریکوں کا اثر بہت دیر کے بعد اور بہت کم قبول کرتا تھا بلکہ اب بھی ایک حد تک دہقانیت کی بنیادی صفات انگریزوں کی طبیعت میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں روایات پرستی ہے، ان کی ریاست کا کوئی دستور اساسی لکھا ہوا موجود نہیں ہے۔ بلکہ بعض روایات کی شکل میں ہو۔ اور یوں بھی امور عامہ کی تنظیم کے لئے تحریری ضوابط بہت کم ہیں۔ زیادہ تر رواج عام اور روایات قدیم کی پابندی کی جاتی ہے اور ان بن لکھے قوانین کا انگریز دل سے احترام کرتے ہیں۔ دہقانوں کی طرح وہ مذہبی اصول، اخلاقی ضوابط، معاشری رواج، اور خاندانی دستوروں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ سب کو یکساں اور واجب التعمیل سمجھتے ہیں۔ ان کی کم آمیزی، دیرآشنائی، اجنبیوں سے وحشت ان کا یہ خیال کہ ان کی ریاست دنیا کی واحد ریاست اور ان کی تہذیب دنیا کی واحد تہذیب ہے، اور ان کا تصور حیات وہ معیار ہے جس پر ساری دنیا کو پرکھنا چاہیئے، سب چیزیں دہقانی تنگ نظری کا ثبوت دیتی ہیں۔

یہ اہل انگلستان کی سیرت کے بنیادی عناصر ہیں جو طبیعی ماحول کے اثرات اور نسلی خصوصیات نے ان میں عہد وسطیٰ کے شروع ہونے سے پہلے ہی پیدا کر دیئے تھے۔ اس وقت تک یہاں کی آبادی قدیم آئبیرین کیلٹ اور مختلف شمالی نسلوں اینگل، سیکسن، جوٹ، ڈین وغیرہ کا معجون مرکب تھی جن میں سے کوئی نسل بھی ابتدائی تہذیب کے درجے سے آگے بڑھی ہوئی نہ تھی۔ پہلی مہذب قوم جس سے اہل انگلستان کو سابقہ پڑا، رومیوں کی قوم تھی جو ان کے ملک کو فتح کر کے ایک مدت تک اس پر حکومت کرتی رہی، رومیوں کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ سارے ملک میں سڑکیں

تعمیر کرکے آمد و رفت میں آسانی پیدا کی اور لوگوں کو امن کی زندگی کا عادی بنایا لیکن اہل انگلستان کی مجموعی سیرت اور تہذیب پر وہ کوئی نمایاں اثر نہیں ڈال سکے۔ البتہ نارمن قوم نے جو عہد وسطیٰ میں آکر انگلستان پر قابض ہوگئی، تین سو سال کے تسلط میں انگریزی زبان معاشرت اور مجموعی تہذیب کو بہت کچھ متاثر کیا۔ نارمن بھی شمالی نسل تھے، مگر ایک مدت سے ہجرت کرکے شمال مغربی فرانس کے صوبہ نارمنڈی میں آباد ہوگئے تھے اور یہاں عہد وسطیٰ کی یورپی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ ان کی بدولت انگریزوں میں کچھ نرمی، لوچ اور شائستگی پیدا ہوئی۔ یہ اپنے ساتھ بانکپن کا نظام لے کر آئے اور اس نے انگلستان کی قدیم دہقانیت کے ساتھ مل کر "جنٹلمین" کا تصور پیدا کیا۔ جو اس وقت سے آج تک انگریزوں کا اخلاقی نصب العین ہے، بانکپن کے سپاہیانہ اخلاق کا اصل اصول یہ ہے کہ حریف غالب سے عزت کا، برابر والے سے انصاف کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ کمزور جب تک مقابلہ کرے اسے بیدردی سے کچلنا چاہیئے اور جب ہتھیار ڈال دے تو اس کے ساتھ حقارت آمیز رحم سے پیش آنا چاہیئے۔ عہد وسطیٰ میں یہ ضابطہ اخلاق یورپ کے اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی طبقۂ امرا تک محدود تھا، وہ ایک دوسرے سے حالت امن اور حالت جنگ میں ہمیشہ شریفانہ اور منصفانہ برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن نیچے طبقوں کو اسی برتاؤ کا مستحق نہیں جانتے تھے۔ بلکہ اُن کے مقابلے میں طاقت کو حق سمجھا جاتا تھا عہد جدید میں رفتہ رفتہ قومی اتحاد کے احساس نے طبقہ واری احساس کو کسی قدر کمزور کردیا اور قوم کا ہر فرد قانونی اور اخلاقی حیثیت سے مساوی قرار دیا گیا جہاں تک بیرونی اقوام کا تعلق ہے۔ امریکی اور یورپی قومیں جس حد تک وہ انگریزوں سے مشابہت رکھتی ہیں شرافت و انصاف کے سلوک کی مستحق سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ایشیا اور افریقہ کی قوموں کے لئے دوسرا معیار ہے کمزور قومیں نیم مہذب یا غیر مہذب کہلاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ سختی اور ذلت کا برتاؤ ہوتا ہے۔ لیکن جو قومیں تلوار کے زور سے اپنا مہذب ہونا منوا لیں وہ عزت کی نظر سے

دیکھی جاتی ہیں۔

کلاسیکی علوم کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کی تہذیبی تحریکیں جنھوں نے براعظم یورپ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ انگلستان تک پہنچتے پہنچتے اس قدر ہلکی ہوگئیں کہ وہ انگریزوں کی سیرت میں کوئی خاص تغیر پیدا نہ کرسکیں۔ اس میں شک نہیں کہ ملکہ الزبتھ کے زمانے میں ادب اور آرٹ کی ایک بڑی تخلیقی لہر شکسپیر کو اپنے دوش پر لئے ہوئے اُٹھی۔ لیکن جو ذہنی بیداری نشاۃ ثانیہ نے پیدا کی وہ ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود رہی۔ پوری انگریزی قوم پر اس تحریک کا اثر ذہنی زندگی میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں نظر آتا ہے اس نے انھیں جہازرانی اور بحری قزاقی کے بڑے بڑے کارناموں پر ابھارا۔ اور اپنی قومی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور حریفوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ دلایا۔ ان میں الزبتھ اڈریک ریلے جیسی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ جنھوں نے اسپین کی زبردست سلطنت کے دانت کھٹے کردئے اور ہنری ہشتم جیسا دبنگ بادشاہ جس نے یورپ کی دینی قیادت کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیا اور انگلستان کا جداگانہ قومی کلیسا قائم کرلیا۔

تجدید تہذیب کی تحریک جرمنی سے اٹھی تھی۔ انگریزوں کے ذہن پر نشاۃ ثانیہ سے کہیں زیادہ اثر انداز ہوئی لیکن یہ اثر انگلستان کے سرکاری کلیسا کے ذریعے نہیں پڑا بلکہ آزاد فرقوں کے ذریعے جو لوتھر کے پروٹسٹنٹ مذہب کے مقابلے میں کیلون کے مذہب سے زیادہ قریب تھے۔ انگلستان کے سرکاری کلیسا نے حقیقت میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذہب کے بین بین راستہ اختیار کیا یعنی انجیلی عقائد تو لوتھر سے لئے اور کلیسا کی تنظیم بالکل رومی کلیسا کے طرز پر رکھی۔ مگر یہ دونوں چیزیں عام انگریزوں کی طبیعت سے زیادہ مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ سرکاری کلیسا کی پیروی محض ایک قانونی فرض سمجھ کر کرتے تھے اس سے وہ قلبی تعلق نہیں رکھتے تھے جو مذہبیت کی جان ہے۔ ان میں مذہبی روح کو بیدار کرنے والی حقیقت میں پیوریٹن تحریک تھی جو مختلف آزاد قوموں کے ذریعے ملک میں پھیلی اور عام انگریزوں

کے دل و دماغ پر چھا گئی ۔ یہ مذہبی تحریک کیلون کی تعلیم پر مبنی تھی اور ایک اکھڑ جفاکش اور جنگجو قوم کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی تھی پیورٹین مذہب کے نقطۂ نظر سے اخلاقی زندگی حق و باطل میں اور شیطان کی کش مکش کا نام ہے ۔ خدائے تعالےٰ اپنے خاص بندوں کو اس کام پر مامور کرتا ہے کہ شیطانی قوتوں کو شکست دے کر حق کی حکومت دنیا میں قائم کریں اس جدوجہد میں کامیاب ہونے کا انعام دولت اور حکومت ہے جو فضل الٰہی سے برگزیدہ قوموں کو عطا ہوتی ہے ۔ پیورٹین عقیدے نے جہاں انگریزوں کی سخت کوشی ۔ جفاکشی ، ضبط نفس اور خشک مزاجی کو اور پختہ کر دیا وہاں ان کے کسب زر کے شوق ملک گیری کی ہوس کو بھی مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا ۔ ان کو یقین ہو گیا کہ ان کی قوم خدا کے برگزیدہ بندوں کی جماعت ہے جو دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور سیاست اور تجارت میں ان کی کامیابی خدا کی خوشنودی کی نشانی ہے ۔

عقلی فلسفے کی لہر جو اٹھارھویں صدی میں جرمنی اور فرانس کو بہالے گئی تھی ۔ انگلستان کے ساحل سے ٹکرا کر لوٹ گئی ۔ عقلیت نے انگریزوں کو صرف اتنا متاثر کیا کہ ان کی تمدنی زندگی کے اصول جو پہلے مبہم تھے اب واضح ہو گئے اور ان سے ایک کم و بیش مربوط فلسفۂ حیات بن گیا ۔ اس کا ذکر ہم آگے کریں گے ۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس فلسفۂ زندگی کے تین اہم اجزار تھے ۔ تجربیت کا علمیاتی تصور ، افادیت کا اخلاقی تصور اور انفرادی آزادی کا سیاسی تصور جس نے پیورٹن مذہب کے سلسلے میں مذہبی عقیدے کی شکل اختیار کر لی اور جس کی تبلیغ تشدد اور جوش و خروش کے ساتھ ساری دنیا میں کی جانے لگی ۔

انیسویں صدی میں انگریزی تہذیب کے ان بنیادی تصورات میں اور زیادہ وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی ۔ خصوصاً سیاسی آزادی کے تصور کا دائرہ اتنا پھیلا کہ ساری قوم کو محیط ہو گیا ۔ یہی نہیں بلکہ عملاً ہر طبقے کے لوگوں کو مساوی سیاسی حقوق حاصل ہو گئے

اور معاشی آزادی نے نظام سرمایہ داری کی صورت اختیار کرلی جو انفرادیت کی آخری حد ہے۔ یہ نظام یوں تو صنعتی انقلاب کے بعد یورپ کے سبھی ملکوں میں پہلے سے زیادہ تیز رفتار سے پھیلنے لگا۔ لیکن جتنی کامیابی اُسے انگلستان میں حاصل ہوئی اور کہیں نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ یہ ہر لحاظ سے انگریزوں کے قومی مزاج کے موافق تھا۔ یہ نظام اُن کی قوت ارادی اور قوت عمل کو جولانی دکھانے کا اور اُن کے حب مال اور حب جاہ کو تسکین پانے کا موقع دیتا تھا۔ ملکیت ذاتی کے احترام اور حکومت وقت کے استحکام کی ضمانت کرتا تھا۔ مادیت کی قبیح شکل کو ظاہری مذہبیت کے خوش نما پردے میں چھپاتا تھا تجربیت کو اپنا فلسفیانہ طریق اور افادیت کو اپنا اخلاقی نصب العین مانتا تھا، اور اخبارات کے ذریعے عوام کے جذبۂ آزادی کو مجروح کئے بغیر ان کو حکمراں طبقے کے اشاروں پر چلاتا تھا مختصر یہ کہ نظام سرمایہ داری انگریز قوم کی فطرت کے ہر تقاضے کو پورا کرتا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس صدی میں انگلستان کے سیاسی نظام میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ طبقۂ امراء کی بلا شرکت غیرے حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ صرف متوسط طبقے بلکہ نچلے طبقے نے بھی سیاسی حقوق میں برابر کا حصہ حاصل کرلیا۔ تہذیبی اور مادی دولت در اصل طبقۂ اشراف ہی کے ہاتھ میں رہی مگر اس میں سے بھی عوام کو اتنا تو دینا ہی پڑا کہ وہ جانوروں سے کچھ بہتر زندگی بسر کرسکیں اس کے لئے ضروری تھا کہ ریاست کے اختیارات میں اضافہ ہو اور انفرادی آزادی پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ چنانچہ ریاست نے مزدوروں کی اجرت، اراضی کے استعمال مکانوں کی تعمیر کے قواعد وضوابط بنائے۔ نئے نئے محصول عائد کئے، مفت اور جبری تعلیم نافذ کی۔ غرض فرد کی زندگی کے مختلف شعبوں میں مداخلت شروع کردی۔ لیکن یہ تبدیلیاں آہستہ آہستہ نہایت احتیاط سے کی گئیں تاکہ ماضی سے رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔ انفرادیت کا نصب العین ترک نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو

قومی ریاست اور اس کے برتر حقوق کا تصور بھی پیدا ہو گیا اور دونوں میں مصالحت کی کوشش کی جانے لگی۔

یہ خارجی تبدیلیاں اس تغیر کا مظہر تھیں جو انگریزوں کے نفس کی گہرائیوں میں واقع ہو رہا تھا۔ پیورٹین عقیدے کا تشدد اب اپنا رُخ بدل رہا تھا اور اپنے نقطۂ نظر اور دائرہ عمل کو وسیع کر رہا تھا۔ اس کا اظہار اب مذہبی زہد خشک کی شکل میں نہیں بلکہ سیاسی قومی جوش کی شکل میں ہو رہا تھا۔ اس کا مطمح نظر اب محض دیندار تاجر کی فلاح و بہبود نہیں تھا بلکہ برطانوی قوم کو آزاد، مہذب اور خوش حال بنانا، اس کی سیادت روئے زمین پر قائم کرنا۔ اس کی تہذیب کو اور اس کے مخصوص جمہوری اداروں کو دنیا میں پھیلانا۔ اس تحریک نے جو انگلستان کے اندر جمہوری قومیت اور باہر برطانوی سامراج کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ درحقیقت اب انگریزوں کے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ عیسوی مذہب کو انھوں نے ترک نہیں کیا۔ مگر اس سے ان کو قلبی تعلق نہیں رہا۔ اذعانی عقیدے کو ماننے والے بہت کم اور اس کے عبادات و رسوم کو ادا کرنے والے اس سے بھی کم رہ گئے۔ یورپ کے اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی اجتماعی زندگی کا مرکز مذہب نہیں بلکہ ریاست بن گئی۔ لیکن یہ جرمن ریاست کی طرح مطلق اور مستبد نہ تھی بلکہ مشروط اور جمہوری۔

مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ انگریزوں کی قوم بنیادی طور پر ایک عملی قوم ہے جس کی فطرت اور تقدیر کا اظہار برطانوی قومیت کی تشکیل اور برطانوی سلطنت کی تعمیر کے ذریعے سے ہوا۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ذہنی زندگی کی صلاحیتوں سے محروم رہے اور اس نے اس میدان میں کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ مجموعی حیثیت سے حکمت و فلسفہ اور فنون لطیفہ میں انگریزوں کا حصہ، اطالیوں، فرانسیسیوں اور جرمنوں کے برابر نہیں لیکن انفرادی حیثیت سے دیکھئے تو ان میں ایسے ایسے فلسفی اور فن کار پیدا ہوئے ہیں جن کو یورپ کی تاریخ میں نمایاں جگہ حاصل ہے۔ ان کے ادیبوں اور شاعروں کے بہترین کارنامے

پر انھوں نے ملکیت اور آزادی کے حقوق فرماں روا کی نظر کردئے ، اور اسے اُن پر غیر محدود اختیار حاصل ہوگیا۔ دوسری طرف لاک نے فطری زندگی کے ایک مختلف تصور کی بنا پر معاشرہ عمرانی کو بالکل دوسرے رنگ میں پیش کیا۔ اس کے نزدیک فطری زندگی آزادی اور امن کی زندگی تھی۔ قانونِ فطرت کے مطابق ہر انسان دوسرے سے وہی سلوک کرتا تھا جس کی وہ خود ان سے توقع رکھتا تھا۔ اسی قانون کو باضابطہ اور منظم شکل دینے کے لئے ریاست قائم کی گئی۔ جمہوریت جس کے اندر فرد کے فطری حقوق پوری طرح محفوظ رہتے ہیں، ریاست کی فطری شکل ہے

ہابز اور لاک دونوں کے سیاسی تصورات فرانسیسی فلسفی روسو کی طرح انفرادیت پر مبنی تھے۔ سب سے پہلے ہیوم نے جو اجتماعی افادیت کے اخلاقی نظریے کا بانی تھا۔ اس نظریے کو سیاسیات پر عاید کیا اور فطری حقوق اور معاہدہ اجتماعی کے تصورات کو رد کرکے انفرادیت کا خاتمہ کردیا۔ ہیوم کے نزدیک اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ فرد کی اغراض اور مفاد عامہ میں مصالحت پیدا کی جائے۔ اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت قائم کی جاتی ہے بینتھم نے افادیت کے اخلاقی اور سیاسی نظریے کی تکمیل کرکے اسے انگلستان کے قومی فلسفہ کے درجے پر پہنچا دیا۔ اسی کے خیالات سے متاثر ہوکر رکارڈو نے معاشیات کو جیمس مل نے انگلستان کے دستور کو اور آسٹن نے قانون کو افادیت کے رنگ میں رنگنے کی کوششیں کیں۔ جان اسٹوارٹ مل نے جو انفرادی آزادی کا پرجوش حامی تھا۔ افادی نظریہ ریاست کی کھلم کھلا مخالفت تو نہ کی لیکن ریاست کے دائرۂ عمل کو محدود کرنے اور فرد کے دائرہ حقوق کو وسیع کرنے پر اتنا زور دیا کہ حقیقت میں اجتماعی افادیت کا محض نام ہی نام رہ گیا۔ ہربرٹ اسپنسر نے سیاسیات کی بنیاد حیاتیات پر رکھنے کی کوشش کی اور ریاست کو ایک جسم نامی فرض کرکے یہ ثابت کرنا چاہا کہ جس طرح جسم نامی کے مختلف اعضا کے وظائف کو حیاتی ارتقا نے رفتہ رفتہ معین کردیا ہے اور ہر ایک کو ایک مستقل حیثیت دے دی ہے اسی طرح سیاسی

ارتقار کے ذریعے ریاست کے اعضار یعنی افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ ریاست کو ان کی زندگی میں کوئی دخل نہ رہے۔ آگے چل کر اسپنسر کو خود محسوس ہوا کہ نہ تو ریاست کو جسم نامی پر قیاس کرنا صحیح ہے اور نہ اس سے وہ نتیجہ نکلتا ہے جو وہ نکالنا چاہتا ہے۔ اس لئے مجبور ہو کر اُسے انفرادیت کی حمایت کے لئے حقوقِ فطری کے فرسودہ نظریے سے کام لینا پڑا۔ مل اور اسپنسر کے انفرادی نظریوں پر عینیت پسندوں کے علاوہ تجربی مفکروں نے بھی بہت کچھ تنقید کی، غرض انفرادیت اور اجتماعیت کا تضاد انگریزوں کی واقعی زندگی کی طرح ان کی اخلاقی اور سیاسی فکر پر برابر باقی رہا۔

اس تجربی طرزِ خیال کے مقابلے میں ایک تصوری اور عینی طرزِ خیال بھی انگلستان میں ابتدا سے اب تک اپنے آپ کو علمی فکر کے مختلف شعبوں میں ظاہر کرتا رہا ہے۔ نظریہ علم کے میدان میں اس کے علم بردار تجربیت کے مقابلے میں وجدانیت کو پیش کرتے ہیں۔ جس کی رو سے علم انسانی کا سرچشمہ "خلقی تصورات" ہیں جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں۔ تجربی مفکروں کے مقابلے میں یہ عینیت پسند مابعد الطبیعی مسائل سے کہیں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم لوگوں نے اپنے خیالات کو فلسفیانہ نظم و ترتیب کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ مثال کے طور پر برکلے کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے روحانیت یا عینیت کا ایک باضابطہ نظریہ پیش کیا۔ لیکن نظری فلسفے سے زیادہ اہم اور قابلِ قدر ان حضرات کے اخلاقی تصورات ہیں، جن کا انگریزوں کے اونچے طبقوں پر بہت گہرا اثر پڑا۔ یوں تو ان کے اخلاقی نظریے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن سب میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ محض راحت یا افادے کو قدرِ اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے، بلکہ کسی غیر مادی، ابدی قدر کو عمل اخلاقی کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ مثلاً کڈورتھ اشیار کے معنوی تصورات کو کلارک کائنات کی منطقی ترتیب کو اور شیفٹسبری اس کی جمالی آہنگی کو اخلاقی معیار سمجھتا ہے جس پر انسان کے عمل کو پرکھنا چاہیے۔

سیاسیات میں بھی عینی طریقۂ فکر کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سب سے پہلے مشہور مدبر اور خطیب ایڈمنڈ برک کے خیالات میں عینیت کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اس نے ریاست کا کوئی واضح علمی تصور پیش نہیں کیا ہے۔ البتہ خطیبانہ انداز میں اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ ایک مقدس فوق الافراد ادارہ ہے۔ اس کی ابتدا چاہے جس طرح ہوئی ہو، اب یہ جماعت کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے لئے ناگزیر بن گیا ہے اور افراد کی خواہش اور ارادے کا پابند نہیں رہا۔ دراصل عینیت کی تحریک انگلستان کی سیاسی فکر میں کانٹ اور ہیگل کے اثر سے شروع ہوئی۔ اس لئے اس کے سب سے ممتاز نمائندے گرین، بریڈلے اور بوزین کوئٹ تھے۔ ان کا انگلستان میں عام طور پر تو زیادہ چرچا نہیں ہوا، لیکن یہ آکسفورڈ میں بہت اثر رکھتے تھے اور اس طرح وہ طبقہ جس نے انگلستان کے مدبر اور اور قومی رہبر پیدا کئے ہیں۔ اُن کے خیالات سے متاثر ہوا اور اس نے عملی سیاسیات میں ان کے خیالات کے مطابق اصلاحیں کیں" انیسویں صدی میں انگلستان کے سیاسی نظام میں وہ زبردست تبدیلی جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں حقیقت میں انھی مفکروں کی تعلیم کی بدولت پیدا ہوئی۔ اسی نے پیورٹین عقیدے کا رُخ قومیت اور قومی ریاست کی طرف پھیر دیا۔ اسی کی بدولت ریاست غیر محسوس طور پر جمہور کی عقیدت اور احترام کا مرکز بن گئی اور اس کے اختیارات میں روز بروز توسیع ہونے لگی۔ بریڈلے اور بوزین کوئٹ نے زیادہ تر ہیگل کے سیاسی فلسفے کی تعبیر و تفسیر پر اکتفا کی۔ انھوں نے ہیگل کی طرح ریاست کو ہمہ گیر ذہن اور اختیار مطلق کا کامل اور افراد کی غیر مشروط اطاعت کا مستحق قرار دیا، برخلاف اس کے گرین نے ہیگل اور کانٹ دونوں کے خیالات کو سمونے کی کوشش کی اور ریاست کے عینی نظریے میں انفرادیت کے تصور کو معقول جگہ دے کر اسے انگریزی ذہن کے لئے قابل قبول بنا دیا۔ وہ ریاست اور معاشرے کی اہمیت اور عظمت کا قائل ہے لیکن اس کا مقصد اور اس کی کامیابی کا معیار یہ قرار دیتا ہے کہ اس کے اندر فرد کی شخصیت

ِ پوری طرح نشوونما کا موقع ملے۔ ریاست کے فرائض کے بارے میں بھی وہ اعتدال کی
اہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ " ریاست کے ذریعے سیاسی نظام، قانون
ور معاشرت کی ایک مخصوص شکل میں مجسم ہوجاتا ہے، اور ریاست ہی تعلیم اور معاشرتی اداروں
ے توسط سے افراد میں اس قدر انضباط پیدا کرسکتی ہے کہ وہ اپنے معیار اخلاق کے مطابق
ل کرنے کے لائق ہوجائیں۔ لیکن اسی کے ساتھ گرین یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ریاست کا
رض صرف رکاوٹیں دور کرنا ہے۔ انسان کی اخلاقی ترقی اس کے اپنے ارادے سے
ہوتی ہے۔ ریاست کا اس سے زیادہ حوصلہ کرنا ہر طرح سے مضر ثابت ہوگا "

اجتماعیت اور عینیت کا یہ معتدل تصور اس لبرل سیاسی تصور کا زبردست حریف
ثابت ہوا ہے جو مل اور اسپنسر کی انفرادیت اور بنتھم کی افادیت پر مبنی تھا، اور اشتراکی
خیالات کی نشوونما سے اجتماعی رجحان کو اور تقویت پہنچی۔

لیکن انگریزوں کی منطقی فکر سے کہیں زیادہ اہم ان کی جذباتی اور تخئیلی فکر ہے۔
جو شاندار انگریزی ادب اور شاعری کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یوں تو فنونِ لطیفہ میں
بھی انگلستان بڑے بڑے نام پیدا کرسکتا ہے، مثلاً تعمیر میں رین، موسیقی میں پرسل
موسیقی میں کانسٹیبل، ٹرنر، رینالڈس اور ہوگارتھ لیکن چند افراد کے کارنامے
اس خیال کی تردید کے لئے کافی نہیں ہیں کہ انگریزی قوم کا ذہن فنونِ لطیفہ سے محض
سطحی علاقہ رکھتا ہے۔ اور ان کی اتھاہ گہرائیوں میں اترنے سے گھبراتا ہے۔ دراصل ان کے
تخیل شدید، سست رو مگر پائدار مبہم اور حجاب آگیں احساس کے اظہار کے لئے سب سے
زیادہ موزوں شعر و ادب کا میدان تھا اور اسی میں انھوں نے بحیثیت قوم کے اپنے جوہر
دکھائے۔ شکسپیر جس کا ذکر ہم عہد جدید کے ہراول کی حیثیت سے کرچکے ہیں۔ ڈراما میں دنیا
سے اپنی عظمت تسلیم کراچکا ہے۔ طنزیہ شاعری میں پوپ اور بائرن اپنے اپنے طرز میں
بے نظیر ہیں۔ قصصی شاعری یا ایپک میں ملٹن کی فردوس گمشدہ، ہومر، ورجل، فردوسی کا

اور ڈانٹے کے شاہکاروں کے برابر جگہ پانے کی مستحق ہے۔ غنائی شاعری میں شکسپیر، ملٹن
بلیک، ورڈسورتھ، شیلے، کیٹس، ٹینی سن، اور سوئنبرن سے لے کر بعد کے شعراء
تک آسمانِ شعر کے ستاروں کا ایک درخشاں سلسلہ ہے جس کا جواب شاید ایران کے
سوا دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ملے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن جذبات کو انگریزوں
کی زندگی میں اظہار کی راہ نہیں ملتی وہ ان کے شاعروں کے صدفِ دل میں پرورش پاتے
رہتے ہیں اور ایک مدت کے بعد گوہرِ شاہوار بن کر نکلتے ہیں۔

ناول کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ انگریزی ذہن کی تخلیق ہے اور اس میں تو کوئی
شبہ نہیں کہ اٹھارھویں صدی سے انیسویں صدی کے آخر تک یعنی روسی ناول کے
اوجِ کمال پر پہنچنے سے پہلے انگریزی ناولوں کا سکہ سارے یورپ اور امریکا میں چلتا
رہا۔ سچ پوچھئے تو انگریزی ناول جسے فیلڈنگ، اسمالٹ، رچارڈسن اور اسٹرن نے شروع
کیا اور جین آسٹن، برنٹے، جارج ایلیٹ، تھیکرے، ٹرولوپ، میریڈیتھ اور ہارڈی
نے پروان چڑھایا۔ مشاہدۂ حیات کا ایک مخصوص طریقہ ہے جو انگریزوں کے حصے کی
چیز ہے۔ زندگی کے مادی اور روحانی پہلو سے یکساں محبت جو ایک صحت مند قوم کی علامت
ہے۔ اس کے گوناگوں حادثات اور تغیرات سے گہری دلچسپی ایک خاص قسم کا مزاج جو
ہمدردی اور دلسوزی، طنز اور تمسخر کا مجموعہ ہے اور وہ احساسِ تناسب جو جذباتی پستی
اور مبالغہ سے بچاتا ہے۔ ان سب چیزوں نے مل کر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے
انگریز ناول نگاروں کی تصانیف میں کچھ ایسی دلکشی پیدا کر دی ہے جو کہیں اور نہیں پائی
جاتی۔ اس کا مکمل نمونہ چارلس ڈکنس کے بہترین ناولوں میں نظر آتا ہے۔ شکسپیر کے
بہترین ڈراموں کی طرح فانی انسانوں کی زندگی میں ابدی زندگی کی جھلک دکھاتے ہیں،
مضمون نگاری بھی ان اصنافِ ادب میں سے ہے جن میں انگریزوں نے خاص امتیاز
حاصل کیا۔ سرٹامس براؤن اور چارلس لیمب جیسے استادانِ فن کے علاوہ جیرمی، سٹل،

اڈیسن، ڈاکٹر جانسن، ہیزلٹ، کارلائل، رسکن میتھو آرنلڈ، پائدار شہرت کے مالک ہیں۔ مجموعی طور پر یہ لوگ فرانسیسیوں کی سی وضاحت، سلاست اور روانی تو پیدا نہ کرسکے، لیکن دقت نظر، تازگیٔ خیال، جدت ادا، اور خصوصاً زور بیان میں جس کے اندر جوش اور ضبط سمویا ہوا ہے، ان سے بازی لے گئے۔

انگریزی تہذیب کی اس دھندلی اور نامکمل تصویر میں آپ کو اس قوم کی سیرت اور ذہن کی ایک جھلک نظر آگئی ہوگی جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں کل ہندوستان کی قسمت کی مالک بن گئی اور جس نے تقریباً ایک صدی کے عرصے میں ہندوستان کی تہذیبی زندگی پر نہایت زبردست اثر ڈالا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جو نئی لہریں انگریزوں کی ذہنی زندگی میں اٹھیں اور وہاں سے ہندوستان پہنچیں اُن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

برطانیہ کی مزدور پارٹی

۲۔ ٹریڈ یونین کی تحریک

(بسلسلہ سابق)

ٹریڈ یونین کی ابتدار | انگلستان میں ٹریڈ یونین کی ابتدار تو اٹھارھویں صدی کے شروع ہی میں ہو گئی تھی۔ جب صنعت نے واضح طور پر سرمایہ دارانہ رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے مزدوروں کی ان انجمنوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ استاد کاریگر پنچایتی پابندیوں کے ماتحت روائتی طریقے پر کام کرتے تھے۔ وہ پوری طرح خود مختار تھے۔ کام کی جگہ، کام کے اوقات، اوزار، کچے مال، مصنوعہ مال اور اس کی فروخت پر انھیں اختیار حاصل تھا۔ استاد کاریگروں اور ان کے مددگاروں اور شاگردوں میں وہ بُعد اور بیگانگی پیدا نہیں ہوئی تھی جو سرمایہ داری کی ترقی کے بعد رونما ہوئی۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی اجرتیں اور ان کے کام کے حالات کو منصفانہ بنیاد پر قائم کرنا حکومت اپنے فرائض میں داخل سمجھتی تھی، اور آنریری مجسٹریٹ اس کام کو انجام دیا کرتے تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کی ابتدار میں جب سرمایہ داری اور عدم مداخلت کی پالیسی کو ترقی ہونا شروع ہوئی تو مزدوروں کو اس بات کا احساس ہوا کہ سرمایہ داروں اور اُن کے درمیان بیگانگی پیدا ہو گئی ہے اور وہ جداگانہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ سرمایہ دار طاقتور ہیں اور مزدور کمزور ہیں ان کی اس کمزوری میں حکومت نے ان کا ساتھ دینا ترک کر دیا ہے۔ انھیں اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ نظر آیا یعنی یہ کہ وہ اپنے آجروں کے مقابلے میں متحد ہو جائیں۔

ٹریڈ یونین ابتدائی | چنانچہ سب سے پہلی مزدوروں کی انجمنیں مغربی انگلستان کی صنعت میں بنائی گئیں۔ کیونکہ یہاں کپڑے کی صنعت میں سرمایہ داری نظام کی ترقی نسبتاً پہلے رونما ہو گئی تھی۔ اس علاقہ میں سترھویں صدی ہی میں

بڑے پیمانہ کی پیدائش مستحکم بنیاد پر قائم ہوگئی تھی ایسے کارخانے جن میں سیکڑوں آدمی کام کرتے تھے بہت سے تھے۔ یہ ابتدائی انجمنیں بیماروں کی امداد کے لئے قائم ہوئی تھیں لیکن اجروں نے یہ کہہ کر ان کی مخالفت کی کہ انکے ذریعے امداد کا بہانہ کرکے دراصل کاروبار میں رکاوٹ ڈالنے کی سازش کی جاتی ہے اجروں کے مفاد کی نمائندگی پارلیمنٹ میں چونکہ بہت مضبوط تھی اس لئے ۱۷۲۶ء میں قانون اتحاد وضع کیا گیا۔ جس کے ذریعے ایسے تمام اتحادات کو جن سے کاروبار میں رکاوٹ واقع ہو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود مزدوروں کے اتحاد کی تحریک تیزی کے ساتھ پھیلتی رہی۔ کپڑا بننے والوں میں سے یہ پارچہ بافی کے دوسرے کام کرنے والوں میں پہنچی اور وہاں سے کپڑا سینے والوں میں۔ سنہ ۱۷۲۰ء سے سنہ ۱۷۵۰ء تک آجروں اور مزدوروں میں اُجرت اور کام کے اوقات کے معاملے میں برابر کش مکش جاری رہی۔ حکومت کی مخالفت کے باوجود ٹریڈ یونین کی تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ یا تو پوشیدہ طریقے پر چلتی رہی یا دوستانہ منافع کی انجمنوں کے پردہ میں اس کو جاری رکھا گیا۔ جب صنعتی انقلاب کے زمانے میں فیکٹری نظام کو پوری طرح ترقی ہوگئی تو ٹریڈ یونین کی تحریک بھی بہت آگے بڑھ گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۷۶۰ء اور سنہ ۱۷۷۰ء کے درمیان بہت سی ہڑتالیں ہوئیں جن میں تشدد سے بھی کام لیا گیا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف ثانی میں یہ تحریک شیفیلڈ کے چھری کانٹے بنانے والوں۔ لیسٹر کے فریم پر کاڑھنے والوں اور سارے ملک کے ہیٹ بنانے والوں، کپڑا چھاپنے والوں، سوت کاتنے والوں، سواری گاڑیاں بنانے والوں، لوہاروں، بڑھئیوں، کپی گروں میں پھیل گئی۔ اٹھارھویں صدی کے آخری زمانے میں اون کے دھنکنے والوں کی انجمن خاص طور پر بہت طاقتور ہوگئی تھی اور اون کے آجروں نے ۱۷۹۲ء میں یہ بات کہی تھی کہ وہ بالکل اپنے مزدوروں کے رحم وکرم پر ہیں۔ یارک شائر کے کندی گروں کی انجمن بھی بہت مضبوط تھی اور مختلف شہروں میں جو اس کی شاخیں تھیں، ان کی نگرانی ایک مرکزی کمیٹی کیا

کرتی تھی۔

حکومت جس پر سرمایہ داری کا غلبہ تھا، اس تحریک کی مخالف تھی۔ اس کا پتہ گلاسکو کے معاملے سے چلتا ہے۔ یہاں مزدوروں نے اجرت کی کمی کی مخالفت کی جس پر ایک قانون وضع ہوا جس میں آجروں کو پیمانے کے مطابق اُجرتیں ادا کرنے کا پابند بنایا گیا۔ مزدوروں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اور روئی کی صنعت میں ایک ہڑتال کردی جو کارلائل سے لے کر ابرڈین تک پھیل گئی۔ جب آجروں نے مزدوروں کے مطالبے کو منظور کرنا چاہا تو حکومت درمیان میں آگئی اور اُس نے ہڑتال کے رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ غرض مزدوروں کی طرفداری میں اجرت کو مقرر کرنے کا سلسلہ جو پہلے ہی کمزور ہوچکا تھا اب بالکل ختم ہوگیا اور ۱۸۱۳ء میں ایک قانون بنایا گیا جس سے آنریری مجسٹریٹوں کو اُجرتیں مقرر کرنے کا جو قانونی حق ملا ہوا تھا وہ بھی منسوخ کردیا گیا اور پہلے جہاں عملی طور پر حکومت عدم مداخلت کے اصول کی پابندی کرتی تھی وہاں اب نظری طور پر بھی کرنے لگی۔

انقلاب فرانس نے بھی انگلستان کے مزدوروں کی تحریک پر اثر ڈالا۔ ٹامس مین نے ایک رسالہ "حقوق انسان" کے نام سے لکھا جس میں جمہوریت، مساوات، اور اخوت کی تبلیغ کی گئی تھی۔ اس کے زیر اثر مزدوروں نے بھی اصلاح کا مطالبہ کیا اور ۱۷۹۲ء میں ٹامس ہارڈی نے مزدوروں کی اولین سیاسی انجمن کی انگلستان میں بنیاد رکھی جس کا نام لندن کی انجمن مراسلت (لندن کرسپانڈنگ سوسائٹی) تھا۔ اس کے مطالبے یہ تھے کہ بالغوں کو حق رائے دیا جائے اور پارلیمنٹ کی اصلاح کی جائے۔ اسی قسم کی اور انجمنوں نے برطانیہ کے لوگوں میں تیزی سے ترقی کرنا شروع کی تو حکومت خوف زدہ ہوگئی، اور اس نے اسکاٹ لینڈ کے دو انتہا پسندوں (ریڈیکل) میور اور پامر کو ۱۷۹۳ء میں لانبی مدت کے لئے عبور دریائے شور کی سزا دی۔ اس کے دوسرے سال اُس نے لندن کرسپانڈنگ سوسائٹی کے تین ممتاز رہنماؤں، ہارڈی، ہارن ٹک اور جان تھیل وال

کو بھی قید کر دیا اور سخت جبر و تشدد شروع کر دیا۔ ۱۷۹۹ء میں انجمن ہائے مراسلت کا قانون بنایا گیا جس کے ذریعے تمام ایسی مقامی انجمنوں کو جو باہمی مراسلت کے تعلقات رکھتی تھیں۔ غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ ۱۸۰۰ء میں قانون اتحاد بنایا گیا جس کے ذریعے ٹریڈیونین کی تحریک کی تمام شکلوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ان قوانین کی وجہ سے مزدوروں کی تحریک کو انتہائی نقصان پہنچا۔

انیسویں صدی کے اول ربع میں مزدوروں کی تاریخ آجروں کی طرف سے تشدد مزدوروں کی طرف سے انتقامی کارروائیوں اور عدالت کی طرف سے ظالمانہ سزاؤں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ لیکن قانون اتحاد کے باوجود۔ ٹریڈیونین کی تحریک کو مٹایا نہیں جا سکا۔ مزدوروں کے اتحاد خصوصاً لندن میں پوشیدہ طور پر جاری رہے اور ۱۸۲۴ء میں جب قانون اتحاد کو منسوخ کیا گیا تو مزدوروں کی انجمنیں تقریباً تمام اہم دستکاریوں میں موجود تھیں۔

۱۸۲۵ء تا ۱۸۳۳ء | ۱۸۲۴ء میں فرانسیس پلیس، چیرنگ کراس، کے ٹیلر ماسٹر اور جوزف ہیوم ریڈیکل رہنما کی کوششوں سے قانون اتحاد کو پارلیمنٹ نے منسوخ کر دیا، اور مزدوروں کے اتحاد اور ان کی ہڑتالوں کے حق کو جائز قرار دیا۔ مزدوروں نے اس کو اپنی بڑی کامیابی سمجھا اور ہڑتالوں کی ایک وبا پھیل گئی۔ جن میں اکثر تشدد سے بھی کام لیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرا قانون ۱۸۲۵ء میں بنایا گیا جس میں مزدوروں کے ان حقوق کو تو باقی رکھا گیا لیکن اُن پر کچھ ایسی پابندیاں لگا دی گئیں جس سے دوسروں کو کام سے روکنا اور انھیں دق کرنا جرم میں داخل ہو گیا۔

لیکن اتحاد اور ہڑتال کے ان حقوق کے ملنے سے مزدوروں کو جیسا اطمینان ہونا چاہیئے تھا وہ حاصل نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی کہ آجروں نے بھی اپنی انجمنیں بنالی تھیں اور ان میں بہت زیادہ یک جہتی پائی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں مزدوروں کی انجمنوں میں

باہمی اتحاد نہیں تھا جس کی وجہ سے ان کی ہڑتالیں اکثر ناکامی پر ختم ہوتی تھیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے مزدوروں نے ایسی انجمنیں بنانی چاہیں جن میں ملک کی ساری صنعتوں کے سب مزدور شریک ہوں اور انھوں نے ملک کے تمام مزدوروں کے مکمل اتحاد اور یک جہتی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا۔ ۱۸۲۹ء میں ایک گرانڈ جنرل یونین بنائی گئی۔ یہ جلد ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے آیندہ کے لئے راستہ کھول دیا۔ چنانچہ دوسرے سال ڈوہرٹی نے قومی انجمن برائے تحفظ مزدوران قائم کی جس نے جمہور کی آواز کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، جس کا دعوےٰ تھا کہ اس کی اشاعت تیس ہزار ہے۔ اس کے بعد جنرل ٹریڈز یونین بنائی گئی۔ جس کا رویہ آجروں کے ساتھ بہت گستاخانہ تھا۔ اس لئے وہ اس سے ناراض ہو گئے اور انھوں نے اس کے ممبروں کو اپنے یہاں ملازم رکھنا ممنوع قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بھی ختم ہو گئی۔

۱۸۳۳ء میں صرف آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ اور اووِن نے گرانڈ نیشنل کنسالی ڈیٹیڈ یونین قائم کی جس کی رکنیت چند ہفتوں میں پانچ لاکھ تک پہنچ گئی اور اس میں زراعتی مزدور بھی شامل کئے گئے۔ اس نے بھی ہڑتال کی پالیسی پر عمل کیا اور یہ بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے سارے ملک کی متحدہ ٹریڈ یونین کی تحریک ختم ہو گئی۔ اس قسم کی ہمہ گیر تحریکوں کا جن لوگوں کو شوق تھا۔ انھوں نے ٹریڈ یونین کی تنظیم کی جگہ اب سیاسی تنظیم کی طرف توجہ کی اور اس معاملے میں ولیم کابٹ جو جمہور کو سیاسی اقتدار دلانا چاہتا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جب سیاسی اقتدار مل جائے گا تو معاشی بہتری کے لئے حالات خود بخود ساز گار ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس خیال کے لوگوں میں چارٹزم کا زور رہا۔

۱۸۳۴ء تا ۱۸۵۱ء لیکن جو لوگ ٹریڈ یونین سے دلچسپی رکھتے تھے انھوں نے اپنے میدان عمل کو محدود کر لیا۔ اب اگر وہ ملکی اتحاد کرتے تھے تو وہ ایک ہی صنعت کے لوگوں تک محدود ہوتا تھا۔ سارے ملک کی تمام صنعتوں کے تمام مزدوروں کو اس میں شامل کرنے

کی پرستش نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے مقاصد اور کام کے طریقوں میں بھی ایک نئی روح پیدا ہوگئی تھی، اب وہ ہر مسئلے پر جداگانہ طریقے پر غور کرتے تھے جہاں قانون کو اپنے مخالف پاتے تھے۔ وہاں قانون بدلوانے کی کوشش کرتے تھے۔ یونین کے فنڈ میں بڑی رقمیں اکٹھی کی جاتی تھیں جن سے کچھ تو دوستانہ خدمات فراہم کی جاتی تھیں اور کچھ ہڑتالیں چلانے کا کام لیا جاتا تھا۔ تجربے سے یہ معلوم کرلیا گیا تھا کہ اعزازی سکریٹری کے مقابلے میں تنخواہ دار سکریٹری زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے بلکہ اس اصول کو پوری جماعت عاملہ پر منطبق کیا جانے لگا تھا۔ مزدوروں کے پورے طبقے کے مفاد کی انھیں فکر نہیں تھی بلکہ اب ہر صنعت کے مزدور اپنے ذاتی اور مخصوص مفاد کا جداگانہ طریقے پر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس نئی تحریک کا سلسلہ ۱۸۴۸ء سے قبل کی تحریک سے ملایا جا سکتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اس درمیان میں مزدوروں کے علم اور تجربے میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ مزدوروں نے سرمایہ داری نظام کو ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر تسلیم کرلیا تھا اب وہ اس نظام کے اندر رہ کر اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔

نئی قسم کی ٹریڈ یونین ۱۸۵۰ء کے بعد ٹریڈ یونین تحریک کی اس نئی روح نے اور واضح طور پر ظاہر ہونا شروع کیا۔ ہڑتالوں سے جو مالی نقصان پہنچتا تھا اور ان کے ذریعے جو مشتبہ کامیابی حاصل [illegible] دیکھتے ہوئے بعض معاملوں میں مفاہمت پسندیدہ خیال کی جانے لگی۔ چنانچہ اب ہڑتالیں صرف مجبوری کی حالت میں آخری حربہ کے طور پر اور مرکزی جماعت کے فیصلے پر جا[illegible] سمجھی جانے لگی۔ یونین کے مقاصد بھی واضح شکل میں پیش کئے جانے لگے خوش حال مزدور اپنی بہتر حالت کو قائم رکھنے کے لئے نئے امیدواروں کی تعداد کو محدود رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے تاکہ مزدوروں کی رسد کے اضافے سے اجرت کی شرح کم نہ ہو۔ زائد وقت کام کرنا مذموم سمجھا جانے لگا اور کام کے اوقات کو کم کرنے کے لئے آجروں سے اپیل کی جانے لگی۔ نقل سکونت کا ایک فنڈ قائم کیا گیا تاکہ مزدوروں

کی تعداد کو کم کرکے اجرتوں میں اضافہ کرایا جاسکے۔

۱۸۵۹ء میں پارلیمنٹ میں قانون بنوایا گیا جس کے ذریعے ۱۸۲۵ء کی خرابیوں کو دور کیا جاسکا۔ اس قانون کی رو سے غدار مزدوروں کو پر امن اور معقول طریقے پر اپنا ہم خیال بنانا مداخلتِ بیجا میں شامل نہیں رہا۔

جنٹا

اسی زمانے میں موجودہ لیبر پارٹی کا آغاز ہو۔ اب تک مزدوروں کی حمایت میں پارلیمنٹ میں جو قانون بنوائے گئے تھے وہ سب مزدوروں کے ہمدردوں نے بنوائے تھے خود مزدور پارلیمنٹ کے رکن نہیں تھے۔ لیکن اب مزدوروں میں چند ایسے قابل آدمی پیدا ہوگئے جو مزدوروں کی طرف سے خود بول سکتے تھے۔ ان میں پانچ آدمیوں نے جو جنٹا کے نام سے مشہور ہوئے بہت شہرت حاصل کی یہ لوگ اپنی باہمی دوستی اور سیاسی ہم خیالی کی وجہ سے نہایت قریبی طور پر ایک رشتے میں منسلک تھے۔ ان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ یہ آجروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھ سکتے تھے۔ یہ انفرادیت پرست تھے۔ پارلیمنٹ میں یہ لوگ اپنی سیرت کی بلندی اپنی اعلےٰ صلاحیت اور طبقۂ متوسط کے آداب و مراسم کی واقفیت کی وجہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ وہ صنعتی معاملات میں بہت محتاط تھے اور اپنی بیشتر توجہ سیاسی معاملات پر صرف کرتے تھے۔ وہ ہڑتال کرانے سے جہاں تک ہو سکتا بچتے تھے۔ وہ سخت گیر آجروں سے ان منافع کو دباؤ کے ذریعے حاصل کرتے جنھیں اچھے آجر برضا اور خوشی مزدوروں کو عطا کر دیتے تھے۔ مزدوروں کا بھی انھیں ویسا ہی اعتماد حاصل تھا جیسا کہ آجروں کا تھا۔ یہ لوگ اپنے زیادہ تر کام لندن ٹریڈز کونسل کی معرفت انجام دیتے تھے جو لندن کی تمام صنعتوں کا ایک وفاق تھی۔

شاہی تحقیقاتی کمیشن اور ٹریڈ یونین کانگریس

لیکن لندن کے علاوہ انگلستان کے دوسرے اضلاع میں اتنی معقولیت پسندی نہیں تھی اور اس زمانے میں ٹریڈ یونین کی تحریک کو بہت خطرہ درپیش تھا۔ ایک طرف آجروں نے مل کر اپنی انجمنیں بنالی تھیں

دوسری طرف شیفیلڈ میں ان مزدوروں کے خلاف جو یونین کے ممبر نہیں تھے۔ یونین کے ممبروں نے جو زیادتیاں کی تھیں، ان سے بہت برہمی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں تحقیقات کے پارلیمنٹ نے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا۔ ان معاملات پر ٹریڈ یونین کے نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کے لئے ملک کی تمام ٹریڈ یونینوں کی ایک کانگریس منعقد کی گئی۔ اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ ٹریڈ یونینوں نے اپنی طرف سے خود تحقیقات کئے جانے پر زور دیا تاکہ وہ دہشت انگیزی کے الزام سے اپنے آپ کو بری کرسکیں۔ جنٹا کی کوششوں سے ایک غیر جانب دار کمیشن مقرر ہوا۔ اور ان کی رپورٹ ٹریڈ یونین کی تحریک کے مخالف ثابت نہیں ہوئی۔ اسی سال پارلیمنٹ میں رفارم ایکٹ بھی منظور ہوا جس کے ذریعے شہر کے مزدوروں کو حق رائے مل گیا۔

ٹریڈ یونین کا قانون

۱۸۷۱ء میں ٹریڈ یونین ایکٹ منظور ہوا۔ جس کی رو سے مزدوروں کو تمام حقوق جو انھیں عملاً ملے ہوئے تھے قانوناً تسلیم کرلئے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی ترمیم ضابطہ فوجداری کا قانون بھی پاس ہوا جس میں دھرنا دینے اور غدار مزدوروں کو اپنا ہم خیال بنانے کو جرم قرار دیا گیا۔

پارلیمنٹ میں مزدوروں کے نمائندے

اس لئے ۱۸۷۱ء میں جنٹا نے لندن میں ایک ٹریڈ یونین کانگریس طلب کی تاکہ اس مکروہ قانون کو منسوخ کرایا جاسکے۔ جب تمام معمولی ذرائع ناکامیاب ثابت ہوئے تو کانگریس نے ۱۸۷۴ء میں اس بات کی اجازت دی کہ اپنے تیرہ نمائندوں کو پارلیمنٹ کی رکنیت کے لئے کھڑا کیا جائے۔ ان میں سے دو منتخب ہوگئے یہ دونوں اولین مزدور ممبر تھے۔ اس انتخاب میں ایک نئی پارٹی برسر اقتدار آئی جس نے ۱۸۷۵ء کا ٹریڈ یونین ایکٹ منظور کیا۔ جس سے ہڑتال کرنا، دھرنا دینا وغیرہ قانونی فعل بن گئے۔

۱۸۷۵ء کے بعد ٹریڈ یونین کا زوال اور سوشلزم کی ترقی

۱۸۷۱ء سے برابر ٹریڈ یونین تحریک

کو ترقی ہو رہی تھی۔ ہڑتالیں بھی نتائج کے لحاظ سے کامیاب رہتی تھیں۔ اس لئے اس دور کو ٹریڈ یونین کی ترقی کے دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب ۱۸۸۳ء میں کساد بازاری شروع ہوئی اور مزدوروں کی اُجرتیں کم ہوئیں اور ان کے کام کے حالات پہلے سے خراب ہوگئے تو اسے آئینی طریقوں سے مایوسی ہوگئی۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ سیاسی اصلاحات بھی ہو چکی ہیں۔ ان کی ٹریڈ یونین کی تنظیم بھی بہت اچھی ہے۔ آزاد تجارت بھی ہے۔ لیکن پھر بھی ہماری حالت خراب کی خراب ہے اس لئے انھیں لبرلزم سے مایوسی ہوئی اور ان میں کارل مارکس اور اس کے پیرووں کے اشتراکی خیالات تیزی سے پھیلنا شروع ہوئے۔ ملک بصورت مجموعی اس بدعت کے خلاف تھا۔ خود ٹریڈ یونین کی تحریک کے اندر بھی اس معاملے میں باہمی اختلاف تھا اس لئے اس نئی تحریک کو ابتدا میں سخت جنگ کرنا پڑی۔ ٹریڈ یونینوں کے اندر امارت پسندی اور اجارہ داری آگئی تھی۔ یہ مزدوروں کی محدود اور مقررہ تعداد کے فائدے کے لئے کام کرنے لگی تھیں۔ جو مزدور تباہ حال تھے وہ ان میں داخلہ چاہتے تھے۔ لیکن ان کے لئے ٹریڈ یونین کے دروازے بند تھے۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۸۵ء تک ٹریڈ یونین کی تحریک صرف ماہر مزدوروں تک محدود رہی اور یہ گلیڈ اسٹن کی لبرل تحریک کی عدم مداخلت اور انفرادیت پرستی کو قبول کرتی رہی، اور اس نے اپنے مشاغل کو دوستانہ انجمنوں کی امداد و رفاقت تک محدود کئے رکھا۔ لیکن ۱۸۸۸ء میں جب سوشلزم نے پھیلنا شروع کیا تو ایک نئی روح بیدار ہوگئی اور غیر ماہر مزدوروں اور کم اجرت پر کام کرنے والی عورتوں کی توجہ مزدور تحریک کے اشتراکی عنصر کی طرف مائل ہوئی ہڑتال کی پالیسی کو پھر عروج ہوا۔ ٹریڈ یونین کے کام کو دو علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا جانے لگا۔ ایک وہ کام تھے جو وہ دوستانہ امدادی انجمن کی حیثیت سے انجام دیتی تھیں اور دوسرے خالص ٹریڈ یونین کی حیثیت سے۔ اب ٹریڈ یونین کے چندوں کو صرف ہڑتال کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ اوون کے کمیونزم (اجتماعیت) کے مقابلے میں

کلیکٹوویزم (اشتمالیت) کو جس میں مزدوروں کو ذرائع دولت آفرینی کا مالک بنانا تجویز کیا جاتا تھا۔ زیادہ لائق عمل سمجھ کر نصب العین کے طور پر اختیار کر لیا گیا اور اس کے حصول کا ذریعہ اس بات کو سمجھا جانے لگا کہ حکومت سے مزدوروں کی اجرت بڑھانے اور کام کے اوقات گھٹانے میں مداخلت کرائی جائے۔ ٹریڈ یونین تحریک کا رجحان عالمگیریت کی طرف ہوگیا۔ اور غیر ملکی یونینوں سے مراسلت کی خواہش کی جانے لگی۔ لندن میں ۱۸۸۸ء میں پہلی بین الاقوامی ٹریڈ یونین کانگریس منعقد کی گئی۔

۱۸۸۸ء میں دیا سلائی کے کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں نے ہڑتال کردی۔ ان کے پاس روپیہ بالکل نہیں تھا، اور ان کی کوئی تنظیم نہیں تھی۔ لیکن رائے عامہ اس قدر ہمدرد ہوگئی تھی کہ آجروں کو ہار ماننا پڑی۔ اس سے طبقہ وارانہ جنگ کے اندر ایک نیا عنصر شامل ہوگیا یعنی مزدور اور سرمایہ دار دونوں رائے عامہ کو طرفدار بنانے کی کوششیں کرنے لگے ۱۸۸۹ء میں گیس کے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی یونین اور عام مزدوروں کی یونین بنائی گئی اور چند مہینوں کے اندر ہی گیس کے کارخانہ کے مزدوروں کا یہ مطالبہ کہ ان سے صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جائے مان لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد جنوب مغربی انگلستان کی ان گودیوں میں جہاں سے ہندوستان کو جہاز روانہ کئے جاتے تھے، یکبارگی ہڑتال کی گئی اور اس سے اس عظیم الشان گودیوں کی ہڑتال کی ابتدا ہوئی جس کی رہنمائی جان برنس، بین ٹلٹ اور ٹام من نے کی۔ دس ہفتہ کے لئے تجارت کا کام بالکل رکا رہا۔ ہر طرف سے یہاں تک کہ آسٹریلیا سے امداد کی بارش ہوتی رہی تا آنکہ مزدوروں کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ غیر ماہر مزدوروں کی پہلی شاندار کامیاب ہڑتال تھی۔

نئے قسم کی ٹریڈ یونین کی ترقی

اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہ نکلا کہ ٹریڈ یونین تحریک کو نئے سرے سے خوب ترقی ہوئی اور ایک سال سے کم عرصے میں

دو لاکھ مزدور ٹریڈ یونین کے حلقے میں شامل ہوگئے۔ مزدوروں میں یک جہتی کو خوب ترقی ہوئی اور ان میں اپنے طبقے کے حقوق کے لئے ایک مشترک جذبہ پیدا ہوگیا اور اس کے نتیجے کے طور پر سوشلزم کی تحریک کو بھی ترقی ہوئی۔ یہ نئی ٹریڈ یونینیں اوورن کے ...... زمانے کی انجمنوں کی طرح صرف جنگ جو جماعتیں تھیں۔ ان کے چندے کم تھے اور یہ اپنے اراکین کے لئے دوستانہ امداد کا انتظام نہیں کرسکتی تھیں اس لحاظ سے یہ سابقہ انجمنوں سے بہت مختلف تھیں ... کے ساتھ ساتھ اتحاد کی تحریک بھی بڑے پیمانے پر پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور کئی وفاق وجود میں آگئے تھے اور ملک کے طول و عرض میں ٹریڈ کونسلز بن گئی تھیں۔

اب آجروں کی باری تھی کہ وہ بھی اپنے تحفظ کا انتظام کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں مشین سازی کے کارخانوں کے آجروں نے ایک انجمن بنائی اور ایک بڑی ہڑتال کے موقع پر مشین سازی کے کاریگروں کی متحدہ انجمن کو شکست دی۔ ۱۸۹۹ء میں ٹریڈ یونینوں کا ایک عام وفاق بنایا گیا۔ ابتدا میں اس وفاق کی نگرانی ہر مرکز باری باری سے کرتا تھا اور سب واحدوں کو مساوی اختیار ملا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں جب کاروبار بڑھا تو ایک مستقل مرکز میں تنخواہ دار عہدہ داروں کا تقرر کیا گیا اور بعض صورتوں میں شاخ کی انجمنوں کے نمایندوں کو بھی منتخب کیا گیا۔ اس عام وفاق کا مقصد یہ تھا کہ مشکل کے وقت یونینوں کی امداد کریں۔ پھر مزدوروں کے ان بڑے اتحادوں نے غیر ملکی یونینوں سے بھی تعلقات قائم کرلئے۔

ٹریڈ یونین اور سیاسی تحریک

پارلیمنٹری لیبر پارٹی کی ابتدا ۱۸۹۲ء کے انتخاب میں ہوئی جب کیر ہارڈی، جان برنس، اور ہیولاک ولسن کو پارلیمنٹ کے لئے منتخب کیا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں بریڈ فورڈ کے مقام پر کیر ہارڈی نے آزاد لیبر پارٹی کی بنیاد رکھی اور ۱۸۹۵ء کے انتخاب میں اپنے ۲۸ امیدوار کھڑے کئے جن میں سے کوئی بھی

کامیاب نہیں ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں ٹریڈ یونین کانگریس بھی ان کی ہم خیال ہوگئی اور پارلیمنٹ میں مزدوروں کا ایک جداگانہ گروپ بنا لیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کے مفاد میں قوانین بنوائے جائیں۔ ۱۹۰۰ء کے عام انتخابات مزدوروں کے لئے نمائندگی حاصل کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ٹریڈ یونین کے حامیوں نے سوشلسٹ تحریک کے حامیوں کے ساتھ سیاسی معاملات میں اشتراک کر لیا۔ اس مشترکہ پارٹی کا ۱۹۰۶ء میں لیبر پارٹی نام رکھا گیا اس کمیٹی نے ۱۹۰۰ء میں اپنے پندرہ امیدواروں کو نامزد کیا لیکن صرف کیر ہارڈی اور رچرڈ بیل کو کامیابی ہوئی۔

لیبر پارٹی کا عروج | بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ پارلیمنٹری لیبر پارٹی کو عروج ہونا شروع ہوا اور ۱۹۰۶ء میں انتیس امیدواروں کی ایک متحدہ جماعت منتخب ہوئی لیبر پارٹی کا سب سے اول کارنامہ "قانون صنعتی مناقشات" کی صورت میں ظاہر ہوا جس کے ذریعے ہڑتال اور دو تیاری کے قانون کو مزدوروں کے موافق بنا دیا گیا اور ۱۹۰۲ء میں ایوان امرا نے ٹیف ویل کے مقدمے میں فیصلہ سنا کر ٹریڈ یونین کے تنظیم کو جس طرح خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اس کا بڑی حد تک ازالہ ہوگیا

۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۲ء | ۱۹۱۰ء میں قیمتوں کے اضافہ تجارت کی ترقی اور امریکہ اور فرانس کے سوشلسٹ اثرات کی وجہ سے صنعتی بے چینی کی ایک نئی لہر اٹھی اور شہرائیت کی نئی شکلیں ترقی پانے لگیں۔ ٹریڈ یونین کی رکنیت میں غیر معمولی تیزی کے ساتھ اضافہ ہونا شروع ہوا۔ بہت سی ہڑتالیں ہوئیں جن میں سے اکثر کامیاب ثابت ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم ۱۹۱۱ء میں نقل و حمل کے مزدوروں اور ۱۹۱۲ء میں کان کھودنے والوں کی ہڑتالیں تھیں۔ صنعتی انجمن سازی، سنڈیکلزم اور گلڈ سوشلزم کے نئے خیالات کی اشاعت کی گئی اور ٹریڈ یونینیں یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ صنعت کی نگرانی میں انھیں بھی حصہ ملنا چاہیے۔

جنگ عظیم اول اور ٹریڈ یونین | ۱۹۱۴ء میں جنگ کے شروع ہو جانے کی وجہ سے یہ تحریک یکبارگی ختم ہوگئی۔ لیکن جیسے ہی جنگ کے زمانے کی ضرورتوں کی وجہ سے مزدوروں کو نئے نئے کاموں سے لگایا گیا اور ان کی تنظیم کی گئی تو بہت سے جھگڑے رونما ہونے لگے۔ ۱۹۱۵ء میں سامان جنگ کے قانون کے ماتحت آجروں اور مزدوروں کو جبری مصالحت کا پابند بنا دیا گیا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں بڑی ہڑتالیں نسبتاً کم ہوئیں لیکن ان کاروبار کا بہت زور رہا۔ دوکان کے نگرانوں کی تحریک کو ترقی ہوئی جنگ کے پورے زمانے میں ٹریڈ یونین کی رکنیت تیزی سے بڑھتی رہی۔

جنگ عظیم اول کے بعد | جب جنگ عظیم ختم ہوئی تو بےچینی بڑے پیمانے پر شروع ہوئی جسے اجرتیں بڑھا کر اور کام کے اوقات گھٹا کر دور کیا گیا۔ ٹریڈ یونینوں کی رکنیت اور زیادہ بڑھتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد زبردست کساد بازاری شروع ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں کان کنوں کے خلاف اور ۱۹۲۲ء میں مشین سازی کے مزدوروں کے خلاف در بندی کی گئی۔ مزدوروں نے اجرتوں میں کمی اور کام کے حالات کی خرابی کو روکنے کی انتہائی کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں رکنیت بہت زیادہ کم ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۲۶ء تک ۱۹۱۳ء کی تعداد کے مقابلے میں پندرہ لاکھ سے اوپر قائم رہی

ٹریڈ یونین کے اعداد و شمار | ۱۸۹۲ء سے پہلے ٹریڈ یونین کے بارے میں کوئی اعداد و شمار نہیں ملتے۔ اس کے بعد حکومت نے ان کے بارے میں نقشوں کو شائع کرنا شروع کیا ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی رکنیت ۱۸۹۲ء میں ۵ لاکھ ۷۶ ہزار۔ ۱۹۰۰ء میں ۲۰ لاکھ ۲۲ ہزار، ۱۹۱۰ء میں ۲۵ لاکھ ۶۵ ہزار، ۱۹۱۳ء میں ۴۱ لاکھ ۳۵ ہزار ۱۹۱۸ء میں ۶۵ لاکھ ۳۳ ہزار۔ ۱۹۲۰ء میں ۸۳ لاکھ ۴۷ ہزار۔ ۱۹۲۲ء میں ۵۶ لاکھ ۱۶ ہزار۔ ۱۹۲۵ء ۵۲ لاکھ ۲۲ ہزار تھی۔

ٹریڈ یونین تحریک کی نمائندگی بصورت مجموعی ٹریڈ یونین کانگریس کے ذریعے ہوتی تھی۔ مستقل طور پر ۱۸۶۶ء میں شروع ہوگئی تھی۔ اس کی رکنیت کے اعداد وشمار ۱۸۶۹ء میں دو لاکھ ۵۰ ہزار تھے۔ ۱۸۷۴ء میں یہ بڑھ کر ۵ لاکھ ۹۴ ہزار ہوگئے لیکن ۱۸۸۶ء میں گھٹ کر ۳ لاکھ ۱۰ ہزار ہوگئے۔ ۱۸۹۰ء میں بڑھ کر ۱۵ لاکھ ۹۳ ہزار ہوئے لیکن ۱۸۹۳ء میں دوبارہ گھٹ کر ۷ لاکھ ۱۲ ہزار رہ گئے لیکن ۱۹۰۰ء میں دوبارہ بڑھے اور ساڑھے ۱۲ لاکھ ہوگئے۔ ۱۹۱۰ء میں ۱۶ لاکھ ۴۸ ہزار ۱۹۱۳ء میں ۲۲ لاکھ ۳۲ ہزار۔ ۱۹۱۸ء میں ۵۴ لاکھ ۳۲ ہزار۔ ۱۹۲۰ء میں ۶۵ لاکھ ۵ ہزار ۱۹۲۲ء میں ۵۱ لاکھ ۲۹ ہزار اور ۱۹۲۵ء میں ۴۴ لاکھ ۱۵ ہزار ہوگئے۔

ٹریڈ یونین کی رکنیت زیادہ تر صرف چند صنعتوں تک محدود ہے چنانچہ ۱۹۲۵ء میں کان کنوں اور کھانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے ۹ لاکھ ۴۸ ہزار۔ دھات مشین سازی اور جہاز سازی کے مزدوروں کے ۵۶ لاکھ ۲۰ ہزار اور ریلوے اور نقل وحمل کے مزدوروں کے دس لاکھ ۸۴ ہزار پارچہ بافی کے مزدوروں کے ۶ لاکھ ۴۲ ہزار رکن تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے گروہ جن میں نسبتاً بہتر تنظیم پائی جاتی ہے وہ چھاپہ خانہ اور عمارت سازی کے مزدور اور سرکاری ملازم ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں ٹریڈ یونینوں کی مجموعی تعداد ایک ہزار ۴۴ تھی۔ لیکن اس تعداد سے صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اول تو بہت سی یونینیں دراصل صرف شاخیں ہیں اور دوسرے مجموعی رکنیت کا بہت بڑا حصہ صرف چند بڑی یونینوں یا وفاقوں میں مجتمع ہے۔ اس قسم کی سب سے بڑی انجمنیں یہ ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کے کان کنوں کا وفاق (تقریباً ۹ لاکھ رکن) عام اور میونسپلٹی کے کارکنوں کی انجمن (۳ لاکھ ۲۷ ہزار رکن) ریلوے ملازموں کی قومی یونین (۴ لاکھ رکن) نقل وحمل اور عام کارکنوں کی انجمن (۳۴ لاکھ) مشین سازوں کی متحدہ یونین (۲ لاکھ ۴۳ ہزار) ان سب کا اور تقریباً تمام بڑی یونینوں

کا تعلق اور کچھ چھوٹی یونینیں بھی ٹریڈ یونین کانگریس کے ساتھ ہے جس کے ساتھ ۲۰۵ انجمنوں نے الحاق کر رکھا تھا۔ ان میں سے بعض وفاق تھیں جن کے اندر بہت سی برائے نام جدا جدا یونینیں شامل تھیں۔

جنرل کونسل پچھلے بیس، پچیس سال میں ٹریڈ یونین کانگریس کے اختیارات تیزی کے ساتھ بہت وسیع ہو گئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء تک کانگریس کی عاملہ وہ جماعت تھی جس کا نام:- "پارلیمنٹری کمیٹی" تھا، جس کے اختیارات بہت محدود تھے، لیکن اس پارلیمنٹری کو توڑ دیا گیا اور ایک جنرل کونسل وسیع اختیارات کے ساتھ مقرر کر دی گئی جس کے اختیارات اس کے بعد سے اور زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ انھی اختیارات کی بنیاد پر اپریل ۱۹۲۶ء میں جنرل کونسل نے ٹریڈ یونینوں کی جماعت ہائے عاملہ کی ایک مخصوص کانفرنس طلب کی تھی جس نے کان کنوں کی حمایت میں "عام ہڑتال" کا فیصلہ صادر کیا تھا۔

(باقی)

علی گڑھ کی تالے اور دھات کی صنعت کا جائزہ[1]

(۱) تمہید | علی گڑھ میں تالے کی کام کی ابتدا گورنمنٹ پوسٹل ورکشاپ سے ہوئی۔ اس ورکشاپ میں تالے اور مہر، پینٹ، آئرن اور براس اسکیل (ترازو) ویٹ (باٹ) لیٹر بکس، پھالے، گھونگرو، کرمچ کے تھیلے، چمڑے کا پوسٹ مین کا تھیلہ، چھپائی کی سرخ اور سیاہ روشنائی، مہر مارنے کے پیڈ، پوسٹ آفس کی چیزیں چھاپنے کے لئے چھوٹا سا چھاپہ خانہ۔ بہت سی قسم کی پوسٹ آفس کی لالٹینیں، ٹین کی اور لوہے کی بنی ہوئی۔ لیگل اسٹامپ ڈیپر، چراغ، چمٹیاں، قینچی، نوٹس بورڈ، پنسر، ٹین کے ٹرے، پوسٹل اسٹامپس کی صندوقچیاں۔ غرض یہ تمام کام پوسٹل ورکشاپ میں بنتا تھا۔

(۲) جانسن اور اس کا کارخانہ | ٹ لوگوں میں اس کام کو بڑے پیمانے پر چلانے والوں میں جانسن کا نام نہایت ممتاز نظر آتا ہے۔ جانسن پہلے چڑیوں والے صاحب کے نام سے مشہور رہا۔ یہ نہایت غریب آدمی تھا۔ یہ طوطے اور دوسرے پرند مار کر ان کے پروں کو امریکہ اور یورپ بھیجا کرتا تھا۔ یہ بڑی خوبیوں کا آدمی تھا۔ جب اس کا کام کچھ چل نکلا تو اس نے اور شکاریوں کو ملازم رکھا۔ اور پرندوں کی قیمتیں پروں کے حساب سے مقرر کیں جس

---

[1] اس صنعت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں عبدالعلیم صاحب مالک عبدالعلیم اینڈ سنز نے بہت امداد فرمائی جن کا میں ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ للتا پرشاد صاحب تواری سپرنٹنڈنٹ علی گڑھ مٹل ورکنگ اسکول اور ان کے اسٹاف اور خصوصیت کے ساتھ ان کے نوجوان اور ہونہار انسپکٹر اعجاز احمد صاحب نے بہت سی ضروری معلومات فراہم کیں۔ یہ جائزہ نومبر ۱۹۴۳ء میں لیا گیا۔

سے اس کا کام کچھ چکا۔ یہ ہارٹ صاحب پولس سرکل انسپکٹر علی گڑھ کا داماد تھا جن کی دو کوٹھیاں تھیں جن میں سے ایک فلر کے پاس ہے اور دوسری تیل ایجنسی کے پاس ہے۔
ہارٹ کی بیوی لیڈی ڈاکٹر تھی، لیکن یہ باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتی تھی۔ پردوں کے کام کے چکنے کے بعد جانسن مٹیل کی لائن میں آیا اور سب سے پہلے تالے کا کام شروع کیا۔ اس نے اس قدر عمدہ قسم کے تالے بنوانا شروع کئے کہ جب اس کے زمانے کے بنے ہوئے تالے اب کسی کے ہاتھ لگ جاتے ہیں تو اب کے کام سے بہت بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ باہر کے دوکان داروں سے کاروبار نہیں کرتا تھا۔ صرف گورنمنٹ کو اور ریاستوں کو سپلائی کرتا تھا۔ پیتل کے تالوں کے بعد جانسن نے سب سے پہلے گیلوا فائنڈ آئرن پیڈ لاک بنایا اور اس کی قلعی اسی کی ایجاد کی ہوئی ہے۔ جب عام پبلک نے اسے استعمال کرنا شروع کیا تو جانسن نے مقدمہ لڑایا پنڈت ٹیکا رام جھا کے فرم سے مقدمہ بازی ہوئی۔ جانسن مقدمہ ہار گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عدالت کا فیصلہ یہ تھا کہ پیٹنٹ کسی شکل کا ہو سکتا ہے، قلعی کے طریقے کا پیٹنٹ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اس کے بعد عام پبلک میں یہ طریقہ رائج ہو گیا۔
دوسرا کام جانسن نے پرے بٹن کا شروع کیا اور اس کے لئے اس نے امریکہ اور جرمنی سے کاریگر بلوائے۔ اسی کی معرفت بعد میں یہ کام علی گڑھ کے اور دوسرے لوگوں میں پھیلا۔

اینمل (تام چینی) کا کام سب سے پہلے اسی نے انگلینڈ اور امریکہ سے ماہروں کو بلا کر رائج کیا۔ اس کے بعد یہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پھیلا۔
چوتھا کام آرا مشین کا ہے۔ جانسن پیکنگ کیسز کے واسطے تختے چیرنے کے لئے ان کا استعمال کیا کرتا تھا۔ دوسرے آدمیوں نے انھیں بعد میں استعمال کیا۔
پانچواں کام دھات کی چادروں کو موڑنے کی مشین کا ہے۔ یہ بھی جانسن بہت پہلے اپنے یہاں لگا چکا تھا۔

تاٰرے وغیرہ کا کاروبار گورنمنٹ کے ساتھ کرنے میں یہ سب سے پہلا شخص تھا۔ پوسٹل ورکشاپ میں جتنا کام ہوتا تھا اس سے زیادہ کام جانسن نے کیا۔ جانسن کے زمانے میں اس کارخانے میں سترہ سو اٹھارہ سو آدمی کام کیا کرتے تھے۔

چھٹا کام ٹکٹ پیپر کو اس نے جاری کیا۔

موٹر کی مرمت کے کام کا کارخانہ اپنے یہاں شروع کیا۔

منہ سے بجانے کے باجوں اور ہارمونیم باجوں میں جو پیتل کی باریک شیٹ لگی ہوتی ہے۔ اس کے بنانے اور رواج دینے کی اس نے بہت کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ سینگ کے بٹن بھی گورنمنٹ کو سپلائی کیا کرتا تھا۔

الیکٹروپلیٹنگ کا کام سب سے پہلے جانسن نے شروع کیا اور اس کا کارخانہ اب تک اسی کام کے لئے مشہور ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ہی سے چل رہا ہے۔

ڈیزائنگ مشین جانسن نے بنوائی۔ جانسن بہت صاحب دماغ آدمی تھا اور بہت سی چیزیں اسی کی نکالی ہوئی ہیں۔ علی گڑھ کے بہت سے لوگ اس کی ایجادوں کی وجہ سے روٹی کھا رہے ہیں۔

اپنے دفتر میں آٹھ بجے جاتا تھا۔ اخبار دیکھتا تھا۔ ڈاک آجاتی تھی اور خود ٹائپ کرکے اپنے ہاتھ سے ڈاک کا جواب دیتا تھا۔ اتنے میں گیارہ بج جاتے تھے اور دفتر کے کلرک آجاتے تھے اور یہ ایک بجے تک کام کرتا رہتا تھا۔ پھر ایک گھنٹے کے لئے لنچ کے لئے جاتا تھا۔ پھر چار بجے دفتر چھوڑ دیتا تھا۔ باقی لوگ ۵ بجے تک کام کرتے رہتے تھے۔ اس کا یہ حکم تھا کہ دفتر کے بعد کارخانے کی کوئی خبر اس تک نہ پہنچائی جائے۔ ایک دفعہ آگ لگ گئی تب بھی وہ نہیں گیا۔

مزدوروں کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت اچھا تھا۔ اُن کے ساتھ پیڑھی پر بیٹھ کر مکا کی روٹی اور مٹھائی کھایا کرتا تھا۔ جب لوگ مزدوروں کے ساتھ سختی کرتے تو کہتا تھا یہ ہماری

گائے ہیں ہم ان کا دودھ پیتے ہیں۔ ہمیں ان کو خوش رکھنا چاہیے۔ جب کام مندا ہو جاتا تو مزدوروں کو چنے کھلایا کرتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ دعا مانگو کہ آرڈر آئیں اور کام پھر سے شروع ہو۔

ابتدا میں پھوس کے چھپروں میں کام کرتا تھا، بعد میں پختہ مکانات اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔ مینز اور جینز نام کی دو کوٹھیاں بہت بڑی اور خوب صورت ہیں۔

عام افواہ یہ ہے کہ شراب کے نشے میں رات کے کھانے پر اس نے اپنے کارخانے کا بیع نامہ ڈیڑھ لاکھ روپے میں لکھ دیا تھا۔ دوسرے دن صبح کو یہ اپنی کوٹھی کے ایک ایک درخت سے مل کر خوب رویا اور پھر ریل کی پٹڑی کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنی جان دے دی۔ آخر زمانے میں اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور یہ بات مشہور ہے کہ دوسری بیوی اس سے برابر کہتی تھی کہ کارخانہ فروخت کرکے باہر چلو۔ اب یہ کارخانہ نواب فضل اللہ خاں صاحب کی ریاست کے پاس ہے اور کورٹ آف وارڈز کے زیر انتظام ہے۔

(iii) اسپارلنگ کا کارخانہ | جانسن کے بعد پرائیویٹ لوگوں میں دوسرا نام اسپارلنگ کا ہے۔ یہ بھی یورپین تھا اور پوسٹل ورکشاب میں منیجر تھا۔ اسپارلنگ کا اس صنعت پر کوئی بڑا احسان نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک تالا بنوایا اور اپنا تمام روپیہ صرف اسی ایک تالے سے پیدا کیا۔ پوسٹ آفس میں جو ایک انچ کا تالا استعمال ہوتا ہے، تھیلوں وغیرہ میں لگانے کے لئے وہ اسپارلنگ ہی کا ہے۔ اسپارلنگ بہت روپیہ چھوڑ کر مر گیا۔ اس کی میم بابو منالال کے ذریعے سے کاروبار چلاتی رہی۔ اس کی لڑکی انسپکٹر جنرل پولیس کی بیوی ہے۔ اس نے صرف ۲۳ ہزار میں بابو منالال کے ہاتھ عمارت اور پورا کاروبار فروخت کر دیا۔ اسپارلنگ چونکہ پوسٹل ورکشاپ میں منیجر تھا، اس لئے وہاں کے اثر و رسوخ سے اس نے یہ کارخانہ قائم کیا تھا۔ اس کا تالے سازی کی صنعت پر کوئی خاص احسان نہیں ہے۔

(iv) استاد حسین بخش و رفیع الدین صاحبان | استاد حسین جانسن کے یہاں ملازم تھے۔ بٹن کے کام کو

سیکھ کر جب نکلے تو انھوں نے شہر میں اس کو بہت پھیلایا۔ شہر میں جو لوگ کام کر رہے ہیں ان میں ۹۰ فی صدی سے زیادہ اُن کے شاگرد ہیں۔ علیم اینڈ سنز کے کارخانے میں بھی یہ کام ان ہی کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔ کیونکہ جب انھوں نے یہ کام چلایا تو ان کو ملازم رکھ لیا تھا۔ ۵۰ برس کی عمر ہے لیکن ابھی تک بالکل جوان معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے لڑکے نے بہت بڑا کارخانہ ضمیر آباد کے سامنے بنایا ہے۔

رفیع الدین صاحب علیم صاحب کے خالہ زاد بھائی اور بہنوئی ہیں۔ گیلوانائزڈ کا تالا معمولی قسم کا تھا اس کو اچھی صورت میں لانا اور اس کو ولایتی پالش کے مقابلے پر لانا ان ہی کا کام تھا۔ کسی وقت میں ان کا بہت اچھا کاروبار تھا، اور کاروبار میں ان کا دماغ بھی خوب چلتا تھا۔ انھوں نے کئی تالے نئے ایجاد کئے جن سے اب دوسرے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہندوستان کی چیزوں کو رواج دینے یا پھیلانے کے سلسلے میں یہ سب سے بڑے کام کرنے والے تھے۔ ان کے پاس اشرفیاں تحفوں میں بند ہو کر ایڈوانس کی صورت میں آیا کرتی تھیں کسی کاروبار کرنے والے کو اتنی سہولتیں نہیں ملیں۔ لیکن بزنس کو کنٹرول نہیں کر سکے اس لئے نقصان ہوا۔ ان کے کارخانے میں علیم صاحب کا نام بھی ان کے نانا نے ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے علیم صاحب کو بھی ۱۴ ہزار کے نقصان کا بھگتان کرنا پڑا تھا۔

(۷) تالے والوں میں سرکار کے پسندیدہ ٹھیکے دار | ۱۹۲۶ء میں جب انڈین اسٹور پرچیز ڈیپارٹمنٹ قائم ہوا تو علی گڑھ پوسٹل ورکشاپ کا کام بہت محدود کر دیا گیا۔ اس کے پاس صرف ایک کام مہر بنانے کا رہ گیا اور باقی تمام کام ان ٹھیکہ داروں کے ذریعے جو ان کی فہرست میں پسندیدہ لوگوں میں درج کئے گئے لیا جانے لگا اور یہی صورت ابھی تک جاری ہے۔ علی گڑھ کا میٹل ورکنگ اسکول بھی ۱۹۲۶ء میں قائم کیا گیا۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے گورنمنٹ نے اسٹور پرچیز ڈپارٹمنٹ اور فوجی محکمے کے ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس دونوں کو توڑ کر اور ملا کر چیف کنٹرولر آف سپلائی پرچیز کا فوجی عہدہ قائم

کیا اور اسی نام سے اب کاروبار ہو رہا ہے۔

انڈین اسٹور پرچیز نے کام خوب کیا ۔ اس کے سرکردہ ہوئے تھے۔ اس کی طرف سے اگزامینر مقرر ہوتے تھے۔ بڑا دفتر تھا اور نہایت عمدہ اور معقول افسر ہوتے تھے جو صنعت کے بہت ہمدرد ہوتے تھے۔ یہ محکمہ جیلوں اور گورنمنٹ کے اور سارے محکموں کی ضرورتوں کو پورا کیا کرتا تھا۔ صرف فوجی محکمہ ایسا رہ گیا تھا جو اس کی معرفت چیزیں نہیں خریدتا تھا، بلکہ ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس آرمی ہیڈ کوارٹرز کی معرفت سامان حاصل کرتا تھا۔

انڈین اسٹور پرچیز کے پسندیدہ ٹھیکہ داروں میں علی گڑھ کے تالے وغیرہ کا کام کرنے والوں میں ۱۳ حسب ذیل فرمیں تھیں۔

۱۔ جے ایچ جانسن اینڈ کو	علی گڑھ	۷۔ ایس وزیرالدین اینڈ سنز گوریا باغ	علی گڑھ
۲۔ انڈسٹریل فیکٹری اینڈ لاک ورکس	"	۸۔ الائنس لاک ورکس	"
۳۔ ڈائمنڈ جبلی لاک ورکس	"	۹۔ پنڈت ہیرا لال جی	"
۴۔ اسپارلنگ پٹینٹ لاک ورکس	"	۱۰۔ ہردیو پٹینٹ لاک ورکس	"
۵۔ عبدالعلیم اینڈ سنز	"	۱۱۔ ڈے کے اینڈ سنز	"
۶۔ ایس، ایس، ڈی برادرز بالائے قلعہ	"	۱۲۔ پنڈت مصرا لال جی	"

۱۳۔ ٹیکارام اتم چند۔ علی گڑھ

ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس آرمی ہیڈ کوارٹرز کے نزدیک صرف پانچ حسب ذیل فرمیں پسندیدہ تھیں:۔

(۱) جے ایچ جانسن	علی گڑھ	۳۔ عبدالعلیم اینڈ سنز	علی گڑھ
۲۔ اسپارلنگ	"	۴۔ ڈائمنڈ جبلی	"

۵۔ انڈسٹریل لاک فیکٹری اینڈ آئرن ورکس

غرض صرف اوپر کی فرمیں گورنمنٹ کے ساتھ کام کرتی تھیں اور باہر کے دکاندار لیا

کا مال سپلائی کیا کرتی تھیں۔

میری تحقیقات کے زمانے میں جو فرم چیف کنٹرولر آف سپلائیز کو بڑے پیمانے پر لڑائی کا سامان تیار کرکے بھیج رہی تھیں اور جن کے کام کی تمام شہر میں دھوم مچی ہوئی تھی وہ دو تھیں۔ اول نمبر پر عبدالعلیم اینڈ سنز اور ان کے بعد انڈین اپلیمنٹ ورکس کا نمبر تھا۔ موخرالذکر کے مالک موہن لال بیرسٹر کھتری محلہ نور نگ آباد تھے۔ ان کے لڑکے بھی وکیل ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنگ سے پہلے اِن کی مالی حالت اچھی نہیں تھی لیکن برس ڈیڑھ برس کے اندر عام طور پر یہ مشہور ہے کہ انھوں نے آٹھ، نو لاکھ روپیہ کما لیا۔ انھوں نے بڑے نئے طریقے سے کام شروع کیا۔ انھیں اور اُن کے لڑکے کو گورنمنٹ سے پانچ سو، سات سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ ان کے سارے اسٹاف کو بھی تنخواہ ملتی ہے۔ مال کی سپلائی پر ۱۰ فی صدی منافع ملتا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس مقررہ نرخ کے مقابلے میں ان کو ۲۵ فی صدی منافع پڑ جاتا ہے۔ ان کے یہاں دو لاکھ کا کام مہینے میں ہو جاتا ہے۔ خود موہن لال صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے یہاں ایک ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ مزدور سب علی گڑھ کے ہیں۔ جمعدار مزدوروں کی فراہمی کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ اپنا سب مال اپنے ہی کارخانے میں تیار کراتے ہیں۔ ذیلی ٹھیکے داروں سے کام نہیں کراتے۔ کچا مال یعنی ٹوٹا پھوٹا پیتل (اسکریپ) کانپور، آگرہ اور ڈھاکہ سے آتا ہے۔

ان دو فرموں کے علاوہ سرکاری ٹھیکے دار کی حیثیت سے باقی اور دوسرے تمام فرموں کا کام دوسرے درجے پر تھا، البتہ سرکاری ضرورت کے لئے تالوں کے مہیا کرنے کا کام تقریباً سارے کا سارا گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول کی معرفت انجام پا رہا تھا۔ اس کے افسران اپنی ذاتی انتظام و نگرانی میں بھی تالے تیار کراتے تھے۔ بڑے کارخانہ داروں کو بھی آرڈر دیتے تھے اور چھوٹے کارخانہ داروں اور کاریگروں کو بھی آرڈر دیتے تھے اور انھیں ضروری کچا مال بھی مہیا کرتے تھے۔

(باقی)

نئے علی گڑھ کے مکانوں کا جائزہ

اگر ای، آئی، آر لائن کو خط تقسیم قرار دیا جائے تو علی گڑھ شہر کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے
ایک جنوب مغربی حصہ جس میں پرانا شہر ہے اور دوسرا شمالی مشرقی حصہ جس میں نیا شہر ہے جسے تین مختلف
ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے ، سول لائن، چھاونی، اور یونیورسٹی ٹاؤن۔ ذرا غور کرنے سے
یہ بات فوراً معلوم ہو جاتی ہے کہ ناموں کا یہ اختلاف ایک حقیقی فرق کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ شہر علی گڑھ
کی ساری نئی آبادی ہم آہنگ اور یکساں نوعیت کی نہیں ہے بلکہ تین مختلف عناصر پر مشتمل ہے، پہلا
عنصر علی گڑھ کے خوش حال اور کامیاب لوگوں پر مشتمل ہے جو پرانے شہر سے دور ایک نئی اور
زیادہ ترقی یافتہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، دوسرا عنصر سرکاری عہدہ داروں اور پولیس کے لوگوں کا
ہے جن کا شہر کی زندگی سے محض ایک سرکاری تعلق ہے اور اس میں دیوانی ، کلکٹری اور ریلوے
کے عہدہ دار اور پولیس لائن کے لوگوں کو شامل کیا جا سکتا ہے ، تیسرے عنصر کا علی گڑھ کی
شہری زندگی سے کوئی راست تعلق نہیں ہے ان کا حقیقی تعلق مسلم یونیورسٹی سے ہے چونکہ مسلم یونیورسٹی
کا مستقر علی گڑھ ہے اس لئے یہ لوگ علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ شہر میں اجنبیوں اور غیروں کی طرح
جاتے ہیں اور ضرورت کے سامان لے کر چلے آتے ہیں۔ اگر یہ سامان یونیورسٹی میں ملنے لگیں تو
انھیں شہر جانے کی کوئی خواہش نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں اس آبادی کے ایک حصے نے یہاں مستقل سکونت
اختیار کر لی ہے ۔ اور اپنے ذاتی مکانات بنائے ہیں۔ لیکن زیادہ تر حصہ ایسا ہی جس کا قیام غیر مستقل
رہتا ہے اور جن لوگوں کی یہاں مستقل سکونت ہے انھوں نے بھی اپنی دنیا الگ رکھی ہے جس پر
شہر علی گڑھ کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ہم مندرجہ بالا تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے علی گڑھ شہر کی
نئی آبادی کا جائزہ لیتے ہیں۔

۱۔ علی گڑھ کے کامیاب لوگوں کے مکانات | انٹر سولی روڈ کے مکانات کو اس قسم کے مکانوں کا خاص

سمجھنا چاہیئے۔ یہاں علی گڑھ کے کامیاب تاجروں، ساہوکاروں، زمینداروں، سرکاری ملازموں اور وکیلوں نے مکان بنائے ہیں۔ یہ مکان تقریباً تمام تر ہندوؤں کے قبضے میں ہیں۔ ان میں زیادہ مکان تو وہ ہیں جو شہر جیسے محلے بسا کر تعمیر کئے گئے ہیں۔ لیکن شہر کے مقابلے میں زیادہ کشادہ، ہوادار اور با ترتیب ہیں۔ علی گڑھ سے اترولی جانے والی سڑک پر اس، آئی، آر لائن کو عبور کرنے کے بعد دائیں ہاتھ پر بیکنٹھ نگر، سدامانپوری، وشنوپوری اور نور نجن پوری اور بائیں ہاتھ پر پریم نگر اور شیام نگر کی بستیاں ملتی ہیں جو شہر کے محلوں سے بس تھوڑی ہی سی مختلف ہیں۔ ان بستیوں میں دوکانیں بھی ہیں، بازار بھی ہیں، کارخانے بھی ہیں۔ مکان پاس پاس ہیں اور تقریباً شہر کی وضع قطع کے ہیں۔ گو شہر کے مقابلے میں کچھ زیادہ صاف اور با ترتیب ہیں۔ اس سڑک پر آگے چل کر البتہ کچھ کوٹھیاں ملتی ہیں۔ لیکن نواب سمیع اللہ خاں کی کوٹھی کو چھوڑ کر باقی سب کے مالک اور قابض ہندو ہیں، دائیں ہاتھ پر مکانوں، بغیچوں اور کوٹھیوں کے علاوہ ٹیکا رام گرلز اسکول اور پبلک موہن اسپتال کی بلڈنگس بھی ہیں۔ اسی طرح بائیں ہاتھ پر کوٹھیوں، بغیچیوں اور باغوں کے علاوہ دی لائنس لاک ورکس (تالے کا کارخانہ) اور برف کا کارخانہ بھی ہیں۔ نئی بستیوں کے مکانوں کے علاوہ صرف کوٹھیاں پندرہ کے قریب ہوں گی جن میں ایک مسلمان کی تھی، جو اجڑی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ سب کوٹھیاں دس ہزار سے کم لاگت کی معلوم ہوتی تھیں۔

۲- ملے جلے مکانات | ان کے نمونے میرس روڈ، ڈاک بنگلہ روڈ، ڈگی والی سڑک، دودھ پور والی سڑک، چھیرت کی سڑک اور جانسن کے کارخانہ والی سڑک پر نظر آئے۔ ان مقامات پر یونیورسٹی کے لوگوں، ضلع کے زمینداروں، شہر کے وکیلوں، ساہوکاروں اور دولتمند لوگوں کے مکانات اور ریلوے کوارٹرز باہم ملے جلے نظر آئے۔ ان مکانوں میں میرس روڈ کے تقریباً تمام مکان اول درجے کے تھے اور دوسری سڑکوں کے مکان اول اور دوم دونوں درجوں کے تھے۔

میرس روڈ کے مکانوں میں تعداد کے لحاظ سے تقریباً آدھے مکان ہندوؤں اور

دے مسلمانوں کے تھے۔ لیکن مالیت کے لحاظ سے مسلمانوں کے مکان بہت بڑھے ہوئے تھے
چونکہ ہندوؤں کا غالباً کوئی مکان بیس ہزار سے زیادہ مالیت کا نہیں تھا اور مسلمانوں کے
بہت سے مکان بیس ہزار تا لاکھ ڈیڑھ کی مالیت کے تھے۔ اس سڑک کے تمام وہ مکان جن کی
حیثیت دس ہزار سے اوپر ہے تقریباً چالیس کے قریب ہیں۔

ڈاک بنگلہ روڈ پر مسلمانوں کا کوئی مکان نہیں ہے۔ یہاں ایک احاطہ میں کئی مکان
ہیں۔ ہر مکان کو اگر علیحدہ شمار کیا جائے تو غالباً دس ہزار سے زیادہ حیثیت کا ایک مکان بھی
نہیں نکلے گا۔ اس سڑک کے کل مکانوں کی تعداد بیس کے قریب ہوگی۔

ڈگی والی سڑک پر کسی ہندو کا مکان نہیں ہے۔ یہاں بھی ایک احاطے میں کئی کئی مکان
ہیں اور مکانوں کی مالیت دس ہزار سے کم ہے، کل تعداد بیس کے قریب ہوگی۔

دودھ والی سڑک پر سوائے موضع دودھ پور کے کم حیثیت مکانوں کے کسی ہندو کا
کوئی مکان نہیں ہے لیکن مسلمانوں کے مکان بہت بڑی مالیت کے ہیں۔

کچہری کی سڑک پر تین چار ہندو ٹرسٹ کی کوٹھیوں کے سوا کوئی ہندو مکان نہیں
ہے مگر گلزاری لال ٹرسٹ کی دو کوٹھیاں زیادہ مالیات کی ہیں۔ مسلمانوں کے سب مکان
زیادہ مالیت کے ہیں۔ کچہری تا قلعہ کی سڑک پر سوائے دو تین ہندو مکانوں کے کسی ہندو
کا مکان نہیں ہے۔ جانسن کے کارخانے والی سڑک پر بھی سوائے چار پانچ ہندو مکانوں
کے کسی ہندو کا مکان نہیں ہے۔ جانسن کی بنوائی ہوئی کوٹھیوں کی مالیت جواب مزمل اللہ خاں
کے وارثوں کے قبضے میں ہے زیادہ ہے۔

عنوان نمبر ۲ کے کل مکانوں کا اگر شمار کیا جائے تو تقریباً سو کوٹھیوں میں سے ۲۰،۲۵
کوٹھیاں ہندوؤں کی نکلیں گی۔ لیکن ان کی مالیت مسلمانوں کی کوٹھیوں کے مقابلے میں صرف
دس فی صدی ہوگی۔

۳۔ یونیورسٹی ٹاؤن کے مکانات ۔ اس میں مسلم یونیورسٹی (جانب شرق) کی زمینوں پر تعمیر کئے ہوئے

جملہ مکانات موضع بھمولا کے پاس اور آر آر لائن کے قریب کے مکانات اور وقف عبدالرحمٰن کی زمینوں پر تعمیر کئے ہوئے مکانات شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر اول اور کم تر دویم درجے کے مکانات ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر دس ہزار سے زیادہ مالیت کے مکان ہیں یہ مسلم یونیورسٹی کے اسٹاف کے لوگوں نے بنائے ہیں یا ان لوگوں نے بنائے ہیں جو اپنی ملازمتوں سے پنشن لینے کے بعد اپنی اولاد کی تعلیم کی خاطر علی گڑھ میں بس گئے۔ ان کوٹھیوں کی تعداد بھی تقریباً سو کے قریب ہوتی ہے۔

چنانچہ علی گڑھ کے نئے شہر کی محض کوٹھیوں اور بنگلوں کا اگر شمار کیا جائے اور اس میں ہندو اور مسلمانوں کا تناسب دیکھا جائے تو یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہندوؤں کے پاس تعداد کے لحاظ سے تقریباً ۵۰ فی صدی اور مالیت کے لحاظ سے پانچ فی صدی کوٹھیاں اور بنگلے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ کوٹھیاں ابھی تک قرض کے چکر میں نہیں پھنسی ہیں، تین چار کوٹھیوں کے بارے میں یہ بیان کیا گیا کہ وہ خیالی رام جاپان والوں کے یہاں جو سکنا ئی جائداد پر روپیہ قرض دیتے ہیں اور میرس روڈ پر کئی کوٹھیوں کے مالک ہیں، رہن رکھی گئی تھیں لیکن اب کہا جاتا ہے کہ وہ بھی قرض کے بار سے سبکدوش ہوگئی ہیں۔ ان کوٹھیوں کا انجام آئندہ کیا ہوگا اس کا انحصار نئی نسل پر ہے۔ اگر موجودہ نسل کے لوگوں کی اولاد لائق ثابت ہوئی اور اتنا کما سکی کہ جس سے اس بلند معیار کو جو کوٹھیوں میں رہنے سے لازماً اختیار کرنا پڑتا ہے پورا کرسکی تب تو یہ جائداد ان کے پاس یا ان کے ہم مذہب مسلمانوں کے پاس ان کا پہنچنا لازمی ہو جائے گا۔

مسلم یونیورسٹی ٹاؤن مسلمانوں کی ایک نہایت ستھری اور پاکیزہ آبادی بن سکتی ہے۔ جنگ نے اس کی ترقی میں فی الحال رکاوٹ ڈال دی ہے، لیکن جنگ کے خاتمہ پر امید ہے کہ یہ آبادی اور زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی کرے گی اس کی جماعتی زندگی کو مسلم یونیورسٹی کی سیاست اور ہندوستان کی سیاست سے علیحدہ رکھ کر

منظم کیا جا سکے تو شاید مسلمانانِ ہند کی معاشرتی اور تمدنی ترقی کا کام بہت کامیابی
کے ساتھ انجام دے سکے گی۔ کیا وہ لوگ جو اس آبادی میں رہتے ہیں اپنے مواقع اور
اپنی ذمے داریوں سے واقف ہیں۔

کتب موصولہ پر ایک نظر

ہندوستان کی معیشت اور جنگ

از محمد احمد خاں صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ - متوسط تقطیع، عمدہ جلد، اور گردپوش، کتابت، طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۹۶ - قیمت تین روپے

ملنے کا پتہ :- ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدرآباد دکن -

معاشی تالیفات کے سلسلے میں مولوی محمد احمد خاں صاحب اچھا نام پیدا کر چکے ہیں - اُن کی زیر نظر کتاب ایک نہایت کامیاب علمی کوشش ہے - اس میں ہندوستانی معیشت کے مختلف پہلوؤں پر، جنگ کے جو اثرات ہوئے ہیں، ان کا تجزیہ تازہ ترین اعداد و شمار کی روشنی میں کیا گیا ہے اور مشکل سے مشکل مفہوم کو اس طرح عام پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے. کتاب کے نو باب ہیں جن میں جنگ کے زمانے میں ہندوستان کی زراعت، صنعت، تجارت خارجہ وسائل نقل و حمل، زر، بنک، مالیات، قومی قرضہ کی جو کیفیت رہی ہے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور آخری باب میں جنگ کے بعد ہندوستان کے جو معاشی مسائل ہوں گے ان کی وضاحت کی گئی ہے - ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انھوں نے شستہ زبان اور شگفتہ انداز میں ایسا پیش کیا ہے جو آسانی سے کسی انگریزی کتاب میں بھی نہیں ملتا -

ہندوستانی معاشیات کے مبادی

از شرف الدین صاحب بی - اے - بڑی تقطیع - غیر مجلد، کتابت، طباعت اچھی صفحات ۲۵۸ قیمت دو روپے - ملنے کا پتہ :- دفتر طیلسانیین، عثمانیہ باغ عامہ، حیدرآباد دکن -

اردو زبان میں معاشیات ہند کے موضوع پر بہت کم کتابیں موجود ہیں ۔ شرف الدین صاحب نے اس کتاب کو تیار کرکے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے ۔ اس کتاب میں برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی سے متعلق بھی اجمالی حالات ایک جگہ جمع کردیئے گئے ہیں ، کتاب کی زبان سادہ اور عام فہم ہے ، اُمید ہے کہ اردو داں طبقہ کے لئے عموماً اور معاشیات کے طلبا کے لئے خصوصاً یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی ۔

نادراتِ شاہی

مرتبہ امتیاز علی خاں صاحب عرشی ، بڑی تقطیع ، خوبصورت جلد ٹائپ کی نہایت پاکیزہ طباعت بہت عمدہ کاغذ ، صفحات ۲۳۲ ۔ قیمت درج نہیں ۔

یہ شاہ عالم ثانی کے اردو ، فارسی اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے جو بادشاہ کے حکم سے ۱۱۹۱ھ میں مرتب کیا گیا تھا ۔ اسے تصحیح کے بعد عرشی صاحب نے سلسلۂ مطبوعات کتاب خانہ عالیہ ریاست رامپور کے ماتحت حسب الحکم نواب صاحب ریاست رامپور شائع کیا ہے ۔ اس کے لئے بشیر حسین صاحب زیدی چیف منسٹر نے تقریب لکھی ہے اور خود عرشی صاحب نے ۶۳ صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے ۔ متن کتاب کو اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے جسے حسب ذیل موضوع پر تقسیم کیا گیا ہے ، اشخاص و مقامات ، آتش بازی و روشنی ، پھول پھل ، ساز اور رسمیں ، یہ کتاب زبان اردو کے مؤرخوں اور محققوں کے لئے ایک بیش قیمت ماخذ ثابت ہوگی ۔

دی مسلم لیگ

از ولفورڈ کانٹ اسمتھ ، چھوٹی تقطیع صفحات ۷۵ ۔ بزبان انگریزی ، طباعت اچھی ، قیمت دو روپے ، ناشر :- دی منروا ورکشاپ ، لاہور ۔

ولفورڈ اسمتھ نے اپنی کتاب "دی ماڈرن اسلام ان انڈیا" کو لکھ کر پڑھے لکھے مسلمانوں میں اور خاص طور پر ہندوستانیوں میں عام طور پر خاصی شہرت حاصل کر لی ہے مصنف موصوف کا اسلامی ہند کے بارے میں مطالعہ بہت اچھا ہے۔ یہ فورمن کرسچین کالج لاہور میں تاریخ اسلام کے لکچرر اور علی گڑھ کے ہنری مارٹن اسکول آف اسلامک اسٹڈیز کے رفیق خارجی ہیں۔ موصوف اشتراکی عقیدہ رکھتے ہیں اور اسی نقطۂ نگاہ سے انھوں نے اسلامی تحریک کا مطالعہ کیا ہے اپنی پہلی کتاب میں مسلم لیگ کو انھوں نے ایک رجعت پسند تحریک ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن زیر نظر رسالہ میں اُن کا نظریہ تبدیل ہوگیا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے تجزیہ حالات سے انھیں پورا اتفاق ہے۔ ان کی اس کتاب میں کوئی ندرت اور جدت نہیں پائی جاتی، ان تمام باتوں کو جن کی کمیونسٹ اپنے پلیٹ فارم اور پریس کے ذریعے خوب اشاعت کر چکے ہیں اس کتاب میں بھی دہرا دیا گیا ہے۔

اشتراکیت اور اسلام

از مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع متوسط، صفحات ۸۰، غیر مجلد، طباعت وکتابت رسالہ معارف جیسی۔ قیمت عہ

یہ مطبوعات دار المصنفین کے سلسلے کی اڑسٹھویں کتاب ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ مذہب اسلام کے حامیوں کی طرف سے اشتراکیت کو معقولیت کے ساتھ سمجھ کر اسی پر تنقید کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس اعتبار سے یہ کوشش مستحق ستائش ہے۔ لیکن ابھی اس قسم کی اور بہت سی کوششیں کرنے کی ضرورت ہے جب ہی تمام تنقیح طلب امور پوری طرح روشنی میں آسکیں گے اور مقابلہ اور مباحثہ کے لئے ایک مشترکہ میدان تیار ہوسکے گا۔ اب تک مناظرہ کی صورت یہ رہی ہے کہ فریق مخالف کی طرف من مانے خیالات و عقائد و اعمال منسوب کئے جاتے رہے ہیں اور انھی کی بنیاد پر

صفائی اور مدافعت کا موقع دئے بغیر اس کے خلاف فیصلے صادر کئے جا رہے ہیں۔
اپنے مخصوص حلقہ اور گروہ میں یہ چیز چاہے کتنی ہی دل خوش کن اور اطمینان بخش
کیوں نہ نظر آتی ہو لیکن اس حلقہ سے باہر یہ طریقہ مضحک اور ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا رہا ہے
اس لئے ہم مسعود عالم صاحب ندوی کی اس کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید
کرتے ہیں کہ خود وہ اور دیگر حضرات اشتراکیت کا اور زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ
فرمائیں گے اور اسلام کے ساتھ اس کا جو بنیادی اختلاف یا مشابہت ہے اس کی وضاحت
کرتے رہیں گے تاکہ عامۃ المسلمین کی صحیح رہنمائی کی جاسکے۔

علماء اور اسلام

از مظہر الدین صاحب صدیقی، چھوٹی تقطیع، غیر مجلد قیمت ۱۲؍ صفحات ۸۲
ناشر:۔ دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ جدید، نامپلی، حیدرآباد دکن۔

یہ مولوی منظرالدین صاحب کے رسالہ "علمائے کرام کا مستقبل" کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسے مصنف نے بعض اجزاء کو حذف کرکے نئے اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے رسالہ کے اول ایڈیشن پر رسالہ جامعہ میں تنقید کی جاچکی ہے۔ زیر نظر رسالہ میں مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ قومی اور بین الاقوامی تحریکات میں صرف اسلام اور اشتراکیت دو ایسی تحریکیں ہیں جو انسانیت کے عالمگیر امراض و مصائب کا علاج پیش کرتی ہیں اور مقامی یا قومی وطن پرستی سے مبرا ہیں۔ یہی دو مقابل اصول زندگی ہیں جن کی کش مکش پر بالآخر دنیا کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ لیکن اشتراکی تحریک کو جس خلوص اور جوش کے ساتھ قبول کیا گیا اور اس کے عملی نفاذ کی غرض سے اس کے پیرووں نے جو قربانیاں اور سرفروشیاں کیں اس کی مثال موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں نہیں ملتی ہیں۔ اس لئے مصنف کا یہ دعوےٰ ہے کہ ہمارے علماء بھی اگر اسلام کو اسی جوش و خروش خلوص اور اسی صداقت پسندی کے ساتھ لے کر اٹھیں اور اسے عبادات و ریاضیات کا ایک مجموعہ قرار دینے کی جگہ انسان کی اجتماعی فلاح اور تہذیبی ترقی کے ایک نظریے کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کریں تو یقیناً وہ اشتراکی تحریک کے مقابلے میں بہت جلد اسے کامیاب کرسکتے ہیں۔

۱۔ اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاح عالم
۲۔ اسلامی نظام

از حکیم محمد اسحٰق صاحب سندھیلوی۔ چھوٹی تقطیع۔ غیر مجلد قیمت ہر دو آٹھ آنے

ناشر دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ جدید نامپلی، حیدرآباد دکن۔

یہ دونوں رسالے بھی موجودہ سیاسی و اجتماعی تحریک کے مقابلہ میں اسلامی نظام کی برتری ثابت کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں اور لائق مطالعہ ہیں۔

رسول اللہؐ

مرتبہ مولانا ایوب صاحب اصلاحی، غیر مجلد، چھوٹی تقطیع صفحات ۱۲۰ قیمت ۸/۔ ناشر مؤتمر المصنفین کوچہ چیلان بیت السعید، دہلی۔

یہ سلسلہ مؤتمر المصنفین کی چوتھی کتاب ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر مگر

مستند سیرت پیش کی گئی ہے۔

اسلامی نظمیں | از مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر۔ چھوٹی تقطیع۔ غیر مجلد صفحات ۲۰، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

نیر صاحب نے بچوں کے شاعر کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس مجموعے میں اسلامی تعلیمات کو بچوں کے دل میں بٹھانے کے لئے جو نظمیں مختلف اوقات میں لکھی گئی تھیں ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

۱۔ نیری کہانیاں | از جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر۔ تقطیع کاپی سائز، ضخامت
۲۔ گھی شکر | علی الترتیب ۴۴، ۴۵ صفحات، خوش نما ٹائٹل قیمت ہر دو نولو آنے

ملنے کا پتہ ←—— مکتبہ جامعہ دہلی

نیر صاحب کی نظموں کے یہ دو تازہ مجموعے سات، آٹھ سال کی عمر کے بچوں کے لئے جنھوں نے اردو پڑھنا نیا نیا سیکھا ہو۔ بہت مفید ثابت ہوں گے، ان سے نہ صرف ان کی معلومات بڑھیں گی۔ ان کے اندر سوچ بچار کی عادت پیدا ہوگی۔ اظہار بیان پر قدرت حاصل ہوگی، بلکہ اپنے گرد و پیش کی اشیاء سے دلچسپی لینے کا بھی شوق پیدا ہوگا۔

موج نیل | مترجمہ قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ چھوٹی تقطیع، عمدہ جلد اور گرد پوش، اچھی کتابت وطباعت، صفحات ۱۷۰۔ قیمت عہ ناشر مکتبہ علمیہ قاضی واڑہ، میرٹھ

یہ سلسلہ سید مصطفے المطفی المنفلوطی کے عربی افسانوں اور افسانوی مضامین کا ترجمہ ہے جو سجاد صاحب میرٹھی نے نہایت خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچایا ہے۔ شروع میں مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا مقدمہ ہے۔ منفلوطی کو علامہ جمال الدین افغانی اور علامہ عبدہٗ کے فیض صحبت سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملا تھا، اس لئے دینی، اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں اس کی نظر بہت گہری اور اس کی ہمدردیاں بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ منفلوطی کا دل اپنے وطن مصر کی غلامی پر ہمیشہ سوگوار رہا، اور وہ اس کی آزادی کے لئے مساعی رہا۔ فکر و نظر کی ان

بلندیوں کے ساتھ افسانہ نگاری اور انشاء پردازی کے فن میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔ سعد زاغلول پاشا مرحوم منفلوطی سے کہا کرتے تھے۔ آپ کے مضامین کے آئینے میں جو عظیم شخصیت جلوہ گر ہے کاش اس کی جھلک دوسرے اہل قلم کی تحریروں میں بھی نظر آتی! اُس پائے کے ادیب کے لئے ایک قابل مترجم کی ضرورت تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ سجاد صاحب میرٹھی نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے۔ کسی جگہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کسی دوسری زبان کا ترجمہ پڑھا جا رہا ہے بلکہ اپنی زبان کا مٹھاس، زور، محاورہ فصاحت اور شوکت ہر جگہ فراوانی کے ساتھ جلوہ ریز نظر آتی ہے "عذاب" اور "نقاب اٹھ جانے کے بعد" خصوصیت کے ساتھ ایسے افسانے ہیں جن کی نظیر اردو ادب پیش نہیں کر سکتا اور مترجم نے واقعی ان کے ترجمے میں اپنا پورا کمال دکھلا دیا ہے۔

سُرخ افسانے مترجمہ اسرار احمد صاحب آزاد، چھوٹی تقطیع، عمدہ جلد، مصور ٹائٹل اور گرد پوش، اچھی کتابت و طباعت صفحات ۲۸۸ قیمت تین روپے۔

ناشر:۔ نیا کتاب گھر اردو بازار، دہلی۔

اس مجموعے میں مختلف ہم عصر روسی افسانہ نگاروں کے انیس افسانوں کو یکجا کر دیا گیا ہے ان سب کا موضوع موجودہ جنگ ہے۔ اور ان کا مقصد دشمن کے خلاف نفرت کے جذبات کو برانگیختہ کرنا اور ملک کے لوگوں میں دلیری، ثابت قدمی، جاں نثاری اور باہمی یگانگت اور محبت کو ترقی دینا ہے۔ ادب برائے ادب کے حامیوں کو یہ افسانے محض وقتی پروپیگنڈا نظر آئیں گے جن کا زندگی کی ابدی قدروں سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اور وہ پیشانی پر بل ڈال کر اس کتاب کو ردی کی ٹوکری میں پھینکنا چاہیں گے۔ لیکن اس کے باوجود افسانہ نگاروں نے اپنا محدود کام زبان کی سلاست اور شگفتگی کو اچھی طرح قائم رکھا ہے اور افسانوں کے انتخاب میں جس اصول کو پیش نظر رکھا ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل طریقے پر بیان کیا جا سکتا ہے "ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ افسانہ کے نام سے اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے اس کا کوئی مدعا، مقصد اور مفہوم نہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے ہمیشہ وہی افسانے پسند آئے جن کا مطالعہ ہمیں مجنوں صفت" اور لیلیٰ خصلت

بنانے کی جگہ ہمارے قلوب میں ہمت، امنگ اور دلیری پیدا کرتا ہو، ہماری معاشرتی اور اخلاقی کمزوریوں اور برائیوں کی اصلاح پر توجہ دلاتا ہو۔ نیک مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے ایثار اور سرفروشی کا سبق سکھاتا ہو اور زندہ رہنے کے لئے ہمارے دل میں خود ملک الموت سے ٹکرا جانے کا جذبہ پیدا کرسکتا ہو" جن لوگوں کو مترجم کے اس نظریہ سے اتفاق ہے ان کے لئے یہ افسانے دلچسپی کا باعث ہوں گے ان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ" یہ ان لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے اشتراکی تہذیب کے سایے میں پرورش پائی ہے"۔

صبح انقلاب تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ضخامت ۱۲۸ صفحات ۔مجلد، مصوّر اور رنگین گرد پوش ۔کتابت اور طباعت اچھی اور قیمت فی جلد عہ

ملنے کا پتہ :- سید محمد زکریا صاحب صہبا، نند کشور لال روڈ۔ گیا، صوبہ بہار

زیر نظر کتاب مولوی محمد عباس صاحب سریہ کابری کے افکار کا نتیجہ ہے۔ آپ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل کے شاگرد، متعدد علمی کتابوں کے مصنف، ایک معمر کہنہ مشق شاعر ہیں غزل گوئی میں آپ کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ صبح انقلاب آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اور بقول حضرت رضا علی صاحب وحشت کلکتوی" اس مجموعہ میں کلام کی پختگی کے ساتھ ایک دلکش انداز بھی ہے جو نہایت درجہ جاذب قلوب ہے۔ صبح انقلاب کی نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ہیں۔ "نشر حیات" اس حصہ میں ملک کے اہم معاشرتی مسائل یعنی غریبی قحط، غلامی اور جنگ پر پچیس نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ "پیکر جذبات" کا حصہ بارہ جذباتی نظموں پر مشتمل ہے۔ "حسن تخیلات" کا حصہ تیرہ متفکرانہ نظموں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ اسلامیات کے ذیل میں آٹھ اور سیاسیات کے سلسلے میں تین بلند پایہ نظمیں ہیں۔ آپ نے ہر عنوان پر بڑی کامیابی سے طبع آزمائی فرمائی ہے۔ ملک کو ایسی ہی نظموں کی ضرورت ہیں یقین ہے کہ ہماری زبان کے شاعرانہ ادب میں صبح انقلاب بلند جگہ پائے گی۔

اشاعت کتب کے سلسلے میں صوبۂ بہار کو ابھی تک وہ آسانیاں حاصل نہیں ہیں جو شمالی ہند کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بزرگانِ بہار کے اکثر کارنامے نذر تغافل رہتے ہیں

ضرورت ہو کہ ان کارناموں کی ملک میں اشاعت ہو۔ یہ امر نہ صرف ترقی ادب کے لئے نیک فال ہوگا بلکہ جو حضرات ادبی مساعی میں سرگرم ہیں ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی۔ اس نقطۂ نظر سے بھی ضرورت ہے کہ نہ صرف اہل بہار بلکہ اہل ملک اس مجموعے کی قدر کریں۔

رسالہ نئی زندگی، الہ آباد سان فرانسسکو نمبر اگست ۱۹۴۵ء۔ ایڈیٹر سید انیس الرحمٰن۔

اس نمبر میں سان فرانسسکو کانفرنس سے متعلق نہایت عمدہ مضامین جمع کئے گئے ہیں مضامین کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بین الاقوامی تنظیم کی تاریخ، جمعیتہ الاقوام اور اس کے زوال کی کہانی، واقعاتِ عالم کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں سان فرانسسکو کی شروعات ڈمبرٹن اوکس کے منصوبے اور تجویزیں، بین الاقوامی تنظیم اور بین الاقوامی مجلس امن کے بارے میں مضمون درج کئے گئے ہیں۔ ان میں ڈاکٹر تاراچند اور پی سی جوشی کے مضامین خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ تیسرے باب میں سان فرانسسکو کانفرنس اور اس کے فیصلے اور چوتھے باب میں نیا نظامِ عالم اور ہندوستان پر مضامین درج کئے گئے ہیں۔ اور اخباروں کی رائوں کو نقل کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کوشش نہایت قابلِ تعریف اور مستحق مبارکباد ہے۔

رسالہ جدید اردو، کلکتہ بنگال نمبر ستمبر ۱۹۴۵ء۔ مدیر ساغر نظامی احسن صاحب قاضی و عبدالجلیل صاحب

عید کے موقع پر "جدید اردو" کا یہ تیسرا بنگال نمبر نکالا گیا ہے۔ اس کا مقصد بنگالہ میں اردو کی ترویج و ترقی ہے، رسالہ کو "مقالات"، "منظومات" اور "افسانے" "ڈرامے اور ادبی شہ پاروں کے عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا گیا ہے پہلے عنوان کے تحت نو مضامین اور دوسرے کے تحت انیس غزلیں و نظمیں اور تیسرے کے تحت گیارہ افسانے وغیرہ جمع کئے گئے ہیں۔ ملک کے مشہور مصنفوں نے اس کی تیاری میں شرکت کی ہے۔ رسالہ کی یہ ادبی خدمت مستحق تعریف ہے۔

رسالہ پریم، جموں کشمیر ایڈیٹر:۔ گلزار احمد فدا اور اقبال تمنائی

جلد تین کے تین شمارے سامنے ہیں اور تینوں اس رسالے کے بلند معیار کے شاہد ہیں ملک کے مشہور مستند ادیبوں نے اپنے نتائج فکر سے رسالہ کو نوازا ہے اور یہ زبان اردو کی اچھی خدمت کر رہا ہے۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب   عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	۲۵ لاکھ روپے	۲۵۰۰۰۰۰
ادا شدہ سرمایہ	۱۲ ″ ۵۰ ″	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے، ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمد آباد، کانپور، پشاور

فلسطین TEL-VIV

مطبوعاتِ جامعہ

واردات منشی پریم چند عـہ/

بیوہ " " " عـہ/

انشار کی تعلیم مضمون نگاری پر ایک کتاب ۸/

تاریخ الامت حصہ ہشتم سلسلۂ تاریخ اسلام کی آخری کڑی اسلام اور تاریخ اسلام کے فلسفے پر ایک نظر۔ عـہ/

بادشاہ میکیاولی کی شہرۂ آفاق کتاب "پرنس" کا ترجمہ از ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب عـہ/

عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی ۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استادِ قانون، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن ۸/

مکتبہ جامعہ دہلی

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

۱۔ قاعدہ ۴ر ۲۔ درس سبق ۴ر

۱۔ نماز ۴ر
۲۔ حکایتیں اول ۴ر
۳۔ 〃 دوم ۴ر
۴۔ حبیب خدا ۴ر
۵۔ نظمیں ۴ر
۶۔ میونسپلٹی ۴ر
۷۔ صدیق اکبر ۴ر
۸۔ خط کتابت ۴ر
۹۔ ضلع کا انتظام ۴ر
۱۰۔ قومی گیت ۴ر
۱۱۔ غزلیں ۴ر
۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۴ر
۱۳۔ ماما بھی پڑھنے لگے ۴ر
۱۴۔ عمر فاروق ۴ر
۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۴ر
۱۶۔ شہید کربلا ۴ر
۱۷۔ ہماری دنیا ۴ر
۱۸۔ ایشیا ۴ر
۱۹۔ یورپ ۴ر
۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ۴ر
۲۱۔ مثنوی میر حسن ۴ر
۲۲۔ گل بکاؤلی ۴ر
۲۳۔ چار درویش اول ۴ر
۲۴۔ 〃 〃 دوم ۴ر
۲۵۔ 〃 〃 سوم ۴ر
۲۶۔ چار درویش چہارم ۴ر
۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۴ر
۲۸۔ 〃 〃 دوم ۴ر
۲۹۔ 〃 〃 سوم ۴ر
۳۰۔ 〃 منصور موہنا ۴ر
۳۱ 〃 فردوس بریں ۴ر
۳۲۔ لیلیٰ مجنوں ۴ر
۳۳۔ شکنتلا ۴ر
۳۴ تانگے والا ۴ر
۳۵۔ کشتی ۴ر
۳۶۔ صوبے کی حکومت ۴ر
۳۷۔ حکومت ہند ۴ر
۳۸۔ جمہوریت ۴ر
۳۹۔ دوہے ۴ر
۴۰۔ دلچسپ شعر ۴ر
۴۱۔ مرثیے ۴ر
۴۲۔ مسدس حالی ۴ر
۴۳۔ حالی کی نظمیں ۴ر
۴۴۔ گنتی ۴ر
۴۵۔ بڑی گنتی ۴ر
۴۶۔ پہاڑے پیمانے ۴ر
۴۷۔ اجرت کا حساب ۴ر
۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۴ر
۴۹۔ چاند تارے ۴ر
۵۰۔ نزلہ زکام ۴ر
۵۱ حالات قرآن مجید ۴ر
۵۲۔ تعلیمات 〃 (عقائد) ۴ر
۵۳۔ 〃 〃 (عبادات) ۴ر
۵۴ 〃 〃 (اخلاق) ۴ر
۵۵ 〃 〃 معاملات ۴ر
۵۶ قصص قرآن مجید ۱ ۴ر
۵۷۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
۵۸ کعبہ شریف ۴ر
۵۹۔ حدیث شریف ۴ر
۶۰۔ عثمان غنی ۴ر
۶۱۔ علی مرتضیٰ ۴ر
۶۲۔ صحابہ کرام ۱ ۴ر
۶۳ 〃 〃 ۲ ۴ر
۶۴ 〃 〃 ۳ ۴ر
۶۵ 〃 〃 ۴ ۴ر
۶۶ 〃 〃 ۵ ۴ر
۶۷ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۴ر
۶۸ حضرت غوث پاک ۴ر
۶۹۔ اجمیری خواجہ ۴ر
۷۰ نظام الدین اولیا ۴ر
۷۱۔ گوتم بدھ ۴ر
۷۲ کرشن کنھیا ۴ر
۷۳ رام کہانی ۱ ۴ر
۷۴۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
۷۵۔ افریقہ ۴ر
۷۶۔ امریکہ ۴ر
۷۷۔ جنوبی امریکہ ۴ر
۷۸ سرزمین ہند ۴ر
۷۹ صوبے ۴ر
۸۰۔ دیسی ریاستیں ۴ر
۸۱ داستان امیر حمزہ ۱ ۴ر
۸۲۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
۸۳۔ 〃 〃 ۳ ۴ر
۸۴۔ 〃 〃 ۴ ۴ر
۸۵ 〃 〃 ۵ ۴ر
۸۶۔ کہاوتیں ۴ر
۸۷۔ پہیلیاں ۴ر
۸۸۔ گرونانک ۴ر
۸۹۔ مثنوی میر حسن ۴ر
۹۰۔ گلستان ۴ر
۹۱۔ احمد خاں دکاندار ۴ر
۹۲ عبدالرحمٰن راج ۴ر
۹۳۔ نصیب خاں حجام ۴ر
۹۴ حسا خدمت گار ۴ر
۹۵۔ پیارے خاں درزی ۴ر
۹۶ حفیظ خاں خانساماں ۴ر
۹۷۔ بجن بڑھئی ۴ر
۹۸۔ سمدھو حلوائی ۴ر
۹۹۔ میرا ننھا ۴ر
۱۰۰۔ ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے ۴ر

مکتبہ جامعہ دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

تاریخ الامت (مکمل)

الحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر تاریخ اسلام۔ سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں۔ آٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفے پر حاوی ہے۔ قیمت مکمل سٹ ۱۵ ۸ر

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
پردۂ غفلت (ڈراما) ڈاکٹر سید عابد حسین	عہر	نقش آخر (ڈراما) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	عہر
انتخاب [illegible]۔ مولوی نورالرحمٰن	[illegible]	باغبانی پروجکٹ (اسکولوں کے لئے)	۱۲ر
[illegible] کی پہلی کتاب	۸ر	ہندوستانی کی پہلی کتاب	۸ر
بادشاہ (پرنس کا ترجمہ)	[illegible]	عہد نبوی میں نظام مملکت	[illegible]

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
ننھی مرغابی	۵ر	تانبیل خاں	۵ر	سمندر کا عجائب خانہ	عہر
روئی مکس نے پکائی	۹ر	جیو متو	۵ر	عقائد اسلام	[illegible]
جادو کا گھر	۸ر	لال مرغی	۶ر	ارکان اسلام	۶ر
لومڑی کا گھر	۸ر	دو بھائی	۸ر	ہمارے نبی	۶ر
بی مینڈکی اور کوا	۷ر	عقاب	۸ر	ہمارے رسول	۱۰ر
بندر اور نائی	۹ر	ایورسٹ کی داستان	۵ر	سرکار کا دربار	عہر
ہپو جیو	۸ر	تاریخ ہند کی کہانیاں ۱	۷ر	سرکار دو عالم	عہر
پان کھا کر طبلہ بجائے	۸ر	۲ " "	۸ر	رسول پاک	[illegible]
چل میرے مٹکے ٹمک ٹم	۸	ترکوں کی کہانیاں	۷ر	خلفائے اربعہ	عہر
پھر مٹکیوں کیا خاک ؟	۸ر	دنیا کے بچے	۱۰ر	دس جنتی	۱۰ر
پکڑو دم کے ٹکو	۸ر	دنیا کے بسنے والے	۱۰ر	نبیوں کے قصے	۱۰ر
تارا دھرمی تارا	۸ر	مقناطیس کی کہانی	۵ر	محاسن اسلام	[illegible]
بچوں کی کہانیاں	۵ر	بجلی کی کہانی	[illegible]	قومی نظمیں	۸ر
جگنو کی تتلی	۵ر	بجلی اور مقناطیس کی کہانی	۸ر	بچوں کا کھلونا	۱۲ر

محنت ڈراما ۷ر | شریر لڑکا (ڈراما) ۶ر

ہمارا مکمل پتہ :- **مکتبہ جامعہ دہلی**

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم-اے

جلد ۴۱ - نمبر ۲	بابتہ ماہ نومبر سنہ ۴۵ء	سالانہ چندہ صر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) دیال پریس، دہلی

اسلامی تہذیب

پروفیسر محمد مجیب صاحب "ہندوستان میں اسلامی تمدن کی تاریخ" کے نام سے
ایک کتاب تصنیف فرما رہے ہیں۔ صاحب موصوف نے ہماری درخواست پر اس کتاب کے
حسب ذیل حصے کو رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ مضمون کے ربط و
تسلسل کو بہتر طریقے پر سمجھنے کے لئے یہ بتلا دینا مفید ہوگا کہ اس سے پہلے صاحب موصوف
اپنی کتاب میں اسلامی عقائد شریعت اور تصوف کا ذکر تفصیل کے ساتھ فرما چکے ہیں کہ
ان تینوں کو ان مسلمانوں کی زندگی میں جو ہندوستان آئے اور یہاں آباد ہوئے
مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ "مدیر"

اسلامی تہذیب کی بہت سی دولت ان مسلمانوں کو نہیں ملی جو ہندوستان آئے اور یہاں آباد ہوئے کیونکہ وہ سیاسی اور ذہنی انقلابوں میں ضائع ہو چکی تھی۔ فلسفہ ان کے حصے میں اتنا ہی آیا جتنا کہ بارھویں صدی تک فقہ اور تصوف میں شامل ہو چکا تھا۔ اور اس وقت تک یہ خیال عام ہو چکا تھا کہ فلسفہ سے سروکار رکھنا عقائد کو کمزور کرنا اور زندگی کے نظام کو بگاڑنا ہے۔ علوم صحیحہ کے آخری چراغ حکیم بوعلی سینا اور حکیم البیرونی گیارھویں صدی میں گل ہو گئے۔ اور پھر ایسے چراغ جلے نہیں کہ ان علوم کی روشنی پھیلتی۔ علم طب کی مسلمانوں میں بڑی قدر تھی مگر اس کی ترقی دوسرے علوم خصوصاً کیمیا، عضویات اور نباتیات پر منحصر تھی اور ان علوم میں تحقیق کرنے والے نایاب ہو رہے تھے۔ دراصل یہیں جس دور سے بحث ہے وہ ذہنی اعتبار سے جمود اور معاشی نقطہ نظر سے انحطاط کا زمانہ تھا۔ خلیفہ متوکل کے وقت سے مرکزی حکومت پر ترک امرا کا تسلط ہو گیا اور اس کے بعد سے عراق، ایران اور خراسان

کی دولت قریب دو سو برس تک بیدردی سے لٹتی رہی۔ ادھر ایشیائے کوچک شام اور فلسطین پر گیارھویں صدی کے آخر سے صلیبیوں کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ ایسی حالت میں جبکہ جان اور مال کا اعتبار نہ ہو، تجارت اور صنعت اہل حکومت کی باندیاں ہو جاتی ہیں، اور ان میں ترقی کا مادہ نہیں رہتا۔ اسلامی تہذیب ہندوستان میں نمودار ہوئی تو اس کی نشوونما کی تکمیل ہو چکی تھی اس کے حامل موجودہ ذہنیت اداروں اور آداب کو قائم رکھنا اپنا منصب سمجھتے تھے۔ تحقیق اور تجربے کی طرف مائل نہ تھے، اور خارجی قدریں پیدا کرنے کی ان میں اتنی استعداد تھی جتنی کہ صدیوں کی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے بعد کسی جماعت میں باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ اسلامی تہذیب کی قدریں معیّن کی گئیں۔ اور زندگی کا ایک نقشہ بنا جو صحیح اور مکمل مانا جاتا تھا۔ اس نقشے کی تکمیل کرنے والوں میں امام غزالی بھی تھے۔ اور ہم ان کی کتاب احیاء العلوم کی بحثوں کو سامنے رکھ کر اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو واضح کریں گے۔

امام غزالی نے آدابِ زندگی سے متعلق بحث، کھانے کے آداب سے شروع کی ہے۔ کسی اگلے نیک بخت کا قول ہے کہ کھانا بھی دین ہی میں سے ہے اور پروردگار عالم نے بھی اس مضمون پر آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا"۔ اسی سلسلے میں وہ ایک کلیہ بیان کرتے ہیں جس سے ان کا نقطۂ نظر اور اسلامی تعلیمات کا منشا ظاہر ہوتا ہے "ہر ایک نو ایجاد بدعت کی ممانعت نہیں ہے بلکہ ممانعت اسی بدعت کی ہے جس کے مقابل کوئی سنت قائم ہو اور باوجود کسی امر شریعت کے موجود رہنے کے اس امر کو دور کر دے۔ بعض احوال میں جب اسباب بدل جاویں بدعت کا ایجاد کرنا واجب ہو جاتا ہے" اسلامی تہذیب میں دوسروں کو کھانا کھلانا بڑی مستحسن بات تھی، جس کی اخلاقی مصلحت یہ تھی کہ اس سے سخاوت اور ایثار کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ ان اوصاف کی عام قدر اتنی تھی کہ امام غزالی نے اعتدال پر زور دینا مناسب سمجھا اور اسے ایک تکلیف یعنی مبالغہ قرار دیا کہ

جو کچھ اپنے پاس ہو سب کا سب (مہمان کے) سامنے لاکر رکھ دے اور اپنے عیال کے واسطے کچھ نہ رکھ چھوڑے اور ان کے دلوں کو آزار دے۔"

کھانے کی طرح نکاح کا مسئلہ بھی ان مادی ضروریات میں شمار ہوتا تھا جن کی دین میں بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ ان میں غلط رویہ اختیار کیا جائے تو اس سے دین میں خلل پڑ سکتا ہے۔ امام غزالی نے اس کے بارے میں بہت سی مختلف رائیں بیان کی ہیں کہ دیندار مسلمان کے لئے نکاح کرنا افضل ہے یا مجرد رہنا اور شیخ ابو سلیمان دارانی کا قول نقل کیا ہے کہ "عورتوں سے صبر کرنا اس سے بہتر ہے کہ ان کی عادات سے صبر کیا جائے" نکاح کے فوائد بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ اس سے نفس پر مجاہدہ اور ریاضت ہوتی ہے یعنی گھر رعایا اور ولایت اور گھر والیوں کے حقوق کو ادا کرنا اور ان کی عادتوں پر صبر کرنا اور ان سے تکلیف اٹھانی اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنی اور ان کو طریق دین بتانا اور ان کی خاطر کسب حلال میں جاں فشانی کرنی اور بعد کو اولاد کی تربیت کرنی یہ سب امور بڑے مرتبے کے ہیں۔" "امر مباح سے لذت حاصل کرنا دین کے لئے ایک قلعہ ہے۔" اور کہتے ہیں کہ عورت جس وقت خوب صورت خوش خلق، سیاہ چشم و سیاہ مو، بڑی آنکھ کی، رنگ میں گوری، شوہر دوست کہ اپنی نظر شوہر ہی پر منحصر کردے، کسی کو میسر ہو، تو گویا اس کو حور مل گئی۔" ہمارے لئے اس بحث میں خاص طور پر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ اس میں صرف مردوں کی مصلحتیں پیش نظر رکھی گئیں ہیں گویا شروع کے احکامات کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا انھی کا حصہ ہے۔ عورتوں کی تعلیم کا جو حال ہوگا اس کا اندازہ ہم احیاء کے مندرجہ بالا اقتباس سے کرسکتے ہیں جس سے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو اس قابل بنانا کہ وہ بھلے آدمی کے ساتھ رہ سکے اس کے شوہر کا فرض تھا۔ عورتوں کے لئے گھومنے پھرنے کی جتنی آزادی علماء کے نزدیک مناسب تھی وہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ "اس زمانے میں بھی پارسا عورت کو باجازت اپنے شوہر نکلنا مباح ہے مگر نہ نکلنے میں احتیاط زیادہ ہے۔ اور عورت

تو چاہیئے کہ بدوں کسی امر ضروری کے نہ نکلے کیونکہ تماشوں اور غیر ضروری کاموں کے لئے نکلنا شرافت کا مخل ہے، اور بعض اوقات فساد بھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اگر نکلے تو چاہیئے کہ مردوں اور عورتوں سے اپنی نگاہیں نیچی رکھے۔" سلاطین اور امرا کی جو اخلاقی حالت تھی اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس احتیاط کی امام غزالی نے تاکید کی ہے وہ بے محل تھی۔ دوسری طرف یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو تہذیب امام غزالی کی نظر میں تھی وہ خالص مردانی تہذیب تھی اور سوائے غیر معمولی صورتوں کے اس میں عورتوں کا خاص حصّہ نہ تھا۔

نکاح کے بعد امام غزالی نے کسب اور معاش پر بحث کی ہے۔ اسلامی تہذیب میں یہ بہت برا سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنی پرورش کا بار جماعت پر ڈال دے۔" حضرت ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک عبادت اس کا نام نہیں کہ اپنے پاؤں جوڑ رکھو اور دوسرا شخص تم کو روٹی کھلاوے۔ اول دو روٹیوں کی فکر کر لو، تب عبادت کرو۔ اور حضرت معاذ بن جبل کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جن سے تمام روئے زمین میں خدائے تعالےٰ بغض رکھتا تھا۔ اس وقت مسجدوں کے سوال کرنے والے بھی اُٹھیں گے۔ غرض کہ سوال کی مذمت اور دوسرے شخص کی خدمت پر بھروسا کرنے کی برائی شرع کے نزدیک وہ تھی جو بیان ہوئی، اور جس شخص کے پاس مال موروثی نہ ہو اس کو بجز کمانے اور تجارت کرنے کے چارہ نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ انسان دولت کمانے کی فکر میں پڑ جائے اور دین اور جماعت کے حق کو بھول جائے۔" تاجر کو اپنے دین کا خیال رکھنا سات باتوں کی رعایت سے پورا ہوتا ہے۔ اول ابتدائے تجارت میں نیت اور عقیدے کو درست رکھنا کہ تجارت سے یہ نیت کرے کہ سوال کی ضرورت نہ پڑے، اور لوگوں کا دست نگر نہ ہو بلکہ حلال کی کمائی سے اُن سے غنی ہو جائے اور اپنے مال سے اپنے دین پر مدد لیوے اور اہل و عیال کے حقوق ادا کرے۔ تاکہ مال سے جہاد کرنے والوں کے زمرے میں داخل ہو اور چاہیئے کہ سب مسلمانوں

کی خیر خواہی کی نیت کرے اور دوسروں کے لئے وہی بات پسند کرے جو اپنے لئے چاہتا ہو۔ اور یہ نیت کرے کہ اپنے معاملے میں عدل اور احسان کے طریق کی پیروی کروں گا۔
...... اور یہ نیت کرے کہ بازار میں جو چیز دیکھوں گا اس میں اچھی بات میں حکم کہنے اور بری بات میں منع کرنے سے دریغ نہ کروں گا.......... دوئم یہ کہ اپنی صنعت یا تجارت میں رہنے سے یہ قصد کرے کہ ایک فرض کفایہ ادا کرتا ہوں، کیونکہ اگر صنعتیں یا تجارتیں بالکل چھوڑ دی جادیں تو معاش کے کارخانے جاتے رہیں اور اکثر لوگ تباہ ہو جاویں کہ سب کا انتظام سب کی معاونت سے ہو رہا ہے اور اس سے ایک فریق ایک ایک کام کا ذمے دار ہے اگر سب کے سب ایک ہی صنعت کرنے لگیں تو اور صنعتیں چھوٹ جائیں اور سب کے سب ہلاک ہو جائیں.......... پھر صنعتوں میں سے بعض تو نہایت کار آمد ہیں اور بعض ضروری نہیں کہ انجام کو آرام طلبی زینت دنیاوی اُن سے ہوتی ہے تو آدمی کو چاہیئے کہ ایسی صنعت اختیار کرے جس سے مسلمان کو فائدہ ہو اور دین میں ضروری ہو اور جو پیشے کہ ظاہری زینت کے ہیں اُن سے احتراز کرے" مشرقی ملکوں کے حالات نے افراد اور جماعت کے درمیان (مغربی ملکوں کے مقابلے میں) بہت زیادہ قریبی اتحاد کا رشتہ قائم کر دیا۔ جو اصول رائج ہے (اور تھا) وہ مقابلے کا نہیں ہے۔ امداد باہمی کا ہے ان باتوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے تجارتی اخلاق کا یہ بنیادی اصول سمجھ میں آجاتا ہے کہ تاجر کو گاہک کے ساتھ بھائی کا سا سلوک کرنا چاہیئے "فائدہ کے بغیر تجارت ممکن نہیں اور جو شخص دنیا کے معاملوں میں صرف اصل قیمت پر اکتفا کرے اور نفع کا طالب نہ ہو وہ عاقل نہیں شمار ہوتا" ۔ لیکن "چونکہ فائدہ اصل پر فرید ہوتا ہے تو چاہیئے کہ ایسی ہی چیزوں میں طلب کیا جائے جو مخلوق کی اصل ضرورتوں میں داخل نہ ہوں اور خلق کو اُن کی حاجت نہ ہو"

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام غزالی معاشی زندگی کی پوری وسعت اور اس کے امکانات نظر میں رکھتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت ہی نتیجہ خیز بات لکھی ہے کہ" یہ جو حدیث وارد ہے

کہ طلب العلم فریضۃ علیٰ کلّ مسلم اس سے یہی غرض ہے کہ جس علم کی حاجت ہو اس کا سیکھنا فرض ہے اور پیشہ ور کو پیشے کے علم کی حاجت ہوتی ہے اس لئے اس کو سیکھنا اس علم کا ودیعت ہے" مگر انھوں نے کئی پیشوں کو مکروہ یا قابلِ احتراز قرار دیا ہے اور معلوم ہوتا ہے اُن کی رائے یہ تھی کہ صرف دس پیشے ایسے ہیں جنھیں دیندار مسلمان بغیر کسی تامل کے اختیار کر سکتا ہے موزہ دوزی تجارت (سوائے غلّہ اور جانداروں کی تجارت کے) پلّہ داری کپڑا سینا، کپڑا دھونا، جوتا بنانا، آہن گری، سوت کاتنا، خشکی اور تری کا شکار کرنا اور کتابت، ایسے پیشے جیسے کہ نقش و نگار کرنا سادہ کاری، زرگری، چونے کی استرکاری، لہو کی چیزیں اور ایسے آلات بنانا جن کا استعمال حرام ہے۔ مردوں کے لئے ریشمی کپڑے اور زیورات بنانا سب ان کے نزدیک قابلِ احتراز ہیں۔ اس طرح کتابت کے سوا تمام پیشے جن کا فنونِ لطیفہ سے تعلق ہے مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں رہتے اور وہ تمام صنعتیں جنھیں ترقی دے کر انھوں نے اپنی تہذیب کو مزین کیا مکروہ یا حرام ثابت ہوتی ہیں۔ علماء کی مخالفت نے ان صنعتوں کو بند نہیں کر دیا مگر ان کے برتنے والے نظروں میں گر گئے، اور اس طرح مساوات کی جو تعلیم اسلام میں دی گئی ہے اس کی صریح خلاف ورزی ہوئی۔ البتہ ایک کاروبار ایسا تھا جس کی سب بڑی عزت کرتے تھے۔ اور یہ کاروبار مسلمانوں ہی کی بدولت تمام دنیا میں پھیلا۔ یہ تھا کاغذ سازی، کتابت اور کتب فروشی کا کام۔ اس میں بھی کتابوں کو مطلّا اور مذہب کرنا اور اس کی نفیس جلدیں بنانا ایک بدعت تھی جو علماء کو پسند نہ ہوگی، کتابوں میں جو تصویریں بنائی جاتی تھیں اُن کے خلافِ شرع ہونے میں کلام ہی نہ تھا۔

احیاء العلوم کے چوتھے باب میں امام غزالی نے حرام اور حلال چیزوں کی تفصیل دی ہے۔ جو لوگ شرح کی پوری پابندی کرتے وہ اس معاملے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امام حنبل کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ آپ بغداد میں رہتے تھے مگر چونکہ آپ کی رائے میں اس زمین کو حضرت عمر نے نمازیوں پر وقف کیا تھا، آپ آٹا موصل سے منگواتے تھے، ایک

رتبہ آپ کے ملازم نے آپ کے لڑکے صالح کے یہاں سے خمیر لے کر آٹے میں ملا دیا۔ صالح ایک سال تک اصفہان کے قاضی رہ چکے تھے اور امام حنبل کو یقین نہ تھا کہ ان کے گھر کا کونسا مال حرام ہے کون سا حلال، جب آپ کو معلوم ہوا کہ آٹے میں صالح کے یہاں سے خمیر ملا لیا ہے تو آپ نے روٹی نہیں کھائی اور ملازم سے فرمایا کہ اسے باہر رکھ دو اگر کوئی فقیر مانگے تو اسے دے دینا مگر اُسے یہ بتا دینا کہ امام حنبل کے گھر کا ہے خمیر صالح کے گھر کا۔ کئی دن تک کسی فقیر نے بھی روٹی نہیں لی تو ملازم نے اُسے لے جا کر دجلہ میں پھینک دیا۔ امام حنبل کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے دجلہ کی مچھلیاں کھانا چھوڑ دیا۔ دوسری طرف ایسے فقیہہ قاضی اور قاری تھے جو مقامی شرابوں کا پینا جائز سمجھتے تھے اور انھیں پیتے تھے عام مسلمانوں کا رویہ معقول اور شاید صحیح بھی تھا، وہ بغداد کے آٹے کو حلال اور شراب کو حرام سمجھتے رہتے۔ ایک دوسرے کے عمل کو جانچتے وقت وہ امام شافعی کے اس کلیہ کو معیار مانتے ہوں گے کہ "مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو خدائے تعالےٰ کی طاعت ہی کرے اور معصیت نہ کرے اور نہ ایسا کرے کہ معصیت ہی کرے اور طاعت نہ کرے، تو جس شخص کی طاعت معصیت پر غالب ہو وہی عدل ہے"۔

اسلامی اخوت کس طرح جماعت کی شیرازہ بندی کر سکتی ہے اس کا اندازہ اس بحث سے ہوتا ہے کہ جو امام غزالی نے دوستی اور صحبت کے آداب پر کی ہے۔ "ایمان کی رسیوں میں زیادہ مضبوط محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔ اسی حدیث کے باعث واجب ہے کہ آدمی کے کچھ دشمن ہوں اور کچھ دوست ہوں جن سے محبت فی اللہ رکھتا ہو"۔ محبت کے ساتھ بغض کو لازمی قرار دینا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی قدر عصبیت کے بغیر جماعت میں قوت پیدا نہیں ہوتی۔ اب سوال یہ ہے کہ بغض کس سے کیا جاتا تھا۔ کیونکہ مسلمان ایک دوسرے سے اصولاً عداوت نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مامون رشید کے زمانے میں معتزلہ فرقے کے عالموں نے مخالف عقائد رکھنے والے علما

پر سختیاں کیں اور متوکل کے ہاتھوں انھوں نے اپنی زیادتیوں کی سزا بھگتی۔ اسی وقت سے لوگ ان علمار سے بدظن ہو گئے جو رائج عقیدوں کے خلاف فلسفیانہ نظریے پیش کرتے۔ لیکن عقائد کا ایسا اختلاف جو فلسفیانہ نظریوں اور موشگافیوں پر مبنی ہوتا عوام میں بغض پیدا کرنے اور ان کو برانگیختہ کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ غیر مسلم مذہبی فرقوں میں مانوی اور مزدکی یا زندیق ایسے تھے جن سے مسلمانوں کو عداوت تھی، کیونکہ اس فرقے کے بعض عقائد اسلامی تعلیمات سے مشابہ تھے اور کچھ واقعات ایسے پیش آئے جنھوں نے یہ اندیشہ مسلمانوں کے دل نشین کر دیا کہ زندیق دھوکے سے اقتدار حاصل کرکے اسلام اور مسلمانوں کو برباد کرنا چاہتے ہیں لیکن ممکن ہے زندیق بھی اپنے حال پر چھوڑ دئے جاتے اگر وہ سیاست سے الگ رہتے۔ ان کے خلاف جو کارروائیاں کی گئیں ان کا اصل مقصد سیاسی تھا اور مذہب سے بھی سیاسی اغراض کو پورا کرنے کا کام لیا گیا۔

قرامطی جو باطنی اور اسمٰعیلی بھی کہلاتے تھے قوت اولاد، تعداد میں زندیقیوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ قرامطیوں کے رہنماؤں میں سے بعض ایسے تھے جو عقائد اور نظام معاشرت میں اصلاح چاہتے تھے۔ بعض اس بہانے سے حکومت حاصل کرنا چاہتے تھے اس تحریک کی ابتدار نویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ اس کا کچھ تعلق جنوبی عراق کے افریقی غلاموں کی بغاوت سے تھا جو ۸۶۳ء میں شروع ہوئی اور پندرہ برس تک جاری رہی۔ قرامطیوں کی تعلیمات اور ان کا مجوزہ معاشرتی نظام ان لوگوں کے لئے خاص کشش رکھتا تھا جن پر عباسی خلیفہ اور اس کے امرار اور عہدہ داروں کے اخراجات کا سارا بار پڑتا تھا اور قرامطیوں کی تبلیغ سب سے زیادہ کسانوں اور صنعت پیشہ لوگوں میں مقبول ہوئی۔ مصر میں فاطمی خلافت کا قیام (۲۹۷ھ) قرامطیوں یا اسمٰعیلیوں) کی سب سے بڑی سیاسی کامیابی تھی۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ اور انھوں نے شام، عراق، ایران اور خراسان میں اپنے مرکز قائم کرکے مسلمانوں کے خلاف ایک

مدت تک بڑی خوں ریز جنگ جاری رکھی۔ ان کی عداوت بے پناہ تھی۔ عباسی خلافت کے زوال کے بعد انھوں نے ممتاز مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا اور اس طرح مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں کی جا سکتی تھی۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عام مسلمانوں کے نزدیک قرامطی جاسوسوں اور داعیوں (یعنی مبلغوں) اور عالموں کا سراغ لگانا اور انھیں قتل کرانا یا کرنا بڑے ثواب کا کام ہو گیا۔ ان کی نسبت کوئی اچھی بات کہنا ملت اسلامی کے ساتھ غداری تھی اور اسی وجہ سے ان کے عیب ہی بیان ہوتے رہے۔ اب تحقیق کرنے سے پتہ چلا ہے کہ قرامطیوں کے عقائد اور تصورات کا[1] مسلمانوں کے فلسفے تصوف اور عقائد پر خاصا اثر پڑا اور صنعت پیشہ لوگوں کی جو تنظیم دسویں صدی عیسوی میں کی گئی، اس کی پشت پر بھی قرامطیوں کی نیم مذہبی، نیم اشتراکی تعلیمات تھیں۔ امام غزالی نے ان عداوتوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے جنھوں نے مسلمانوں کی جماعت میں صدیوں تک فساد برپا

لہ پیشہ وروں کی برادریوں کا سب سے زیادہ فروغ مصر میں فاطمی خلافت کے زیر سایہ دسویں اور گیارھویں صدی میں ہوا۔ باقی اسلامی ملکوں میں بھی دسویں سے بارھویں صدی تک ترقی پر رہیں۔ مختلف برادریوں کے جو قاعدے اور رسمیں تھیں انھیں "دستور" کہتے تھے۔ اور برادری میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ دستور کی پابندی کا عہد نہ کرے۔ داخلے کی رسم جسے "شد" کہتے تھے ادا نہ کی جاتی۔ برادری کا سردار "نقیب" کہلاتا تھا۔ اس کے ماتحت "معلم" یا "استاد" ہوتے تھے اور اس کے نیچے "خلیفہ" یا صنعت کو اچھی طرح جاننے والے کاریگر، "متعلم" یا "شاگرد" اور "صانع" یا فن سے ناواقف مزدور ہوتے۔ ہر برادری کے ارکین اس کا عہد کرتے تھے کہ اپنے فن کا راز کسی غیر کو نہ بتائیں گے اور معقول اجرت پر اچھا کام کریں گے۔ بارھویں صدی کے بعد برادریوں کا نظام بہت کمزور پڑ گیا۔ اس وجہ سے کہ بادشاہ اسے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے، اور علماء کی نظروں میں وہ قرامطی بدعتوں کا نمونہ تھا لیکن عثمانی سلطنت ایران، ترکستان اور پنجاب میں اس کے آثار انیسویں صدی تک موجود تھے بعض ملکوں میں یہ برادریاں پہلی جنگ عظیم کے بعد تک رہیں اور روس میں انقلاب ہوا تو یہ کومیونسٹ انٹرنیشنل سے ملحق ہو گئیں

رکھا. بعض فی اللہ کی تلقین سے معمولی سمجھ کے مسلمان یہ نتیجہ نکالتے ہوں گے کہ جماعت کے جو دشمن ہوں ان سے نفرت کی جائے اور جماعت کو ان کے فتنوں سے بچایا جائے۔ مشرک اور کافر سے بھی نفرت کی جاتی تھی مگر ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ دنیا میں وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان کے خلاف جنگ کی جائے چاہے مسلمانوں کو ان سے کوئی خاص خطرہ یا نقصان نہ ہو البتہ یہ ممکن تھا کہ بادشاہ اپنے منصوبوں کی خاطر اس اصول عداوت کو بھڑکائیں اور اسے اپنی سیاست کا آلۂ کار بنائیں۔ بادشاہ اپنی غرض سے شریعت کے محافظ بھی بن جاتے تھے لیکن ایسے بادشاہ بہت ہی کم ہوئے ہیں جن کا طرز عمل دیانت دار علماء کو بھی شریعت کے مطابق معلوم ہوا ہو، امام غزالی نے حاکموں کے خلاف ایک دوسرے کی حمایت کرنا افراد کے فرائض میں شامل کیا ہے" انیسواں حق یہ ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کی عزت اور جان اور مال کو ظالم سے بچاوے۔ بشرطیکہ بچانے پر قادر ہو اور ظالم کو اس پر سے دفع کرے اور اس کی طرف ہو کر ظالم سے لڑے اور مظلوم کی ہر طرح سے مدد کرے۔ کہ اخوت اسلامی کے مقتضا سے یہ امر آدمی پر واجب ہے۔"

اچھی بات کا حکم کرنا، اور بری بات سے منع کرنا دین کا بڑا مدار ہے کہ اس طرح جماعت اپنے آپ اصلاح کر سکتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ "امر بالمعروف" یعنی صحیح بات کرنے کا حکم دینے اور "نہی عن المنکر" یعنی بری بات کو منع کرنے کا اصول بادشاہوں اور ان لوگوں کے ساتھ جنھیں شاہی سرپرستی حاصل تھی برتا نہیں جا سکتا تھا۔ امام غزالی نے ایسے لوگوں کی بہت سی مثالیں دی ہیں جنھوں نے خلیفہ کی اجازت کے بغیر اپنے آپ کو عام اخلاق کا نگراں سمجھ لیا اور شریعت کی خلاف ورزی کرنے والوں کی تنبیہہ کرنے لگے ایسے لوگ تعداد میں اور بھی زیادہ ہوں گے جو نرمی اور خاموشی سے تلقین کرتے تھے لیکن جو شخص صحیح صحیح بتانا چاہے کہ کیا منع ہے اور کیا منع نہیں ہے وہ زندگی کی تفصیلات میں اُلجھ جاتا ہے کہ اکثر ٹھیک فیصلہ نہیں کر سکتا اور جو تفصیلات کو نظرانداز کرے وہ

رہنمائی نہیں کرسکتا، اس لئے کہ پوچھنے والے تفصیلات کے بارے ہی میں سوال کرتے ہیں۔امام حنبل نے اصولاً صحیح رویہ اختیار کیا۔ جس کے پاس ایک سرمہ دانی چاندی کی ہو اس کے پاس بھی نہ بیٹھنا چاہیئے۔ لیکن جس زمانے میں مسلمانوں کے پاس دولت تھی، اور صنعتیں فروغ پر تھیں ایسی احتیاط وہی کرسکتا تھا جو دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتا اور پھر علمار بہت سی باتوں پر متفق نہ تھے۔

صوفیوں میں گانا سننے (سماع) کا رواج ہوگیا۔ اور گانا سنتے سنتے انھیں حال آتا تھا جس میں وہ مضطرب ہوجاتے اور ہاتھ پاؤں ٹپکنے اور ناچنے لگتے تھے۔ بیشتر علمار کی رائے میں سماع شریع کے خلاف تھا۔ امام غزالی صوفیوں سے اتفاق کرتے تھے۔ جیسے لوہے اور پتھر میں آگ مخفی رہتی ہے اسی طرح دلوں اور باطن کے جواہر اور اسرار ان میں پوشیدہ ہیں اور ان کے اظہار کی تدبیر راگ سے بہتر کوئی نہیں۔ "اول راگ ہوتا ہے اور اس سے دل پر ایک حالت ہوتی ہے جس کو وجد کہتے ہیں اور وجد کے سبب سے اعضار کو حرکت ہوتی ہے اور اگر وہ غیر موزوں ہوتی ہے تو اس کو اضطراب کہتے ہیں، اور اگر موزوں ہوتی ہے تو تال اور ناچ نام ہوتا ہے"۔ "راگ کی تاثیر دلوں میں محسوس ہوتی ہے اور جس شخص کو راگ سے حرکت نہ ہو وہ ناقص اور اعتدال سے ہٹا ہوا اور روحانیت سے دور اور اونٹوں اور پرندوں بلکہ تمام بہائم سے طبیعت میں کثیف ہے اس لئے کہ موزوں سے سب کو اثر ہوتا ہے راگ .... پر مطلق اباحت یا مطلق حرمت کا حکم کرنا درست نہیں ہے بلکہ یہ امر احوال اور اشخاص کے اعتبار سے اور طریق نغمات اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے" راگ صوفیوں کے شوق کو ابھارتا ہے اور عشق و محبت کو پختہ کرتا ہے اور دل پر کام چقماق کا کرتا ہے اور ان میں سے ان مکاشفات اور لطائف کو ظاہر کرتا ہے کہ خارج از حیطہ وصف ہیں جو ان کو چکھتا ہے وہی ان کو پہچانتا ہے اور جس کا حس ان کو چکھنے سے کند ہوتا ہے وہ فن کو کیا جانے اور ان حالات کا نام ارباب تصوف کے یہاں وجد ہے جو وجود سے ماخذ ہے یعنی اپنے نفس میں وہ احوال موجود پائے جو راگ سے پیشتر نہیں معلوم ہوتے تھے سننے والے کی نیت محض موسیقی سے لطف اٹھانا ہو یا گانے والی عورت ہو جس کی طرف دیکھنا محال

نہ ہو اور اس کے راگ سننے سے فتنے کا خوف ہو تو گانا سننا جائز نہیں۔ علما نے اس کلیہ سے کہ اسلام دین فطرت ہے یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ انسان کو جمالیات اور فنون لطیفہ کا ذوق قدرت کی طرف سے ملا ہے اور جمال کی طلب انسان کا حق ہے وہ عورتوں کو بننے سنورنے اور زیور پہننے کی اجازت تو دیتے تھے مگر چاہتے تھے کہ اس میں بھی ان کی رائے مانی جائے کہ کون سے زیور کس طرح پہنے جائیں۔ سونے اور حریر سے عورتوں کو زینت کرنی بدوں اسراف کے درست ہے اور ہمارے نزدیک لڑکیوں کے کان چھیدنے بالیاں پہنانے کے لئے جائز نہیں اس لئے کہ اس میں زخم ایذا رسانی کرنا پڑتا ہے اور ایسے زخم سے قصاص لازم آتا ہے تو بدوں حاجت ضروری کے جائز نہ ہوگا" اور بالیوں کی زینت کچھ بہت ضروری نہیں بلکہ اگر بندے باندھ کر کان میں اوپر سے لٹکا دیئے جائیں کان کی زینت کو کافی ہیں۔ اور دوسرے زیور مثل جگنی یا حمیل یا کنگن کیا تھوڑے ہیں جو بالیوں کی حاجت ہو تو بالیوں کے لئے کان چھیدنا اگرچہ عادت ہو رہی ہے مگر حرام ہے اور اس سے منع کرنا واجب ہے اور کان چھیدنے پر اجرت لینی .... حرام ہے۔"

زندگی کا اصولی نقشہ صحیح اور مکمل ہو سکتا ہے مگر یہ لازمی نہیں کہ وہ حالات کے مطابق ہو۔ شرعی عالم قومی "عادت" کے وجود کو تسلیم کرتے تھے اور اگر اس سے اسلام کے بنیادی احکامات کی خلاف ورزی نہ ہوتی تو قومی عادتوں پر قائم رہنے کی اجازت دیتے تھے۔ گویا مذہب ایک تھا، شریعت ایک تھی، عادتیں مختلف ہو سکتی تھیں۔ عادتیں قومی طبیعت اور اس کی تاریخ کا عکس ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان دونوں کو تسلیم کرنا بھی ضروری ہو لیکن طبیعت اگر مردہ نہ ہو جائے تو وہ اپنے اظہار کے لئے نئی راہیں نکالتی رہتی ہیں اور اس وجہ سے اس کا اصول اور قانون سے برابر تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اسلامی شریعت اور مسلمانوں کی تہذیب کبھی مرادف الفاظ نہ تھے اس لئے اب ضرورت ہو

کہ ہم احیاء العلوم جیسی بصیرت افروز کتاب کا سہارا چھوڑ کر بعض تحریکوں پر ایک نظر ڈالیں جن کا اسلامی تہذیب پر خاصا گہرا اثر پڑا ۔

عرب اسلام کا گہوارہ تھا، مگر صرف گہوارہ۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ اسلام اپنے گہوارے سے نکلے اور مسلمان اسی ماحول میں زندگی بسر کرتے رہیں جس میں ان کا دین پیدا ہوا تھا کیونکہ روم اور عجم کو تہذیب میں خرابی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، بنو امیہ کی حکومت ان میلانات پر غالب آئی اور اس کے ساتھ عربوں نے ریگستانی معاشرت کا جامہ اتار کر تہذیب کے منجدھار میں غوطہ کیا۔ بنو امیہ اور ان کے حامیوں کا قومی اور نسلی تعصب اُسے گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اسلام کی تبلیغ کی جائے اور ان ملکوں کی آبادی جن پر وہ حکومت کرتے تھے، اسلام قبول کرکے حکومت اور حیثیت میں برابری کا دعویٰ کرے۔ لیکن اسلام کی اشاعت بند نہیں کی جا سکتی تھی، خصوصاً جب محکوم خود مسلمان ہو جانے پر مصر تھے۔ عام طور پر یہ ہوتا کہ جو غریب غیر عرب مسلمان ہونا چاہتے تو وہ کسی عرب سردار اور اس کے قبیلے سے متعلق کر دئے جاتے جو ان کی نگرانی اور سرپرستی کرتا تھا، اس تعلق کی بنا پر یہ نو مسلم موالی کہلاتے تھے۔ ہم محض نام سے عرب اور موالی کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شام اور عراق اور ان کی مسلمان آبادی سب ایک قسم کی تھی۔ لیکن عرب موالیوں سے خاصا تعصب کرتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ عرب اور موالی کا فرق مٹ جائے.......... ان کے لئے یہ ایک مسئلہ تھا کہ عرب اور موالی کے درمیان شادی بیاہ ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ اور وہ ایک ہی مسجد میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں لیکن اسلام کی تعلیم پر عربوں کے تعصبات غالب نہیں آ سکتے تھے اور موالی جن قوموں کے لوگ تھے ۔ انھی کی تہذیب اختیار کرکے عرب اپنی فضیلت کو کیسے تسلیم کرا سکتے تھے ۔ ایک روایت ہے کہ خلیفہ عبدالملک کی علامہ الزہری سے ملاقات ہوئی خلیفہ نے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ علامہ الزہری نے جواب دیا کہ مکہ سے ۔ خلیفہ

نے پوچھا کہ وہاں لوگوں میں کون سب سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ الزہری نے جواب دیا کہ عطا ابن رباح۔ وہ عرب ہے یا مولا) مولا۔ تو اس نے ملکیوں میں اتنا اثر کیوں کر پیدا کرلیا اپنے تقوے اور علم و حدیث کی بنا پر اس کے بعد عبدالملک نے یمن، مصر، شام، عراق خراسان بصرہ کوفہ وغیرہ کے متعلق پوچھا اور معلوم ہوا کہ ہر جگہ کسی مولا کو علمی اور دینی قیادت حاصل ہے۔ اس پر خلیفہ کو تعجب ہوا اور اس نے کہا کہ اگر یہی حالت رہی تو موالی عربوں پر غالب آجائیں گے اور ان کو محکوم بنالیں گے۔ علامہ الزہری نے کہا کہ "اے امیرالمومنین صورت یہی ہے یہ خدا کے حکم اور اس کے دین کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ جو اس کی طرف توجہ کرتا ہے اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ جو اس سے غفلت کرتا ہے، وہ مغلوب ہو جاتا ہے۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی) میں ایک تحریک فروغ پر تھی جو شعوبیہ کہلاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ تسلیم کرنا تھا کہ اسلامی تعلیم کی بنا پر عرب اور عجم میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی، آدمی سب آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں۔ دراصل یہ عربوں کے قومی تعصب کے خلاف ایک تحریک تھی اور اس کے دعوے اسلامی تعلیمات کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ لیکن سیاسی اختلافات اور نسلی تعصبات نے اس کو انتہا پسندی کی طرف مائل کر دیا اور یہ ایک ایسے قومی جذبات کا مظہر بن گئی جو عرب اور اسلام کے تاریخی تعلق کو نظر انداز کرنا ہی نہیں بلکہ قومی عظمت کی یادگاروں میں اسلامی تاریخ کے کارناموں کو محو کر دینا چاہتے تھے۔ ایران، شام اور مصر میں قومیت نے ایک شکل اختیار کی جو ملت کے سیاسی اور تہذیبی اتحاد کو بہت کمزور کر سکتی تھی اور اسی قومیت اور عرب دشمنی نے مذہبی فرقوں کو انتہا پسند بنا دیا۔ عام تہذیب پر اس کا اثر یہ ہوا کہ ایسی تاریخی شخصیتیں جن کا عرب سے تعلق تھا پس پشت ڈالی جانے لگیں۔ اور خسرو اور قیصر، نوشیرواں اور سکندر اعظم کی مثالیں ذہنی اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ بن گئیں۔ عباسی خلفاء کے عہد میں ایرانی لباس اور ایرانی آداب اختیار کیے گئے اور ایران کی بنی ہوئی چیزوں کو دوسری جگہ کی مصنوعات

پر ترجیح دی جانے لگی ۔ خلیفہ مامون رشید کے زمانے میں ایک خاص قسم کے عقیدہ کے علماء پر سختیاں کی گئیں تو دوسری طرف ایسی رواداری برتی گئی جس نے نئی داخلی قدروں اور نئے تصورات کو اسلامی تہذیب پر اثر ڈالنے کا موقع دیا ۔ ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تہذیب کا اپنا الگ معیار قائم ہوگیا جو عربی یا عجمی نہیں تھا، بلکہ بین اقوامی اور اس میں وہ تمام نسلی اور قومی اختلافات محو ہوگئے ۔ جنھیں مٹانا اسلام کا ایک بنیادی منصوبہ تھا،

ہر تہذیب پر سیاسی حالات حکومت کے طریقے اور سیاسی اقتدار کے حامل بہت اثر ڈالتے ہیں ہم اسلامی دور کی تہذیب کے ایک دور میں حکومت مرکزی تھی اس کے بعد اسلامی دنیا چھوٹے بڑے سیاسی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ، کبھی کبھی یہ ٹکڑے اتنے چھوٹے ہو جاتے کہ ان کا قائم رکھنا خود ان کے لئے محال اور ملت اسلامی کے لئے مضر ہوتا ۔ مگر عباسی خلافت کے زوال کے بعد مرکزیت کو دوبارہ قائم کرنے کی کوشش بڑے پیمانے پر نہیں کی گئی ۔ جماعت کو اپنی مذہبی اور تہذیبی حدت کا یقین تھا مگر اپنی سیاسی قوت اور حق کا احساس نہ تھا یعنی اسلامی تہذیب میں ان اوصاف کی کمی تھی جن کا مجموعی نام شہریت ہے ، اسی وجہ سے جماعت یہ جانتے ہوئے کہ سیاسی حکمت عملی پر عافیت اور خوش حالی کا مدار ہے، اپنے سیاسی حاکموں کو قابو میں نہ کرسکی ۔ بادشاہ علم اور ہنر کی سرپرستی کرتے تھے ، نہ کرتے تو بدنام ہوتے لیکن حکومت خدمت کا ذریعہ نہ تھی ۔ بادشاہ رعایا کی پوری حفاظت بھی نہیں کرسکتے تھے سفر میں قافلوں کے لٹ جانے کا خطرہ رہتا تھا ، شہروں میں بھی لوگ بے فکر نہیں رہ سکتے تھے ظالم بادشاہوں اور ان کے عاملوں جرائم پیشہ گروہوں اور ذاتی دشمنوں سے جان اور عزت کو محفوظ رکھنے کے گر، فن زندگی کے ابتدائی سبق تھے ، جان سلامت رکھنا دشوار ہو تو لوگ قدرتی طور پر قناعت کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔ مگر مسلمانوں میں ایسے لوگ افراط سے تھے جو جان پر کھیل کر دولت اور اقتدار حاصل کرتے ان کے اوصاف کی قدر کی جاتی اور ان کی سرگذشت عبرت اور اخلاقی تربیت کے لئے مواد فراہم کرتی ۔ دنیاوی حوصلہ مندی کے مقابلہ میں وہ مسلک تھا جسے درویشی کہہ سکتے ہیں ۔ درویش سے مراد یہاں صوفی ہی نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو مادی

قدروں پر اخلاقی اور روحانی قدروں کو ترجیح دیتا جس میں قوت فکر اور قوت عمل ہوتی
اور جو بغیر تکلف اور خوف کے اجتماعی زندگی کی آزمائشوں کو قبول کرتا۔ شیخ سقلی
نے ایک پیرزادے کے متعلق رائے دیتے ہوئے فرمایا " وہ تو پہاڑ میں ساکن ہو گئے ہیں
اور یہ کوئی جواں مردی نہیں۔ مرد ایسا ہونا چاہئے کہ بازار میں رہ کر حق تعالےٰ کے ساتھ ایسا
مشغول ہو کہ اس سے کبھی غافل نہ ہو " اس درویشی کو جو بازار کے غل غپاڑے اور سیاست
کے انقلابوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ایسے لوگوں نے بہت رسوا کیا جو خانقاہوں میں بیٹھ کر
گداگری کرتے تھے۔ پھر بھی خوددار درویش کا مرتبہ ایسا تھا جس کے سامنے امارت اور
حکومت نوبت چندروزہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک لمحہ بھر کا تماشہ جیسے کہ گھر کے چراغ کے
مقابلے میں بجلی کی چمک۔ درویش سے بہت ملتا جلتا تہذیب کا وہ نمونہ تھا جسے
"صاحب دل" کہتے تھے۔ یعنی ایسا شخص جس کی طبیعت میں دنیا کے حادثوں نے پختگی پیدا کردی
ہو مگر سختی نہ ہو جسے اپنی داخلی قوت پر اعتماد ہو جو ایک خاص طریقہ اختیار کرے اس یقین
کے ساتھ کہ وہ اس کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہے اور دوسروں کو گمراہ نہ سمجھے کہ وہ
بھی اپنی طبیعت کے مناسب عمل کرتے ہیں۔ جو دنیا کی نعمتوں کی قدر کرتا ہو اور ان کے بغیر
بھی خوش رہ سکے ایسا شخص قانون اور مصلحت دنیاوی حوصلے اور اخلاقی قدر "زہد"
اور "رندی" سب کے حالات اور مقام کو سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ "دل" کا مالک ہوتا
"قلب" یا "دل" تصوف کی اصطلاح ہے جس سے تہذیب کے نقطۂ نظر سے کامل شخصیت کے
تصور کو پیش کرنے میں بڑی مدد لی گئی۔ تصوف میں قلب روح اور جسم کا نقطۂ اتصال
تجلی کا مقام قوتِ مدرکہ اور تمام اور روحانی قوتوں کا مرکز تھا۔ تہذیب میں یہ شوق ذوق
درد حق شناسی حقیقت بینی غرض تمام لطیف جذبات کا حامل اور نفس انسانی کا جوہر
تھا۔ جس کے دل نہ ہوتا وہ تمام انسانی صفت سے محروم سمجھا جاتا۔ قلب کی طرح "عشق"
"سکر" (یعنی نشہ خمار) "صحو" یعنی ہوش) "جمع" (یعنی وصل) "معشوق" ایسے

سکتے تھے جو تصوف کے دار الضرب سے نکلے اور تہذیب کا سرمایہ بن گئے۔ اس کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ تصوف کی ان اصطلاحوں کے رواج سے پہلے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ عشق
کیا ہے یا نشہ کیا۔ صوفیوں نے پرانے الفاظ لے کر انھیں نئے تصورات کا حامل بنا دیا،
اور اس طرح عام انسانی جذبات اور لطیف روحانی اُمنگوں مذہب اور جمالیات میں
ایک ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر دی جو دنیا کی اور کسی تہذیب کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔
صوفی کا شاعر ہونا بھی ایک خصوصیت ہے جو صرف اسلامی تہذیب میں نظر آتا ہے
اس کی وجہ سے شاعری انفرادیت کے مبالغوں اور مغالطوں اور اس تخریبی میلان سے
بڑی حد تک بچی رہی جو شاعروں میں اکثر پایا جاتا ہے، اور اس پر کوئی ایسی پابندیاں عائد
نہیں ہوئیں جو جذبے کو اظہار سے یا تخیل کو پرواز سے روکتی ہیں۔ وہ آزادی جو شاعر
چاہتا ہے تصوف نے اس طرح دے دی کہ علمائے ظاہر یعنی موروثی مذہب کا منصب
مقرر کر دیا، اور قلبی واردات کو کمال بے پروائی کے ساتھ بیان کرنے کی رسم قائم کر کے
شاعر کے لئے ایک آڑ بن گیا شاعر اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا تھا جو کہ منصور نے کہا
تھا کہ "میں خدا ہوں" اور وہ اپنا الگ مذہب رکھنے کا دعوےٰ کرتا تو اس سے
زیادہ کیا کہتا جو شیخ فریدالدین عطار نے فرمایا ہے۔

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرۂ دردت دل عطار را

اسلامی تہذیب میں شاعری اور فن تعمیر کی پوری رونق نظر آتی ہے۔ مصوری کا چرچا بہت
کم تھا اور مورت سازی بالکل رائج ہی نہ ہوئی۔ مسلمانوں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان
فنون کو برتنا مذہب نے منع کیا ہے۔ یورپی مستشرق اسے نہیں مانتے۔ تصویریں بنانے
کی صریحی ممانعت قرآن میں نہیں ہے، اور وہ حدیث جس کے مطابق تصویر بنانے والے
سے قیامت کے روز کہا جائے گا کہ اس میں جان ڈالے مستند نہیں ہے۔ دراصل مسلمانوں
میں مصوری اور مورت سازی سے پرہیز کرنے کا خیال ایک بحث کی بدولت پیدا ہوا جو

آٹھویں صدی کے وسط میں بازنطینی قیصر کے ایک حکم کی بدولت عیسائیوں میں جاری ہوئی اس میں ایک فریق کا دعویٰ یہ تھا کہ تصویروں اور مورتوں کی پرستش کرنا بت پرستی ہے اور اس لئے جائز نہیں دوسرا فریق رائج طریقے کی حمایت کرتا تھا۔ اس بحث سے مسلمان علمار نے بھی اثر لیا تصویروں اور صلیبوں کا بنانا غلط تھا تو صرف عیسائیوں کے لئے نہ تھا۔ مسلمانوں کو بھی ایسی تصویریں اور مجسم شکلیں نہ بنانا چاہیے جن کی پرستش کی جا سکے غالباً علمار کی اس رائے پر عمل نہ کیا جاتا اگر مسلمانوں میں مصوری یا مورت سازی کا شوق عام ہوتا، تصویریں نہ بنانا ایک عادت تھی جو شریعت بن گئی۔ بنوامیہ کے جن محلوں کی دیواریں سلامت رہی ہیں۔ ان پر جانوروں کی آرائشی تصویریں بنی ہیں اور برتنوں اور قالینوں پر بھی جانوروں کی شکلیں اور شکار کے منظر بنائے جاتے تھے۔ ان کا شمار ان تصویروں میں نہ ہوتا جن کو بت کہا جا سکتا اگرچہ محتاط علمار جاندار چیزوں کی شکلیں بنانا غلط سمجھتے تھے۔ بنانے کا مقصد خواہ کچھ بھی ہو مسلمانوں نے مصوری اور مورت سازی کی طرف توجہ اس سے نہیں کی کہ ان کی طبیعت اور ان کا ماحول اس سے مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ ان میں وہ مذہب رائج ہی نہیں ہوا، جس میں آرٹسٹ کی شخصیت احترام کے لائق سمجھی جاتی ہے اس بنار پر کہ وہ ایک نئی چیز تخلیق کرتا ہے یا ماحول کے اثرات کو جذب کرکے اسے ایک نئی شکل میں پیدا یا پیش کرتا ہے۔ ان میں کسی ایک انسان کی شخصیت باقی تمام مخلوق کے مقابلے پر نہیں آتی بلکہ کل وجود کے ایک غیر شخص یا قانون کے ماتحت ہونے کا احساس بہت قوی اور دوسرے احساسات پر بالکل حاوی نظر آتا ہے اسی وجہ سے وہ ایسی شکلیں بنانے سے جھجکتے تھے، جن میں انفرادیت ہوتی یعنی وہ صفت جو کسی چیز کو اپنی قسم کی چیزوں اور باقی مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے یہاں حسن کا معیار مناسبت نہیں تھی بلکہ اقلیدسی تناسب اور اس کی بدولت انھوں نے آرائش کے فن میں کمال حاصل کیا۔ مسلمانوں کی حیاداری نے اس برہنگی کو بھی گوارا نہ کیا تو جو تہذیب کے قدیم دور

میں ہر جگہ حسن کی شان سمجھی جاتی تھی اور حسن پر کوئی پردہ ڈال دیا جائے تو گویا مصور کی آنکھ پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔

موجودہ زمانے میں علوم فکریہ اور علوم صحیحہ نے جو ترقی کی ہے اس کے لئے مسلمانوں نے صرف زمین تیار کی تھی، صنعت اور صنعتی نظام میں جو انقلاب ہوئے ہیں وہ مغربی قوموں کی اپنی جدوجہد کا نتیجہ ہیں لیکن اسلامی تہذیب میں ایک خصوصیت تھی جو اُسے مغربی تہذیب سے ممتاز کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں وحدت کے تصور نے علم اور عقیدے اصول اور عمل میں پورا ربط قائم رکھا۔ یہ ربط اس نظری تکمیل سے بالکل مختلف ہے جو قدیم ہندوستانی تہذیب کا نصب العین تھی کہ اس کا دار مدار سراسر عقل اور فکر پر تھا اور ہندوستان میں نظری تکمیل ذاتوں کی تقسیم کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ مغربی علوم میں اجتماعیات کے ذریعے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن علم اور عقیدہ ابھی تک ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ مسلمانوں میں علم عقیدے کے ماتحت نہ تھا اور اس سے الگ اور بے پروا بھی نہ تھا۔ مسلمان مفکر برابر یہ محسوس کرتے رہے کہ علم کا معیار الگ ہے اور دین کا الگ انھوں نے دونوں میں کوئی فرضی ہم آہنگی قائم نہیں کی نہ عقل کو اس پر مجبور کیا کہ وہ عقیدے کے سامنے سر جھکائے۔ علم اور عقیدے کے درمیان ربط ان واردات قلبی کی بنیاد پر کیا گیا جس کی ایک نمایاں مثال امام غزالی کی روحانی سرگذشت ہے۔ یہی قلبی واردات شخصی جذبہ دینی اور اجتماعی مذہب کو مربوط کرنے کا ذریعہ تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس سرچشمہ تک پہنچایا جہاں علم اور عقیدہ مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں اور جیسے وہ تفریق جو مادی وجود میں نظر آتی ہے توحید کی ایک دلیل تھی۔ علم اور عقیدے کی وحدت علوم دینی اور دنیاوی کی تقسیم سے ثابت کی گئی ہے۔ بہت ممکن ہے نوع انسانی زیادہ لمبے رستے سے پھر اسی حقیقت تک پہنچے جس کی طرف مسلمان مفکر اشارہ کر گئے ہیں اور یہ بات بھی زیادہ وثوق اور یقین کے ساتھ کہی جائے کہ زندگی کا مرکز دین ہے اور انسان کے سارے علم اور عمل کی غرض عبادت ہونا چاہیے۔

سہارنپور کا معاشی جائزہ

آبادی کے مختلف عناصر کا باہمی مقابلہ

تمہید | سہارنپور کے مطالعے کے سلسلے میں زیادہ تر سوال نامہ (۱۱) یعنی برادریوں کے بارے میں جوابات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں خاصی کامیابی ہوئی۔ دوسرا بڑا کام یہ کیا گیا کہ سہارنپور کی سکنائی جائداد میں مسلم اور غیرمسلم اقوام کا نسبتی حصہ معلوم کرنے کے لئے شہر سہارنپور کے مکانات کی ملکیت اور حیثیت کا ایک جائزہ لیا گیا اور اس کام میں بہت زیادہ مدد ان اعداد و شمار سے ملی جو میونسپل کمیٹی نے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے جمع کرائے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سرسری جائزہ شہر کی تجارت و صنعت کا بھی لیا گیا۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر اور بندوبست کی رپورٹوں میں جو اعداد و شمار سہارنپور کی تاریخ، یہاں کی آبادی کی تقسیم، یہاں کی معاشی اور معاشرتی حالت کے بارے میں مل سکے۔ ان سے بھی تھوڑا بہت کام لیا گیا۔

برادریوں کا مطالعہ صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس میں غیر مسلم برادریوں کو بھی مقابلہ کے لئے شامل کیا گیا۔

سہارنپور کے ڈسٹرکٹ گزیٹر سے اقتباسات | اپنے جائزہ کے نتائج بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہارنپور کے ڈسٹرکٹ گزیٹر (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) میں جو امور اس سلسلے میں موجود ہیں ان کا اقتباس درج کر دیا جائے

(الف) **ضلع سہارنپور میں آبادی کی مذہبی تقسیم** | ۱۹۲۱ء کے گزیٹر میں ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے کام لیا گیا ہے اور آبادی کی مذہبی تقسیم کو حسب ذیل الفاظ

یں بیان کیا گیا ہے ۔

"گذشتہ مردم شماری (سنہ ۱۹۵۱ء) کے مطابق ضلع سہارنپور کی مجموعی آبادی میں سے ۱۰ لاکھ ۸۲ ہزار ۶ سو ۱۹ ہندو اور ۳ لاکھ ۵۱ ہزار تین سو ۱۳ مسلمان، ۵۰ ہزار ۶ سو ۸۸ جین، ۲ ہزار ۹ سو ۷۲ عیسائی، ۲ ہزار ۳ سو ۲۹ آریا، ۴ سو ۷۷ سکھ ۱۲ پارسی، ایک بدھ مت تھے۔ یعنی ۳۱ر۶۵ فی صد ہندو اور ان کے بالمقابل ۳۴ر۹۹ فی صد مسلمان تھے، اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ دوسرے بہت سے اضلاع کی طرح یہاں بھی مسلمانوں کی تعداد میں اپنے پڑوسیوں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب سنہ ۱۸۷۲ء میں ۶۱ر۳۱ فی صد تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ بڑھ کر ۴۱ر۳۲ فی صد ہو گیا، اور ہندوؤں کی تعداد میں اسی نسبت سے کمی واقع ہوتی رہی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نسبتاً بہتر غذا کھانے کی وجہ سے مسلمانوں کی شرح پیدائش اور شرح عمر ہندوؤں کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے۔ اور اس کا یہ بھی سبب ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت بھی مقابلتہً بہتر ہے اور غریب ترین طبقہ میں ان کی کم تر تعداد شامل ہے۔ ضلع کے مختلف حصوں میں مسلم عنصر کی تقسیم اور اس کے نتیجے کے طور پر مجموعی آبادی کے مقابلے میں اُن کی نسبتی تعداد مختلف ہے۔ سہارنپور کی تحصیل میں تقریباً ۴۰ فی صد لوگ مسلمان ہیں۔ اس کے مقابلے میں دیوبند میں ان کا تناسب ۲۴ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ نکڑ اور رڑکی کی تحصیلوں میں ان کی تعداد ضلع کے عام اوسط کے مساوی ہے۔ دوسرے مذاہب کو ان دونوں کے مقابلے میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے سنہ ۱۹۲۱ء میں ضلع سہارنپور کی کل آبادی ۹ لاکھ ۷۷ ہزار ۶ سو ۵۴ تھی جس میں دو لاکھ ۱۱ ہزار ۵ سو ۷۲ ہندو، ایک لاکھ ۲۵ ہزار ۳ سو ۱۶ مسلمان اور ۱۰ ہزار ۷ سو ۱۰ دیگر لوگ تھے۔

(ب) شہر سہارنپور: سہارنپور شہر کے بارے میں روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس

کی بنیاد ایک بزرگ شاہ ہارون چشتی نے رکھی، جن کی قبر کی زیارت کے لیے اب بھی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آتی رہتی ہے۔ یہ بزرگ محمد بن تغلق کے زمانے میں مشہور ہوئے، اور اس کے تھوڑے عرصے بعد اس جگہ نے اس حیثیت سے کچھ اہمیت اختیار کرلی کہ یہاں ایک فوج رکھی جانے لگی تاکہ وہ مغلوں کے ان حملوں کو روک سکے جو وہ شمال کی جانب سے دوآب پر کرتے رہتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں یہ شہر خاصا بڑا ہوگیا تھا۔ لیکن اس کی اہمیت اس وقت تک زیادہ نہیں ہوئی جب تک کہ روہیلہ نواب ضابطہ خاں ولد نجیب خاں پدر غلام قادر خاں نے اس کو اپنی راج دھانی نہیں بنایا۔ جب برطانیہ نے بالائی دوآب پر قبضہ کیا تو اس شہر کو ضلع کا صدر مقام بنادیا گیا اور اس وقت سے برابر اس شہر کو اس وجہ سے کہ وہ میرٹھ اور پنجاب کے درمیان ایک تجارتی مرکز تھا تیزی سے ترقی ہوتی رہی۔ اس شہر کی آبادی کی ترقی ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوگی۔

سنہ				
۱۸۴۷ء	۳۲	ہزار	۲ سو	۹۴
۱۸۵۳ء	۳۱	″	۹ ″	۶۸
۱۸۶۵ء	۴۴	″	۱ ″	۱۹
۱۸۷۲ء	۴۳	″	۸ ″	۴۴
۱۸۸۱ء	۵۹	″	۱ ″	۹۴
۱۸۹۱ء	۷۳	″	۱ ″	۹۴
۱۹۰۱ء	۶۱	″	۲ ″	۵۴

۱۹۰۱ء میں مسلمانوں کی تعداد ۳۷ ہزار ۶ سو ۶۴، ہندوؤں کی ۲۵ ہزار ۸ سو ۳۵، جینیوں کی ایک ہزار ۳ سو ۵۲، عیسائیوں کی ۹ سو ۱۱، جس میں یورپین اور یوریشین بھی شامل تھے، اور دیگر (آریا اور سکھ) کی ۴ سو ۳۲ تھی۔ ۱۹۲۱ء میں

ہارنپور شہر کی کل آبادی ایک لاکھ ۵ ہزار ۶ سو ۲۲ ہوگئی تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد ۵ ہزار سات سو ۱۸، ہندوؤں کی ۴۱ ہزار ۸ سو ۸۲ اور بقیہ کی ۵ ہزار ۲۲ تھی۔

"**ضلع سہارنپور میں مسلمانوں کی ذاتیں** اس ضلع کے مسلمان زیادہ تر سُنی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء ں ۹۷ر۸۴ فی صد مسلمانوں کا تعلق سنّی فرقہ سے تھا اور شیعہ صرف ۱ر۱۹ فی صد تھے ور لال بیگی جو مہتر ہیں اور صرف نام کے مسلمان ہیں ر۹۵ فی صد تھے۔

"مسلم آبادی کی ساخت مختلف نوعیت رکھتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اگر ایک طرف کچھ لوگ مسلم حملہ آوروں کی اولاد سے ہیں تو دوسری طرف اُن کی اکثریت کا تعلق ان ہندو ذاتوں سے ہے جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس کے علاوہ موروثی پیشوں سے لگے ہوئے لوگوں میں بھی ایک جُداگانہ ذات بننے کی طرف رجحان پایا جاتا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ نِکلا ہے کہ ماضی قریب میں ذاتوں کا ایک پیچیدہ اور مصنوعی نظام وجود میں آگیا ہے گذشتہ مردم شماری (سنہ ۱۹۰۱ء) کے موقع پر ۹۷ ذاتوں کا شمار کیا گیا تھا اور اس میں بھی وہ ۲۸۸۲ اشخاص شامل نہیں تھے جن کو کسی ذات میں نہیں رکھا جا سکتا تھا لیکن جن ذاتوں کو اہمیت حاصل ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ۲۴ ذاتوں میں لوگوں کی تعداد ۱۰۰ سے کم تھی۔ اس کے علاوہ ۲۳ ذاتوں میں لوگوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور آبادی کے ۸۰ فی صد حصّہ کا تعلق صرف گیارہ ذاتوں سے تھا۔

"تیلی:۔ ان ذاتوں میں تعداد کے لحاظ سے اول نمبر تیلیوں کا تھا جن کی تعداد ۸۴ ہزار ۶ سو ۲۴ یا مسلمان آبادی کا ۱۴ر۸۵ فی صد تھی۔ یوپی کے کسی دوسرے ضلع میں ان کی تعداد اتنی نہیں تھی۔ آبائی پیشہ کے لحاظ سے یہ لوگ تیل نکالنے کا کام کرتے ہیں۔ لیکن اِن کی تعداد کا بڑا حصّہ دوسرے پیشوں خصوصاً زراعت سے لگا ہوا ہے۔ سہارنپور اور دیوبند کی تحصیلوں میں ان کی تعداد دوسری تمام ذاتوں سے زیادہ ہے اور ان کی تقریباً نصف تعداد سہارنپور میں آباد ہے۔

"جولاہے":- ان کے بعد دوسرا نمبر جولاہوں کا ہے۔ ان کی تعداد ۴۴ ہزار ۷ سو ۸۴ یا مسلم آبادی کا ۵ء۷ ر ۱۲ فی صد ہے۔ ان کی زیادہ تر آبادی سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں میں ہے لیکن دوسری جگہوں میں بھی یہ لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان کی داڑھی مختصر سی ہوتی ہے اور گال تقریباً صاف ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں آسانی کے ساتھ پہچانا جا سکتا ہے اور یہ لوگ تقریباً ہر گاؤں میں ملتے ہیں، ان کی بیشتر تعداد پارچہ بافی کے آبائی پیشے سے لگی ہوئی ہے۔ لیکن کساد بازاری نے انھیں کھیتی کا کام اختیار کرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے اور اس کام میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ ان سے قریبی طور پر مشابہ اور اصل کے لحاظ سے ایک، بینہا یا روئی دھنکنے والے لوگ ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اس ضلع میں زیادہ نہیں ہے۔

"گاڑا":- یوپی کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں سہارنپور میں گاڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یوپی میں گاڑے میرٹھ کمشنری اور آگرہ اور روہیلکھنڈ کی کمشنریوں کے بعض حصوں میں محدود ہیں۔ صوبہ کی مجموعی تعداد ۵۳ ہزار ۹ سو ۵۲ کے مقابلے میں اُن کی تعداد ضلع سہارنپور میں ۴۴ ہزار ۵ سو ۳۶ تھی اور کل مسلمانوں کے مقابلے میں اُن کا مجموعی اوسط ۸۶ء ۱۲ فی صد تھا۔ یہ مساوی طور پر منقسم تھے اور نکوڑ کی تحصیل میں دوسری ذاتوں کے مقابلے میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ ان کی اصل کے بارے میں کچھ اپنے آپ کو مغل کہتے ہیں، کچھ سید۔ اگرچہ اکثر صورتوں میں یہ لوگ اپنے آپ کو ان راجپوتوں کی اولاد کہتے ہیں جنھوں نے مسلم حکومت کے ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا اور ان کا بیان ہے کہ ان کے نام کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ مسلمان ہونے کے بعد انھوں نے اپنے مردوں کو گاڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں کئی شکمی ذاتیں پائی جاتی ہیں جن کے نام راجپوتوں کی شکمی ذاتوں سے ماخوذ ہیں۔ گاڑے اعلیٰ درجے کے کاشتکار ہوتے ہیں لیکن اپنے کام میں محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں مقدمہ بازی کی بڑی لت ہے۔ اور قانون کی اصطلاحی باتوں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے زمیندار ان سے گھبراتے ہیں۔

چنانچہ یہ کہاوت مشہور ہے "گاؤں میں گاڑا، کھیت میں جھاڑا" یعنی گاؤں کے اندر گاڑا اتنا ہی پریشانی کا باعث ہوتا ہے، جتنا کھیت میں جھاڑ کانٹے ہوتے ہیں۔

"**شیخ**:- شیخوں کی تعداد ۲۷ ہزار ۹ سو ۶۳ یعنی مسلم آبادی کا ۹۶ر۷ فی صد تھی۔ ان میں ۵/۱ کا تعلق سہارنپور تحصیل سے تھا اور باقی ضلع کے مختلف حصوں میں مساوی طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں بہت سے اپنی اصل کے لحاظ سے باہر کے ہیں لیکن ان میں سے کم ایسے ہیں جنھوں نے کوئی امتیازی [illegible] حاصل کی ہو اور اُن کی ملکیت میں زمینیں بھی نسبتاً کم ہی ہیں۔ ۹ ہزار ۸ سو ۲۸ کا تعلق صدیقی نسل سے تھا اور ۶ ہزار ۵ سو ۲ ۵ کا قریشی سے اور ان دونوں نسلوں میں ضلع کی اور تمام دوسری نسلوں کے مقابلے میں زیادہ شیخ پائے جاتے تھے۔ ۳ ہزار ۹۴ انصاری تھے جو ضلع کے سب حصوں میں رہتے تھے لیکن ان کی زیادہ تعداد دیوبند اور نکڑ کی تحصیلوں میں تھی، ایک ہزار ۳ سو ۹۷ فاروقی تھے جو زیادہ تر نکڑ تحصیل میں تھے اور ۷ر۹۰ عثمانی تھے جو تقریباً تمام کے تمام دیوبند میں تھے دوسری اور نسلیں بھی موجود تھیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی جنھوں نے کسی نسل کا اظہار نہیں کیا یہ عام طور پر وہ لوگ تھے جو ان ہندوؤں کی اولاد تھے جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنے آپ کو شیخ کہنا شروع کر دیا تھا۔

"**رانگڑ یا مسلم راجپوت**:- ان کی تعداد ضلع سہارنپور میں بہت زیادہ تھی یعنی ۲۳ ہزار ۸ سو ۸ ۵ یا مسلم آبادی کا ۱۵ر۶ فی صد۔ انھوں نے بہت ابتدائی زمانے میں اسلام قبول کر لیا تھا لیکن دوسری نومسلم ذاتوں کی طرح ان میں بھی بڑی حد تک اپنی اصلی نسل کی خصوصیات اور رسم ورواج ابھی تک باقی ہیں۔ یہ زیادہ تر صدر مقام کی تحصیل میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس جگہ اور نکڑ کی تحصیل میں ان کی اکثریت خالص راجپوت نسل سے نہیں ہے۔ بلکہ چوہان نسل سے ہے۔ مؤخر الذکر کی مجموعی تعداد ۸ ہزار ۲ سو ۸ ۷ ہے باقی ماندہ میں سے ۸ ہزار ۷ ۴ کا تعلق کتھا کے علاقے کے پنڈیروں سے ہے اور یہ لوگ خاص طور پر شمال کی دو تحصیلوں میں رہتے ہیں۔ دوسری نسلوں میں جادوں، بھٹ، تومار

اور رادت شامل ہیں جن میں سے تقریباً تمام سہارنپور تحصیل میں رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ پنوار، بڑگوجر اور دوسری اور نسلوں کے راجپوت بھی ہیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

گوجر:۔ مسلمان گوجروں کی تعداد بھی اس ضلع میں غیر معمولی ہے یعنی ۲۰ ہزار ۲ سو ۴۲۔ اس سے زیادہ تعداد یوپی کے کسی دوسرے ضلع میں نہیں ہے۔ ان کی بیشتر آبادی نکڑ اور سہارنپور کی تحصیلوں میں ہے۔ رڑکی کی تحصیل میں ان کی تعداد بہت کم ہے یہاں یہ لوگ اپنے پرانے مذہب پر قائم ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی خاص بات لائق ذکر نہیں ہے کیونکہ ان میں اپنے ہندو بھائیوں کے مقابلے میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اسلام کی صرف ظاہری شکل کو اختیار کیا ہے۔ اس کی روح کو قبول نہیں کیا ہے

پٹھان:۔ اس کے بعد پٹھانوں کا نمبر ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۶ ہزار ۹ سو بارہ ہے۔ خاص طور پر سہارنپور تحصیل میں پائے جاتے ہیں لیکن ویسے پورے ضلع میں مساوی طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس خاصی بڑی زمینداری ہے۔ لیکن ایسے خاندان جن کی جائداد بڑی ہو بہت کم ہیں۔ ان کی قدیم املاک برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے فوراً بعد ختم ہو گئی تھیں۔ پٹھانوں میں بہت سی نسلوں کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر لائق ذکر یوسف زئی ہیں۔ جن کی تعداد ۵ ہزار ۷ سو ۴۲ ہے۔ ان کے بعد ککڑ زئی جن کی تعداد سب سے زیادہ نکڑ اور دیوبند میں ہے، ان کے علاوہ لودی سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں میں اور محمد زئی، وارک زئی، بنگش، خلیل اور آفریدی ہیں

فقیر، قصاب، جھوجا، حجام:۔ فقیروں کے بارے میں جن کی تعداد ۱۳ ہزار ۸ سو ۴۲ ہے، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہر جگہ ملتے ہیں۔ ان میں سے بہت کو محض فقیر کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ایک خاصی تعداد سائیں اور جوگیوں کی بھی ہے۔ اسی طرح قصاب یا قصائیوں کے بارے میں بھی کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جماعت میں ان کی حیثیت کم سمجھی جاتی ہے اور ان کی شناخت کسی نسلی خصوصیت کی بنا پر نہیں بلکہ پیشہ کی بنیاد پر

ں جا سکتی ہے۔ یہ چاروں تحصیلوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اور قدرتی طور پر شہروں میں ان
ں تعداد بہت زیادہ ہے۔ جھوجھوں کے بارے میں البتہ کچھ باتیں خاص طور پر بیان
رنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ یوپی کے دوسرے تمام اضلاع کے مقابلے میں سہارنپور
یں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد ۲۱ ہزار ۴ سو ۶۲ ہے۔ سہارنپور
ے علاوہ ان کی بڑی تعداد صرف مظفر نگر اور بجنور میں پائی جاتی ہے۔ اِن کی ملکیت
یں زمینیں کم ہیں۔ لیکن کاشتکار کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت ممتاز ہے اور ضلع کے
بہترین کاشتکاروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سب تحصیلوں میں ملتے ہیں لیکن
ان کی اکثریت رڑکی تحصیل میں پائی جاتی ہے۔ یہ اپنی اصل کے لحاظ سے واضح طور پر شدر
ہیں، اور اپنے آپ کو راجپوت کہتے ہیں اگر اس بات کی رانگڑ اور دوسرے لوگ سختی
سے تردید کرتے ہیں۔ اور انھیں ادنیٰ درجے کا سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ غیر معمولی جفاکشی
اور ہنر کے مالک ہیں اور اپنی زمین کو بہت توجہ اور جزئی تفصیل کے ساتھ جوتتے ہیں
اور اپنے کھیتوں کو اس طرح جز در جز تقسیم کرتے ہیں کہ پٹواری کو خسرہ کے تیار کرنے
میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ ان کے بعد صرف نائیوں یا حجاموں کی ایسی ذات رہ جاتی
ہے جس کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۱۲ ہزار ۲ سو ۵۹ ہے
اور تمام ضلع میں مساوی طور پر منقسم ہے۔

"سید":۔ باقی ماندہ ذاتوں میں صرف سید ایسے ہیں جن کی تعداد
۵ ہزار سے زیادہ ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ۷ ہزار ۸ سو ۲۵ ہے، اور ان کی اکثریت
نکڑ اور سہارنپور کی تحصیلوں میں ملتی ہے۔ ان کی ملکیت میں زمین کی ایک خاصی بڑی مقدار
ہے۔ لیکن ان کے پرانے خاندان اکثر صورتوں میں زوال زدہ ہیں۔ صرف انبیٹھے کے پیرزادے
شاید اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک زمانے میں مظفر نگر کے بارہ سیدوں کے خاندان
کی زمینداری اس ضلع میں ممتاز مرتبہ رکھتی تھی لیکن جانسٹھ خاندان کے زوال کے بعد

ن کی زمینداری ان سے لے لی گئی تھی ۔ سیدوں میں نصف سے زیادہ کا تعلق حسینیؑ نسل سے ہے ۔ اس نسل کی تعداد یو۔پی میں سب سے زیادہ ہے ۔ نکڑ تحصیل میں بخاریوں کی بھی ایک بڑی آبادی ہے اور رڑکی تحصیل میں جعفریوں کی بھی خاصی تعداد ہے ۔ باقی ماندہ کا تعلق مختلف نسلوں سے بیان کیا جاتا ہے ۔ خاص نسلیں ترمذی اور ہاشمی ہیں ۔

دوسری ذاتیں :- مسلمانوں کی باقی ماندہ ذاتیں اپنے نام یا پیشہ کے لحاظ سے بالکل ہندو ذاتوں جیسی ہیں ۔ دھوبی ، بھشتی ، لوہار کمہار کی ذاتوں کی تعداد چار ہزار فی کس سے زیادہ ہے ۔ ان کے بعد نمبر بہنیا ، بھنگی ، بنجارا ، درزی ، تگا ، بڑھئی ، علوائی مغل اور گھوسیوں کا ہے جن میں سے ہر ایک کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے مسلم کمہاروں کی تعداد غیر معمولی ہے ۔ لیکن یہ بات غالباً مقامی حالات کی وجہ سے ہے کیونکہ بعض زمانوں میں اس ضلع میں لوگوں نے وسیع پیمانے پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا ۔ مغل زیادہ تر نکڑ اور سہارنپور کی تحصیلوں میں آباد ہیں ۔ نصف کا شمار چغتائیوں میں کیا گیا ہے اور ان کی اکثریت ترکمان ہے ۔ موخر الذکر شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کا صدر مقام لکھنوتی ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ یہاں بابر کے زمانے سے آباد ہیں ۔ گھوسی ، گلہ بان ہیں ، اور ہندو اہیروں سے بہت مشابہ ہیں اور زیادہ تر شمال کی تحصیلوں میں رہتے ہیں ۔ چھوٹی ذاتوں میں سنار ، کمبوہ ، صیقل گر یا زرہ ساز اور کھٹیک صوبے کے دوسرے اضلاع کے مقابلے میں یہاں زیادہ تعداد میں آباد ہیں ۔ لیکن انھیں کسی طرح محض اس ضلع کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا جا سکتا ۔ بنگالیوں کا بھی یہاں ذکر کرنا ضروری ہے ان کی تعداد صوبے کی مجموعی تعداد ۱۹۷ کے مقابلے میں اس ضلع میں ۸۴ تھی ۔ باقی لوگ اودھ میں ملتے ہیں ۔ ان کا تعلق آوارہ گرد ذات سے ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب بنگال کے لودی پٹھانوں سے ملتا ہے ۔ لیکن بظاہر یہ لوگ نٹ یا اسی قسم کے دوسرے لوگوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں ۔

(۵) ضلع سہارنپور میں ہندو ذاتیں | "سہارنپور کے ہندو عنصر کی ساخت بھی بہت مختلف النوع ہے۔ سن ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں ۲۰۶ مختلف ذاتوں کے نمائندے دریافت کئے گئے تھے ان میں وہ ایک ہزار ۲ سو ۹۳ افراد شامل نہیں تھے جنھوں نے اپنی کوئی ذات درج نہیں کرائی تھی۔ ان میں سے اکثر کی اہمیت بہت کم تھی۔ صرف ۱۶ ذاتیں ایسی تھیں جو ہندو آبادی کے ۸۰ر۳۶ فی صد پر حاوی تھیں۔ اور ان میں سے ہر ایک میں ۱۰ ہزار سے زیادہ اشخاص شامل تھے اس کے بعد پانچ ذاتیں ایسی تھیں جن میں ۵ ہزار سے زیادہ اشخاص شامل تھے اور ان کا مجموعہ کل ہندو آبادی کا ۲۳ر۵ فی صد ہوتا تھا۔ ۱۴ ذاتیں ایسی تھیں جن میں ۱۰ سے کم لوگ شامل تھے۔

"چمار:۔ تعداد کے لحاظ سے سب سے اہم نمبر چماروں کا تھا۔ ان کی حیثیت بہت ادنیٰ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ضلع کے ہر حصہ میں اُن کی تعداد دوسری ذاتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی اور سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں میں ان کا غلبہ بہت نمایاں تھا۔ اُن کی مجموعی تعداد ۲ لاکھ ۵ ہزار، ۱۶۷ یا کل ہندو آبادی کا ۰۶ر۳۰ فی صد تھی۔ یوں تو یوپی کے اکثر ضلعوں میں چمار ملتے ہیں۔ لیکن ایسے ضلع کم ہیں جن میں ان کی تعداد کی برتری اتنی زیادہ ہو جتنی کہ سہارنپور میں تھی۔ ان کی بیشتر تعداد دیہات کی مزدور پیشہ آبادی پر مشتمل ہے۔ ان کی ملکیت میں کچھ زمینیں بھی ہیں لیکن کاشتکار کی حیثیت سے ان کی جوت میں رقبہ نسبتاً مختصر ہی رہتا ہے کیونکہ اپنے طور پر کھیتی کا کام کرنے کی جگہ یہ زیادہ تر مزدور کی حیثیت سے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جہاں یہ لوگ کھیت پر کام نہیں کرتے وہاں اپنے پیشہ کے مطابق یہ لوگ اپنے نام بھی بدل لیتے ہیں، مثلاً بیلدار، موچی، راج، مستری جولاہا وغیرہ۔

"گوجر:۔ ان کے بعد، لیکن ان سے بہت پیچھے گوجروں کا نمبر ہے۔ ان کی تعداد ۱۵ ہزار ایک سو ۹۱ یا ہندو آبادی کا ۵ر۷ فی صد ہے۔ یہ ضلع میں خاصے مساوی طریقے پر منقسم ہیں۔ لیکن نکوڑا اور دیوبند کی تحصیلوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور سہارنپور

میں نسبتاً کم ہیں۔ یہ ذات زیادہ تر مغربی اضلاع خصوصاً میرٹھ کی قسمت میں محدود ہے
یو۔پی میں سہارنپور کی مجموعی تعداد سے زیادہ تعداد صرف میرٹھ کے ضلع میں پائی جاتی ہے
گذشتہ زمانے میں سہارنپور کے ایک بڑے حصے کا نام گجرات تھا اور موجودہ زمانے میں
اس ضلع کو لوگ تین مختلف حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ مشرق میں گنگا کا نشیبی علاقہ،
گھار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جمنا کے نشیبی علاقہ کو راؤٹولہ کہا جاتا ہے اور
مرکزی حصے کو گجرات کہتے ہیں جس میں گنگوہ، رامپور اور نکوڑ کے پرگنے اور مظفر نگر کے
ملحقہ علاقے شامل ہیں۔ اس ضلع میں زمینوں کے سب سے بڑے مالک گوجر ہی ہیں۔ ان کی
زمینداری میں لنڈھورا کی ریاست بھی شامل ہے۔ کاشتکار کی حیثیت سے بھی دوسری
تمام ذاتوں کے مقابلے میں ان کے پاس زمینیں زیادہ ہیں۔ اگرچہ دیوبند کی تحصیل میں چوہان
کاشتکاروں کے پاس ان سے زیادہ رقبہ ہے۔ کاشت کے کام میں یہ زیادہ اچھے نہیں ہیں
اور ابھی تک یہ لوگ اپنی سرکشی اور فتنہ خیزی کی وجہ سے بدنام ہیں۔ یہ لوگ چوری بھی کرتے
رہتے ہیں۔ ان کی تاریخ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ لوگ پانچ صدی
گذرے مغرب سے ترک وطن کرکے یہاں آئے تھے اور یہ ہر جگہ اپنے آپ کو راجپوت نسل سے
کہتے ہیں۔ اس دعوےٰ میں شاید کچھ اصلیت بھی ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ یہ گوجر اپنے
اپنے زمانے کے ان گوجروں سے تعلق رکھتے ہیں جو موجودہ زمانے کے پریہار راجپوتوں
کے اسلاف تھے۔ سنہ ۱۵۴۲ء میں انھوں نے اپنی طاقت دوآب میں بڑھانا شروع کردی تھی
جس کی وجہ سے شیر شاہ ان کے خلاف سخت کارروائی کرنے کے لئے مجبور ہوگیا تھا لیکن ان کے
سیاسی اثر نے اٹھارھویں صدی کے وسط تک کوئی اہمیت اختیار نہیں کی تھی۔ اس وقت البتہ
رام دیال اور نائن سنگھ نے لنڈھوڑا اور پریشں ہت کی ریاستیں حاصل کیں۔ اس ضلع کے
گوجروں کا تعلق بہت سی نسلوں سے ہے جن کے نام راجپوتوں کی کو نسلوں سے ماخوذ
ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر لائق ذکر کھوبہ ہیں، جن سے لنڈھوڑا کے خاندان کو

کا بھی تعلق ہے ۔

"راجپوت" :- گوجروں کے بعد راجپوتوں کا نمبر ہے ان کی تعداد ۵۴ ہزار ۹ سو ۰۴ یعنی کل ہندو آبادی کا ۳۷ر۶ فی صد تھی ۔ سہارنپور تحصیل میں ۱۹ ہزار ۸ سو ۴ ، دیوبند میں ۱۴ ہزار ۲۰۷ ، رڑکی میں ۶ ہزار ۴ سو ۴۶ ، نکڑ میں ایک ہزار ۹ سو ۶۰ ، دیوبند میں ایک ہزار ۹ سو ۴۵ ۔ چوہان اگرچہ اپنے آپ کو چھتری کہتے ہیں اور اپنی نسل کا سلسلہ دہلی کے حکمرانوں سے ملاتے ہیں ، لیکن ان کا تعلق ایک جداگانہ ذات سے ہے جس کی حیثیت کچھ زیادہ بلند نہیں سمجھی جاتی ۔ صحیح راجپوتوں میں سب سے بڑی تعداد پنڈیروں کی ہے ۔ ان کا علاقہ وہ ہے جسے کھتا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس میں پرگنہ دیوبند ، ناگل اور رامپور کے ۶۴ گاؤں شامل ہیں ۔ یہ ایک مضبوط اور مغرور نسل کے لوگ ہیں اور شروع زمانے میں ان کی لوٹ مار کی شہرت گوجروں سے بھی زیادہ تھی ۔

"برہمن" :- ان کی تعداد ۳۴ ہزار یعنی ۴۰ر۶ فی صد ہے یہ خاصے بڑے زمیندار ہیں اور کاشتکار کی حیثیت سے بھی ان کے پاس بڑا رقبہ ہے ۔ لیکن ان کی کھیتی کا معیار کم درجے کا ہوتا ہے اور یہ اپنا کام زیادہ تر مزدوروں سے کراتے ہیں ان کی اکثریت کا تعلق گوڑ ذات سے ہے ۔

"کہار" :- پانچواں نمبر کہاروں کا ہے ۔ اُن کی تعداد ۴۱ ہزار چار سو ۶۱ یعنی ۰۷ر۶ فی صد ہے ، ان کا پیشہ کاشتکاری ، پانی بھرنا ، گھر کی ملازمت اور ڈولی پالکی اُٹھانا ہے ۔

"مالی اور سینی" :- مالی جنھیں باغبان بھی کہا جاتا ہے ۔ ان کا درجہ کھیتی کے کام میں اول ہے ۔ ان کی تعداد ۲۹ ہزار چھ سو ۱۱ ہے ۔ اس تعداد میں سینی شامل نہیں ہیں جو تقریباً بالکل ان ہی جیسے ہیں ان کی تعداد ۱۵ ہزار ۷ سو ۳۹ ہے ۔ یہ دونوں مل کر

ں ہندو آبادی کا ۵۷ء۶ فی صد ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ۶۱۱۶ کھمی اور ۱۵۰۸ مراد بھی تھے
سب کو ملانے کے بعد ان کی تعداد سہارنپور تحصیل میں ۱۳ ہزار ۴ سو ۳۰، رڑکی کی
تحصیل میں ۱۱ ہزار ۲ سو ۶۱، دیوبند تحصیل میں ۱۱ ہزار ۲ سو ۹۳ اور نکڑ تحصیل میں
۹ ہزار ۹ سو ۰۴ ہوتی تھی، ضلع کی بیشتر تعداد کا تعلق گوے، بھاگیرتی اور ہنیا گوت سے
تھا۔ گوے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ زمیندار بھی ہیں۔ ان میں سے بعض وکیل بھی ہیں
ان کا خاص کام پھول ترکاری وغیرہ کی کاشت ہے۔ ویسے تو یہ کھیتی کا ہر طرح کا کام کرتے
ہیں لیکن یہ اپنی خاص توجہ زیادہ قیمتی فصلوں کے بونے کی طرف کرتے ہیں۔

بھنگی: بھنگی کے بارے میں جنھیں اس ضلع میں عام طور پر خاکروب کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی تعداد ۲۹ ہزار ۴ سو ۵۵ تھی

بنیئے: اپنی دولت اور اپنی اس زمینداری کی وجہ سے جو انھوں نے پیدا کی
ہے۔ اس ضلع کی نہایت اہم ذاتوں میں سے ہیں۔ ان کی تعداد مجموعی طور پر ۲۸ ہزار ۹ سو
۴۲ ہے۔ یہ سہارنپور اور رڑکی کی تحصیل میں سب سے زیادہ ہیں لیکن ان کی تقسیم
کل ضلع میں خاصی مساوی ہے۔ ان کی بیشتر اکثریت اگروال کی مشہور گوت سے تعلق رکھتی
ہے ان کے اس نام کے بارے میں بہت قیاس آرائی کی گئی ہے۔ لیکن اس ضلع کے لوگوں
کا بیان ہے کہ یہ لوگ چودھویں صدی کے خاتمہ پر ہریانا کی سرحد کے ایک مقام اگروہہ
سے آئے تھے۔ دوسرے گوت، رستوگی، مہیشری، بارہ سینی اور کندو کے ہیں، موخرالذکر
صرف سہارنپور اور رڑکی کی تحصیلوں تک بنیوں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق وشنومتی فرقہ
سے ہے، اور لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اکثر جین متی لوگوں کا تعلق
بھی اسی ذات اور خصوصاً اگروال گوت سے ہے۔

بڑھئی: پیشے کے اعتبار سے لکڑی کا کام کرتے ہیں، ان کی تعداد ۱۲ ہزار
۹ سو ۳ ہے۔

کوری :۔ یہ ہندو جلاہے ہیں۔ ان کی [illegible]۱ ہزار ۲۴ ہے، اور ان کی بڑی تعداد دیوبند کی تحصیل میں پائی جاتی ہے۔

کمہار :۔ یہ مٹی کے برتن بناتے ہیں، اُن کی تعداد ۱۶ ہزار ۸ سو ۶۴ ہے اور ان کی نصف تعداد رڑکی تحصیل میں ہے۔

جاٹ :۔ اُن کی تعداد ۱۵ ہزار ۹۱ ہے اور ان کی ایک تہائی تعداد رڑکی میں ہے۔ یہ لوگ بہت اعلیٰ قسم کے کاشتکار ہیں۔ وسیع پیمانے کی کھیتی کرتے ہیں اور بڑی صبر اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ ان کی جوت میں سب سے زیادہ رقبہ پرگنہ منگلور میں پایا جاتا ہے۔

تگا :۔ محنت میں جاٹوں کے برابر ہیں، لیکن کھیتی کے کام میں ان جیسی مہارت نہیں رکھتے۔ یہ زیادہ تر دیوبند کی تحصیل میں ہیں۔ ان کی تعداد ۱۵ ہزار ۵۱ ہے۔

فقیر :۔ فقیر........ ۱۳ ہزار ۹ سو ۲۵، جوگی:۔ ۹ ہزار ۳ سو ۷۷۔
گوشائیں :۔ ایک ہزار ۷ سو ۳۴۔ بیراگی :۔ ایک ہزار پانچ سو ۱۳۔ سنیاسی :۔ [illegible] سو ۳۴۔ ان کے علاوہ اور بھی مثلاً سنیاسی، اداسی اور غیر مشخص تیاگی۔

گڈریا :۔ ان کی تعداد ۱۲ ہزار ۲ سو ۵ ہے۔ یہ بھیڑوں اور بکریوں کے گلے پالتے ہیں۔ اکثر یہ بھیڑوں کا اون بھی بنتے ہیں۔ دیوبند اس صنعت کا مشہور مرکز ہے۔

نائی وغیرہ :۔ نائیوں کی تعداد ۸ ہزار ۷ سو ۹۴، لوہاروں کی ۷ ہزار ۶ سو ۹، اہیروں کی ۶ ہزار ۸ سو ۱۱، سناروں کی ۶ ہزار ۴ سو ۳۲، بنجاروں کی ۶ ہزار ۴۰، بنجاروں نے عام طور پر مذہب اسلام قبول کرلیا ہے۔ یہ لوگ پیشے کے اعتبار سے مال ڈھونے کا کام کرتے ہیں اور خاص طور پر یہ شمال کے جنگلی علاقوں میں آباد ہیں جہاں ان کی ملکیت میں بہت [illegible] ہوتے ہیں۔

اس کے بعد دھوبیوں، لودھوں، چھیپیوں، کمبد... ، اوڑھوں، کھٹیکوں کائستھوں، بھڑبھونجوں اور درزیوں کا نمبر ہے جن کی تعداد ۲ ہزار اور ۵ ہزار کے درمیان ہے۔

ہندو مذہب کے ماننے والے کمبوہوں کی تعداد یوپی کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں اس ضلع میں سب سے زیادہ ہے اور یہ لوگ یہاں پنجاب سے آئے تھے۔ یہ لوگ کھتریوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن عام طور پر زراعت پیشہ ہیں اور بعض صورتوں میں انھوں نے زمینداری بھی پیدا کرلی ہے۔ تقریباً تمام لوگ سہارنپور کی تحصیل میں رہتے ہیں اس ضلع کے کائستھوں کا تعلق زیادہ تر بھٹناگر اور سکسینہ گوت سے ہے اور ان کو بہت کم اہمیت حاصل ہے، اگرچہ ان کے پاس تھوڑی سی زمینداری پائی جاتی ہے

اروڑ:۔ اُن کی تعداد ایک ہزار ۲۰ ہے اور صرف رڑکی تحصیل میں رہتے ہیں

بوہرہ:۔ یہ ذات بھی اس قسمت میں خاص طور پر ملتی ہے اور سہارنپور میں اس ذات کے لوگوں کی تعداد ۳۸۷ تھی۔ ان کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مارواڑ سے آئے تھے اور یہ لوگ تجارت اور لین دین کا کام کرتے ہیں۔ بوہرہ کی اصطلاح کو عام طور پر مہاجن کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔

"جرائم پیشہ یا آوارہ گرد ذاتوں کی نمائندگی بھی اس ضلع میں اچھی تھی مثلاً ہبورہ سانسیا، نٹ، کایر اور ڈکوت، اگرچہ ان میں سے اکثر لوگ پولیس کے ... پہنچ سکنے سوال کرنے پر اپنی ذات کچھ اور بتلاتے ہیں۔

جین مت:۔ جین مذہب کے ماننے والے لوگ بھی اس ضلع میں ایک اہم اور بااثر فرقے کی حیثیت سے پائے جاتے ہیں اور ان میں بہت سے دولتمند زیر صحرائی جائداد کے مالک ہیں۔ ان کی تعداد میرٹھ کی کل قسمت میں بہت زیادہ ہے اور

ان کو عام طور پر سرد گی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان میں سے قریب قریب سب لوگوں کا تعلق بنیا ذات سے ہے اور چند مستثنیات کو چھوڑ کر باقی سب اگروال گوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلع کے ہر حصے میں ملتے ہیں۔ لیکن سہارنپور اور نکوڑ کی تحصیلوں میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کا تناسب تجارت اور ساہوکار کا کام کرنے والے لوگوں میں بہت زیادہ ہے اور غلّہ کی برآمد کی تجارت پر بھی بڑی حد تک یہی لوگ حاوی ہیں۔

(باقی)

علیگڈھ کے تالے اور دھات کی صنعت کا جائزہ

(مسلسل)

(۱۷) علیگڈھ میں دہات کے سامان کے فرموں کی مجموعی تعداد | علیگڈھ میں تالے اور دھات کے سامان بنانے والے کتنے فرم ہیں اس بات کا پتہ چلانے کے لئے میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول علی گڈھ سے رجوع کیا۔ ان کے پاس ایک فائل میں اس جائزہ کی نقل موجود تھی جو حکومت یوپی نے ۱۹۲۹ء میں اضلاع کی مقامی صنعتوں کے جائزہ کے سلسلہ میں علیگڈھ کی دھات کی صنعتوں کا کرایا تھا۔ اس جائزہ میں ۳۱۹ فرموں کے نام نام درج کئے گئے تھے اور مندرجہ ذیل باتوں کی صراحت ہر فرم کے بارے میں کی گئی تھی اس کا محل وقوع یعنی شہر کے کس محلہ میں واقع ہے۔ اس کے مزدوروں ملازموں، کلرکوں اور ایجنٹوں کی تعداد اکثر صورتوں میں ان کے نام کی صراحت کے ساتھ، ان کے مالکوں کے نام اور فرم کے کام کی نوعیت۔

اس جائزے کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ۳۱۹ فرموں میں سے ۱۹۵ کے مالک ہندو اور ۱۲۴ کے مسلمان تھے۔ ہندو مالکوں کے یہاں ہندو ملازمین کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی اور مسلمان مالکوں کے یہاں مسلمان ملازمین کی۔ لیکن ہندوؤں کے یہاں مسلمان بھی ملازم تھے اور مسلمانوں کے یہاں ہندو بھی۔ بعض کام مخصوص طور پر ہندو یا مسلمان کرتے ہیں اور ان کے کرانے کے لئے انہی لوگوں کو ملازم رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً ڈھلیا تقریباً تمام تر ہندو کولی تھے۔ مسلمان ڈھلائی والے بہت کم ہیں مشکل سے پانچ فی صدی نکلیں گے یہاں کی سرائے میں ڈیڑھ سو ڈھلیوں میں سے صرف دو مسلمان ہیں۔ ڈھلیے سب گوشت (خاص طور پر بکرے کی سری) کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں قلعی کا تقریباً

تمام تر کام مسلمان کاریگروں کے ہاتھ میں ہے۔ استاد کریم بخش نے یہ کام مسلمانوں ہی کو زیادہ سکھلایا۔ اس لئے قلعی کے کاریگروں میں ہندو صرف ایک دو فیصدی ہوں گے اور قلعی کا کام کرانے والے ہندو مالک بھی مسلمانوں سے کام لینے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوہے کا گرم کام (بھٹی کا) زیادہ تر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔ محنت کا کام ہے۔ بھٹی کے سامنے بیٹھنا اور لوہے کو کوٹنا پڑتا ہے۔ گرم کام کرنے والوں میں سارے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ملے گی۔ سندھ، سرحد، بلوچستان ریلوے کے تمام بڑے کارخانوں میں۔ تالے کے کام میں مسلمان گھیر بنانے والے تقریباً سو فی صدی۔ اسی طرح چابی اور کڑے بنانے والے بھی سو فی صدی۔ سروتا قینچی چاقو بھی شہر علیگڈھ میں زیادہ تر مسلمان ہی بناتے ہیں۔ سیٹیاں بنانے کا کام بھی تقریباً سو فی صدی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کا موجد ننھے خاں کو سمجھنا چاہئے۔ ٹرنک کے کاریگر بھی مسلمان ہی ہیں۔ دہلی آگرہ اور الہ آباد میں بھی یہ کام مسلمان ہی کرتے ہیں۔ لیٹر بکس بنانے والے بھی مسلمان ہیں۔ ٹین کے کام میں بھی مسلمان زیادہ ہیں۔ سب سے زیادہ ہوشیار استاد عبد الغفور ہیں۔ ٹنکی، بڑے کنستر وغیرہ بناتے ہیں۔

لیکن مہر کھدائی کے کام میں ہندو زیادہ ہیں۔ اس جائزہ میں ۳۱ فرموں میں صرف تین مسلمان فرموں کو دکھلایا گیا ہے۔ تالے کے کام میں بھی ہندو زیادہ ہیں۔ چنانچہ ۱۶۹ تالے کے فرموں میں سے ۱۰۵ فرمیں ہندوؤں کی دکھلائی گئی ہیں۔ ان میں بڑھئی جو اپنے آپ کو پنڈت کہتے ہیں، اس کام میں بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ بلڈنگ فٹنگ کے کام بھی ہندو کارخانہ دار آگے بڑھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بیس کی مجموعی تعداد میں صرف پانچ فرمیں مسلمانوں کی دکھلائی گئی ہیں۔ خراد کے کام میں تقریباً برابر برابر ہیں۔

لیکن اس جائزہ کی ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ اس میں فرموں کی کوئی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ جانسن کا کارخانہ اور گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول بھی اس میں شامل کیا گیا تھا اور دو

تین کاریگروں کو اپنی چھوٹی سی دوکان پر بٹھا کر تالے تیار کرنے والے چابیاں بنانے والے مہر کھدائی کرنے والے، قلعی اور پالش کرنے والے، استاد ڈھلئے وغیرہ بھی شامل تھے۔

اس جائزہ کی رہنمائی میں میں نے مدار دروازہ، ہاترس روڈ، جین پوری، سرائے مان سنگھ سرائے پختہ کے فرموں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے جا کر کیا۔ یہ سب فرمیں زیادہ تر چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں جن میں استاد کاریگر اپنے تین چار مددگاروں کے ساتھ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ دوکان چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے، کچھ کا کام ختم ہو گیا تھا، کچھ نے ٹھیکیداروں یا گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول میں ملازم کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ضرورت ایک دوسرے قسم کے جائزہ کی تھی جن میں کارکنوں کی مختلف حیثیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعداد و شمار مہیا کئے جاتے۔

جائزہ کی اسی فائل میں ایک فہرست علیگڑھ کے اہم تالے کے کارخانوں کی بھی رکھی ہوئی تھی جس میں ۵۹ فرموں کے نام درج تھے۔ ان میں سے تیرہ تو وہی تھے جن کا ذکر اسٹور پرچیز اور ڈائرکٹر آف کنٹریکٹس آرمی ہیڈ کوارٹرز کی پسندیدہ فرموں کی فہرست میں کیا جا چکا ہے اور ان کا شمار کاروبار کے پیمانہ کے لحاظ سے اول یا دوم درجہ کی فرموں میں کیا جا سکتا ہے۔ بقیہ یا تو دوسرے درجہ کی فرمیں تھیں یا ان کی حیثیت مشتبہ سی تھی۔ یا پھر وہ محض استاد کاریگر تھے جو بہت چھوٹے پیمانہ پر چند مددگاروں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ غرض اس فہرست سے بھی میرا کام نہیں چل سکا۔ پھر اس فہرست میں چونکہ محض فرموں کے نام درج تھے اور دوسری کوئی تفصیلات نہیں تھیں، اس لئے محض اس فہرست کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ نہ لگایا جا سکتا تھا کہ کون سی فرم مسلمانوں کی ہے اور کون سی غیر مسلموں کی۔

میں چھوٹی صنعتوں کے بارے میں، اپنے سوال نامہ کے مطابق معلومات اکٹھا کرنا چاہتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اس کے سوال (۲) کی روشنی میں مسلمانوں کی حیثیت کا جائزہ

لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس قسم کی تحقیقات کے لئے جس قدر محنت اور وقت درکار تھا اس
کو صرف کرنے کا مجھے موقع نہ تھا۔ اس لئے میں نے نامکمل تحقیقات پر ہی قناعت کی۔ اس
سوال نامے کے عنوان "مزدور دستکار" کے بارے میں بہت سی باتیں مومن انصار برادری
کے حالات۔ کے تحت ملیں گی کیونکہ اس حیثیت سے اس برادری کے بہت سے لوگ اس
کام میں لگے ہوئے ہیں۔ مزدور دستکاروں کے کام کی نوعیت اس صنعت میں مختلف قسم
کی ہے۔ مثلاً تالے کی تیاری کے سلسلہ میں کئی مختلف قسم کے کاموں کی ضرورت ہے یعنی ڈھلائی
کا کام، گھیر، کڑے اور چابی بنائی کے کام، تالے کے جوڑنے اور فٹ کرنے کا کام جس میں
گھیر یعنی پتے کی ڈبیا بنانا، کھونٹی اور کڑے کا فٹ کرنا لیور اور کنجی کو ٹھیک کرکے چلانا سب
شامل ہوتے ہیں، قلعی کا کام اور ربٹ کرکے تیار کرنے کا کام وغیرہ۔ تالے کے علاوہ دھات کے
اور دوسرے سامان تیار کرانے میں بھی تقریباً یہی صورت ہے۔ البتہ مہر کی کھدائی کے کام کی
ایک جداگانہ نوعیت ہے۔ شروع میں ڈھلائی اور آخر میں قلعی کی اکثر کاموں میں ضرورت پڑتی
ہے اور ان سب کاموں میں کم و بیش استاد کاریگر کے ساتھ کچھ شاگرد یا غیر ماہر مزدور لگے رہتے
ہیں۔ مثلاً ڈھلائی کے کام کو لیجئے۔ اس میں ایک دھونکنے والا مزدور چاہئے جسے میری تحقیقات
کے زمانہ میں ۱۲ ر تا ۱۴ ر مزدوری مل رہی تھی اور ایک مٹی پیسنے والا لڑکا جسے ۵ ر سے ۱۲ ر تک مزدوری
مل رہی تھی۔

اس زمانہ میں، ڈھلیتوں کی مانگ اور تمام کاریگروں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ یہ لوگ
۹۰ سے لے کر ۱۵۰ ماہوار تک کما رہے تھے۔ ایک ایک ٹھکیدار (اور اس میں مسلمان اور ہندو
دونوں شامل تھے) سات سو روپے سے لے کر ڈیڑھ ہزار روپے تک پیشگی رقم دے کر ڈھلیتوں
کو اپنا پابند بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان لوگوں کا کام بہت سخت ہوتا ہے۔ اس کام کو تقریباً
تمام تر ہندو کوطی کرتے ہیں۔ مسلمان بمشکل دو تین فی صدی کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ روپیہ
خوب خرچ کرتے ہیں۔ بکرے کی سری کھاتے، شراب پیتے، جوا کھیلتے اور عیاشی کرتے ہیں،

ان میں کچھ ایسے سمجھدار بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے شاید دس فی صدی ہو۔ روپیہ جمع کررہے ہیں۔ اور مکان وغیرہ کی مرمت کررہے ہیں ورنہ زیادہ تر ٹھیکیداروں سے پیشگی لیتے اور اسے بے دردی کے ساتھ اڑاتے ہیں۔ ان کی خام آمدنی اور لاگت کے مندرجہ ذیل نقشے سے ان کی خالص آمدنی کا اندازہ کیا جاسکے گا۔

آمدنی :-

ٹھیکیداروں کے لئے ۱/۲ ۴ اور ۲ تالوں کے لئے شرح = عـ۵ فی من

ٹھیکیدار اس میں سے ذیلی ٹھیکیداروں یا ڈھلیتوں کو شرح عـ۵ فی من کی دیتا ہے۔

ملواں تالوں کے ٹھیکہ میں ۱/۲ ۴ کے تالے کم ڈھالے جائیں گے اور ۲ کے زیادہ۔ فرض کیجئے ۱۵ سیر بڑے اور ۵ سیر چھوٹے تالے یعنی روزانہ بیس سیر تالے ایک ڈھلیا تیار کرلیتا ہے تو اس صورت میں عـ۵ فی من کی شرح سے عـ۵ ر بڑے ٹھیکیدار کو اور عـ ڈھلیتے کو مل سکیں گے۔

لاگت :-

۱۔ کوئلہ روزانہ ۱۲ سیر در للعہ فی من	۴/
۲۔ بہروزہ ڈیڑھ پاؤ روزانہ در عـ فی سیر	۵/
۳۔ ارنڈی کا تیل ۳ چھٹانک	۵ ر
۴۔ ریت، بیلی کمہاروں کے استعمال کی	×
۵۔ ولائتی کھریا کی مٹی ۲ گریاں	۲ ر
۶۔ سانچے، دھوکنی چمٹا، پگھلانے کا برتن وغیرہ	
۷۔ مزدور دھوکنے کے لئے ایک لڑکا۔	۱۴ ر
۸۔ مٹی پیسنے کے لئے لڑکا	۵ ر
میزان	للعہ ر با یوں کہئے للعہ

اس لئے ڈھلیتے کو خالص آمدنی للعہ یومیہ یعنی اعـ۵ ماہانہ۔

ڈھلیوں کے ریٹ اس زمانہ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ جس چیز کو پہلے وہ ۵ ر فی درجن ڈھالتے تھے اب آ سے ۲ ارفی درجن ڈھال رہے تھے۔ ۲ اور ۲ انالوں کی ڈھلائی ۱۰ ر درجن تھی ۳-۲ کی عہ ر درجن اور ۲ کی ۴ ر درجن۔

تالا جوڑنے والے کی مزدوری۔ معمولی کام کرنے والے عہ ر عہ ر، بڑھیا کام کرنے والے عہ ر عہ ر، جنگ کا کام کرنے والے للعہ۔ تنخواہ دار صہ رسہ ر ماہوار کمارہے تھے۔ تالا جوڑنے والوں میں ساٹھ فی صدی مسلمان کام کرنے والے ہیں۔ پیتل کا کام خصوصیت کے ساتھ مسلمان کرتے ہیں۔ اس میں یہ نوے فی صدی ہیں، ہندوؤں میں بڑھئی قوم کے لوگ زیادہ ہیں۔ لوہے کا کام ہندو زیادہ کرتے ہیں مسلمان شاید صرف ۱۵ فی صدی ہیں۔ مسلمان کاریگر سینما زیادہ دیکھتے ہیں۔ ۲۵ فی صدی جوا بھی کھیلتے ہیں اور شراب بھی دس فی صدی پیتے ہوں گے۔

بڑھئی ہندو ہیں جو اپنے آپ کو پنڈت کہتے ہیں اور وہ لوہے کے کام کرتے ہیں۔ ان کی حالت بہت اچھی ہے۔ بمشکل دس فی صدی سینما جاتے ہوں گے۔ جُوا وغیرہ بہت کم کھیلتے ہیں۔ بُری عادتیں بہت کم ہیں۔ ان کے مکان پختہ اور دو منزلہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی اولاد میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں میں تعلیم کی اشاعت زیادہ ہے۔ ان کا لباس بہتر ہوگیا ہے۔ ان کے اندر عزّت نفس بڑھ گئی ہے۔ آریہ سماج نے بھی ان کی زندگی میں اصلاح کرنے میں حصہ لیا ہے۔ حکومت کی طرف سے چھوٹے کاریگروں کی جو حوصلہ افزائی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے وہ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کے آدمی گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول میں ہیں جو اپنی برادری کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ان میں سے بہت سے لوگ گرد و نواح کے دیہات میں بھی آباد ہیں اور اپنے گھر پر کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوؤں میں گاؤں سے جو لوگ تالہ بنا کر لاتے ہیں ان میں گڈریے، کھٹیک اور دوسری ذاتوں کے ہندو بھی شامل ہیں۔ دیہات کے کام کرنے والوں سے تالے خریدنے کے لئے علیگڑھ میٹل ورکنگ اسکول کی طرف سے تحصیلوں میں سب سنٹر کھولے جاتے تھے جن سے ہندو کاریگروں

کی تعداد کے اس لائن میں بڑھنے کا امکان پایا جاتا تھا۔

چابیاں بنانے والوں میں سب مسلمان ہیں۔ ہندو ایک بھی نہیں ہے۔ مزدوروں کی اوسط آمدنی روزانہ ۔ ۱۲/ اور بڑھیا کام کرنے والوں کی ۲/ روزانہ ہو جاتی تھی۔ ان میں سے فی صدی پچاس کے قریب جوا کھیلتے ہیں۔ زیادہ عمر کے علاوہ باقی سب سینما دیکھتے ہیں۔ شراب بھی ۲۵ فی صدی پیتے ہیں۔ اس کام میں مومن انصار زیادہ ہیں۔ پٹھان کم ہیں اور بھشتی بھی ہیں۔

تالا جوڑنے والوں میں مسلمانوں میں سب [illegible] کے لوگ ہیں۔ انصار زیادہ ہیں۔ انصاری دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جلاہے دوسرے [illegible] رہے۔ پچاس فی صدی انصار ہیں۔ باقی شیخ پٹھان بھشتی ہیں۔

جنگ کے کام (مکسوئے وغیرہ) بنانے والوں میں بھی مسلمان زیادہ ہیں۔ ۲/ سے لے کر ۵/ تک مزدوری مل جاتی ہے۔ ان کی عادتیں بھی دوسرے مسلمان کام کرنے والوں جیسی ہیں۔ جنگ کے کام میں عورتیں بھی بہت لگی ہوئی ہیں۔ یہ گھر کے اندر بیٹھ کر کام کرتی ہیں۔ لیکن مسلمان دستکاروں کی آمد و خرچ اور گھر کی زندگی میں کوئی توازن نہیں ہے۔ ان کی عورتیں سلیقہ مند نہیں ہیں۔ ان میں تعلیم نہیں ہے۔ ان کی اولاد کی تربیت خراب ہے اور ان کے اندر ترقی کی کوئی علامات نظر نہیں آتیں

کارخانہ دار مزدور کاریگروں سے تین طرح پر کام لیتے ہیں:-

(۱) کم سے کم ایک مہینہ کی پیشگی دے کر اپنے کارخانہ میں بٹھا کر ان سے کام لیتے ہیں۔

(۲) روپیہ پیشگی دیتے ہیں [illegible] واپس کے طور پر آرڈر دیتے ہیں اور بعد میں مال لیتے ہیں۔ کچا مال بالکل اپنے پاس سے [illegible] دیتے۔ کاریگر اپنے طور پر اپنے گھر پر کام کرتا ہے۔

(۳) دیہات میں کام کرنے والوں کو [illegible] کچا مال اپنے پاس سے دیتے ہیں۔ روپیہ بھی پیشگی اجرت کے طور پر بلکہ اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر ان سے مال منگاتے ہیں۔

(نوٹ) ڈھلائی میں اجرت بحساب [illegible] وقت پر کام لینے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ صرف تالے کے جانچ کرنے والے، لکھنے پڑھنے والے اور گھومنے پھرنے والے لوگ تنخواہ [illegible] ملازم رکھے جاتے ہیں

گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول میں اس قسم کے کام کرنے والوں کی تنخواہ کی شرح حسب ذیل تھی :۔

قلی ماہوار اجرت = [illegible] ماہوار اور [illegible] گرانی الاؤنس

جانچ کرنے والا (اگزامنر) = [illegible] ماہوار اور [illegible] گرانی الاؤنس

ٹیکنیکل اسسٹنٹ = [illegible] ماہوار

محاسب ماہوار۔ اجرت = [illegible] تا ۱۱ر ماہوار

سپروائزر آف اسٹورز اینڈ اکاؤنٹس = [illegible]

گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول ہی میں اس کے سپرنٹنڈنٹ کی زیر نگرانی ایک دست کاروں کی بھرتی کا دفتر قائم تھا جس میں بھرتی کے لئے حسب ذیل ماہوار تنخواہوں کی شرح کا اعلان کیا جارہا تھا :۔

فٹر = [illegible] لوہار = [illegible] خرادی = [illegible] کلرک = [illegible] راج = [illegible] مزدور یعنی کنکریٹ کا کام کرنے والا = [illegible] ٹانکا لگانے والا = [illegible] درزی = [illegible] ڈرائیور = [illegible] اسکول ماسٹر = [illegible] بوٹ بنانے والے = [illegible] الکٹریشین [illegible] اسٹیم اور آئل انجن ڈرائیور = [illegible]

"مزدور دستکار" کے بعد سوال نامہ [illegible] کے سوال (۲) میں دوسرا عنوان "دوکاندار دستکار (الف) آزاد (ب) پابند یا باقی دار کا ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کا رجحان یا تو شکمی ٹھیکیدار یا مزدور دستکار" بننے کی طرف رہتا ہے۔ مؤخر الذکر صورت میں ان کے بارے میں تمام وہی باتیں کہی جاسکتی ہیں جو مزدور کاریگر کے بارے میں اوپر کہی گئی ہیں اور اول الذکر صورت میں ان کو "دوکاندار غیر کاریگر" کے عنوان کے تحت لایا جاسکتا ہے۔ میری تحقیقات کے زمانہ میں "دوکاندار غیر کاریگر" چھوٹے تاجر یا ساہوکار کے عنوان کے تحت بہت سے لوگ رکھے جاسکتے تھے۔ سرکاری ٹھیکوں سے نفع کمانے کے لالچ میں بڑے ٹھیکیداروں کے پیچھے بہت سے شکمی ٹھیکیدار پیدا ہوگئے تھے بڑے ٹھیکے داروں کو جو آرڈر ملتے تھے ان کے ایک حصے کو اپنی براہ راست نگرانی میں کاریگروں سے تیار کراتے تھے اور دوسرے حصہ کو ان شکمی ٹھیکیداروں کے درمیان تقسیم کر دیتے تھے اور ان سے

مقررہ وقت کے اندر مقررہ کوالٹی کا مال مہیا کرنے ورنہ ہرجانہ ادا کرنے کا معاہدہ لکھاتے اور ان سے اس بات کی ضمانت لیتے تھے۔ جنگ سے پہلے بھی علیگڑھ کے تالوں کی مانگ نے غیر کاریگر دوکانداروں کے ایک طبقہ کو پیدا کردیا تھا اُن میں سخت باہمی مقابلہ جاری رہتا تھا اور بہت کم لوگ کامیاب ہوجاتے تھے۔ ان میں سے اکثر اس چکی کے اندر جس کے اوپر کا پاٹ بڑے ٹھیکیدار اور نیچے کا پاٹ مزدور اور کچا مال فراہم کرنے والا دوکاندار ہوتا تھا پس جاتے تھے۔ جنگ سے پہلے اس گروہ میں زیادہ تر چھوٹی حیثیت کے بنیوں اور اس طبقہ کو جس نے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا اپنا پیشہ بنالیا ہے شامل کئے جاسکتے تھے۔ اسی گروہ میں بعض وہ چلتے پرزے بھی شامل تھے جو جلد دولتمند بن جانے کے لالچ میں بے ایمانی کے ساتھ کام کرتے تھے اور علیگڑھ کی صنعت کے لئے بدنامی کا باعث تھے۔ لیکن جنگ کے زمانہ میں ان ایجنٹوں اور بنیوں کے علاوہ کچھ دوسرے اور ایسے لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں قسمت آزمائی شروع کر رکھی تھی جن کو اس صنعت کا بالکل کوئی تجربہ نہیں تھا اور غالبًا ایسے لوگوں کو بہت کم کامیابی نصیب ہو رہی تھی۔ اس طبقہ کے تقریبًا تمام لوگ روپیہ لگاتے ہیں یعنی کاریگروں کو پیشگی رقم دے کر اور ان کو ان کے گھر پر بٹھا کر ان سے کام لیتے ہیں ان کا اپنا ذاتی کوئی کارخانہ نہیں ہوتا اور عمومًا ان کے فرم کی کوئی مستقل حیثیت بھی نہیں ہوتی۔ ان کے فرم کے وجود کا ثبوت ان کے خط لکھنے کے چھپے ہوئے کاغذ ہوتے ہیں جن پر نہایت شاندار طریقہ سے ان کے فرم کا نام اور پتہ درج ہوتا ہے۔

اس کے بعد باقاعدہ کارخانہ داروں کا عنوان آتا ہے۔ جس کی دو مزید تقسیمیں ہیں یعنی ایک ایسے کارخانہ دار جو اس فن سے واقف ہیں اور جن کا یہ صنعت آبائی پیشہ ہے ان کے لئے "استاد کارخانہ دار" کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے اور دوسرے وہ جو محض ساہوکار اور تاجر اور منتظم کی حیثیت سے کارخانہ کھولتے ہیں اور ان کے لئے "ساہوکار کارخانہ دار" کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کی چونکہ مستقل حیثیت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے بارے میں نامور چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ پہلے استاد کارخانہ داروں کو لیجئے۔

۱۔ عبدالعلیم اینڈ سنسز گرانٹ ٹرنک روڈ بنادیوی۔ دو سو تین سو آدمی کام کرنے والے

اور مشین کا کام۔ نہایت کامیاب فرم ہے۔ جنگ کے زمانہ میں سرکاری ٹھیکوں کے سلسلہ میں اس فرم کی عزت و شہرت اور بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سرکاری کام کے سلسلہ میں استاد کاریگروں کے زمرے میں دور دور تک اس کا کوئی حریف اور مد مقابل نہیں تھا۔

۲۔ ایس۔ ایس۔ ڈی۔ برادرز۔ شمس الدین ولد رحیم الدین محلہ قر... اپر کوٹ ساٹھ ستر آدمی کام کرتے ہیں مشین کا کام بھی ہے۔

۳۔ بشیر اور مصطفےٰ۔ کٹشرہ۔ پنچ اور پریس سے کام کرتے ہیں۔ تجوریوں کے قبضے، لٹو وغیرہ سپلائی کرتے ہیں۔ بیس پچیس آدمی کام کرنے والے

۴۔ امام الدین ٹنٹن پاڑہ۔

۵۔ بابو لال کشن لال قطب کی سرائے۔ بیس آدمی کام کرتے ہیں۔ زیادہ تر دیہات میں کام بانٹ دیتے ہیں۔

۶۔ ہردیو ٹینیٹ لاک فیکٹری۔ سودا ما پوری۔ ۵۰ آدمی ہر وقت کام کرتے ہیں لیکن مشین سے کام زیادہ ہوتا ہے۔

۷۔ سکھدیو B.T PAUAL نورنگ آباد۔ تیس چالیس آدمی پہلے سو آدمی تھے۔ ان کی ڈھلائی وغیرہ کے کام کی فیکٹری کانپور میں بھی ہوگئی ہے جس کی وجہ سے یہاں کا کام کچھ کم ہوگیا ہے۔

۸۔ کے۔ سی۔ روبی۔ نورنگ آباد۔ مالک ملوک چند شرما۔ ستر اسی آدمی۔

۹۔ کے۔ آر۔ شنتی۔ ہی لال کی سرائے۔ مالک بابو رام چند۔ ان کے گھر پر تو بیس پچیس آدمی کام کرتے ہیں لیکن ویسے کام بہت بڑا ہے۔ بانٹ دیتے ہیں۔

۱۰۔ درگا پرشاد سفید محل بابری منڈی مالک درگا پرشاد۔ بابو تارا چند کے لڑکے ہیں جو امام الدین کے یہاں مستری تھے۔ اب پچاس سے سو آدمی تک کام کرتے ہیں۔

اب ساہو کار کارخانہ داروں کو لیجئے:—

۱۔ موہن لال صاحب بیرسٹر کے بیٹے سریندر کمار کا کارخانہ۔ ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول

کے پاس۔ بہت بڑا کام ہے۔ فوج کے سپلائر ہیں۔ علیگڑھ میں یہ اور عبدالعلیم اینڈ سنز ہی دو فوج کے بڑے سپلائر تھے۔

۲۔ امپیریل میٹل ورکس حکیم کی سرائے۔ مالک نوبت رام۔ شروع میں ایجنٹ تھے۔

۳۔ ٹیکا رام اینڈ سنز (دویش) مدار دروازہ۔ ڈوبے کا پڑاؤ۔ ساہوکار کی حیثیت سے ترقی کی۔ اب کئی فیکٹریوں کے مالک ہیں۔

۴۔ ہوتی لال کھرنی کی سرائے۔ ان کی فیکٹری کھرنی کی سرائے سے پانچ چھ فرلانگ پر پلاگاؤں میں ہے۔ بٹن، ہکیں، بروچ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ جانسن کے یہاں پہلے کنٹریکٹر تھے۔ اب وہاں سے ہٹنے کے بعد بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا ہے۔ قریب دو سو تین سو آدمی کام کرتے ہیں۔

۵۔ یو۔ پی۔ ٹریڈنگ کمپنی۔ بابو کیشب دیو اور پریم دت مصرا۔ کام ایجنسی سے شروع کیا تھا۔ پچاس آدمی کام کرتے ہیں۔

۶۔ ڈائمنڈ جبلی ورکس۔ درگا پرشاد بھارگوا۔ سو آدمی کام کرتے ہیں۔

۷۔ پنڈت ہیرا لال جھا۔ نورنگ آباد۔ گورنمنٹ پوسٹل ورکشاپ میں کنٹریکٹر تھے۔ ایک ایک لاکھ روپیہ کی سپلائی کیا کرتے تھے۔ ان کے یہاں پانچ پانچ سو آدمیوں نے کام کیا ہے۔ اب گورنمنٹ کی لڑائی کی وجہ سے گھر کا کام کم کر دیا ہے۔

۸۔ گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول۔ یہ بھی نہایت بڑے پیمانہ پر تالے کی سپلائی کے کام کو اس وقت چلا رہا ہے۔ اس کے کام نے جتنی ترقی کی ہے ایسی علیگڑھ کے کسی کمپنی والے نے آج تک نہیں کی۔ اس کا انتظام للتا پرشاد صاحب تواری سپرنٹنڈنٹ میٹل ورکنگ اسکول کے ہاتھ میں ہے۔ اس اسکیم کی شروعات پنڈت پرشوتم پاٹھک جی نے کی ہے جو پہلے تالوں کے جانچ کرنے والے تھے۔ اب ترقی دے کر ان کو ٹیکنیکل اسسٹنٹ کر دیا گیا ہے۔ کام ۱۵ رجولائی ۴۲ء سے شروع کیا گیا تھا۔ ۷ رجولائی کو پاٹھک جی کا تقرر ہوا تھا اور ایک ہفتہ میں انھوں نے کام چلا دیا تھا۔

سوال نامہ ۱۲ کے سوال (۲) میں اس کے بعد کا عنوان "تھوک فروش تاجر اور ساہوکار" کا ہے۔ علیگڑھ میں ایسے تھوک فروش ساہوکار نہیں تھے جو بڑے پیمانہ پر باہر فروخت کرنے کے لئے مال کو تیار کراتے یا خریدتے ہوں اور اس کی فروخت کا کوئی باقاعدہ انتظام کرتے ہوں یہاں اس قسم کا بڑے پیمانہ کا کام صرف بڑے ٹھیکیدار کرتے ہیں جو زیادہ تر گورنمنٹ اور ریاستوں سے آرڈر حاصل کرتے اور ان کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔ بقیہ لوگ کم وبیش چھوٹے پیمانہ پر اپنے مال کو باہر بھیجنے اور اس کی نکاسی کا انتظام کرتے ہیں۔ البتہ یہاں کچھ ایسے تھوک فروش ساہوکار ضرور ہیں جو کچے مال کے بڑے سپلائر ہیں اور یہاں کے اکثر کاریگر اور کارخانہ دار اپنا سامان بنانے کے لئے ان سے کچا مال (لوہا پیتل وغیرہ) نقد اور ادھار خریدتے رہتے ہیں۔ ادھار عموماً ایسا ہوتا ہے جیسا بنک کے ذریعہ آج کل لیا جاتا ہے۔ ان کے نام ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ کیول رام۔ پڑاؤ ڈوبے لوہے پیتل کے بڑے تاجر
۲۔ گنگا پرشاد۔ گنگا گنج پڑاؤ ڈوبے لوہے پیتل کے بڑے تاجر
۳۔ چرنجی لال۔ مانک چوک لوہے پیتل کے بڑے تاجر
۴۔ منشی لال دولت رام۔ کنوری گنج چھیپٹی لوہے پیتل کے بڑے تاجر
۵۔ گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول۔

گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول کو ایک معنی میں بڑی حد تک صحیح نمائندہ اس عنوان کا سمجھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ کچا مال کاریگروں اور کارخانہ داروں کو مہیا کرتا اور مصنوعہ مال ان سے لے کر باہر فروخت کرنے کے لئے اسٹور کرتا ہے۔ لیکن دوسرے معنی میں اس کی حیثیت ایک خریدنے والے سرکاری ایجنٹ کی سی ہے۔ بہرحال گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول کے پاس کچے مال کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا جسے وہ کنٹرول کی قیمتوں پر اپنے کاریگروں کو اڈوانس کررہا تھا۔ اس میں حسب ذیل چیزیں شامل تھیں۔

۱۔ پیتل کے ٹوٹے پھوٹے برتن جو مرزاپور سے منگائے جاتے تھے ۲۔ لوہے کی کترن

"۱/۸ و "۱/۴ و "۳/۱۶ اور چادریں (یعنی بڑی کترنیں) ٹاٹا نگر سے ۳۔ گیلونائزڈ آئرن وائر تار و ع۔
پیتل کا تار ۱۲ ۱۶ ۱۹ سنگ بھوم سے۔ ۴۔ ایم۔ ایس۔ راؤنڈس "۵/۸ و "۳/۸ و "۱/۴ ٹاٹا نگر سے۔
۵۔ جستہ (زنک) ریواڑی سے ۶۔ نوشادر بمبئی سے + ۷۔ کوئلہ بہار یا بادانی گنج سے۔

یہ تمام مال سرکاری قیمتوں پر فروخت کیا جاتا تھا۔ اور سب [illegible] لیے سرکاری قیمتیں پہلے سے مقرر کردی گئی تھیں اس پر مال خرید لیا جاتا تھا۔

اوپر کے بیان میں ٹھیکیداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کو یہاں خاص اہمیت حاصل ہے جب سے گورنمنٹ کا اسٹور زپرچیز ڈپارٹمنٹ قائم ہوا ہے۔ سرکاری ضرورت کا بیشتر سامان انہی ٹھیکیداروں کی معرفت خرید ا جانے لگا ہے۔

ٹھیکیدار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بڑے اور شکمی۔ بڑے ٹھیکیدار کو اگر ۲۵ فی صدی کی بچت ہوتی ہے تو چھوٹے ٹھیکیدار کو اس میں سے ۱۲ ۱/۲ فی صدی تک مل جاتا ہے۔ اور جب چھوٹے ٹھیکیدار یا کارخانہ دار براہ راست آرڈر لے آتے ہیں تو پھر سب منافع ان ہی کو مل جاتا ہے۔

آدھے ٹھیکیدار مسلمان ہیں آدھے ہندو ہیں۔ ہندوؤں میں ویش اور پنڈت وغیرہ برادری کے ٹھیکیدار ہیں۔ مسلمانوں میں زیادہ تر لوہار، پٹھان اور شیخ برادری کے لوگ ہیں۔ مومن انصاریوں میں مشکل سے ایک دو ہوگا۔ یہ سب حنفی ٹھیکیدار ہیں۔ بساطیوں میں بھی ایک دو ہیں مثلاً فضل حق قصائی قریشیوں میں بھی دو ایک ہیں۔

ہندوؤں میں تو جنگ کے زمانہ میں بعض ٹھیکیداروں نے کئی کئی لاکھ پیدا کرلئے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی دو ایک نے کئے ہیں۔ عام طور پر مسلمان ٹھیکیداروں میں کوئی بری عادتیں نہیں ہیں کچھ لوگ جو بوجہ جنگ زیادہ کمانے لگے ہیں۔ ان کی طرز معاشرت ضرور اسراف کی طرف مائل ہوگئی ہے اور ان میں لغو عادتیں بھی کافی سے زیادہ پیدا ہوگئی ہیں طوائفوں میں بھی جانے لگے ہیں چنانچہ ان میں سے ایک کا نام "نواب ۴۲ء" مشہور ہوگیا ہے۔ جنھوں نے کہا جاتا ہے کہ نوٹوں اور سکوں کا ہار ایک طوائف کے گلے میں ڈالا تھا۔ ورنہ عام طور سے طرز معا[illegible] عقد[illegible] کی جانب ہے۔ عموماً شرع

اور صوم صلوٰۃ کے پابند ہیں۔

(۷ ii) علیگڑھ کے ممتاز مسلمان تالے والے | علیگڑھ کے تالے اور دھات کی صنعت کا جائزہ ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ایک فہرست علیگڑھ کے ممتاز مسلمان تالے والوں کی پیش کردی جائے ان کی حیثیت کے بارے میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان معلومات کے لئے میں تمام تر عبدالعلیم صاحب مالک عبدالعلیم اینڈ سنز کا ممنون احسان ہوں۔

۱۔ نظام الدین اینڈ سنز۔ مانک چوک حیثیت پچیس تیس ہزار۔

۲۔ حافظ محمد اسمعیل اینڈ سنز۔ عودیا باغ حیثیت ایک لاکھ روپے۔

۳۔ عبدالعلیم اینڈ سنز متصل سٹی مسلم اسکول حیثیت سات آٹھ لاکھ (یہ حیثیت عبدالعلیم صاحب نے خود نہیں تبلائی بلکہ باہر کے لوگوں کی تبلائی ہوئی ہے)۔

۴۔ حاجی عبدالرحیم بخش ٹیٹا والے سرائے بی بی۔ حیثیت بیس پچیس ہزار

۵۔ شیخ الہ دین اینڈ سنز مدار دروازہ حیثیت دس بارہ ہزار پرانا کارخانہ تقریبا چالیس سال کا

۶۔ محمد صدیق اینڈ سنز حیثیت دس پانچ ہزار

۷۔ رحیم الدین متصل قبرستان۔ کنوری گنج۔ حیثیت دو لاکھ کی۔ انیٹی لاک ورکس۔ انھوں نے کلکتہ اور بمبئی میں دو دکانیں قائم کرائی ہیں۔ ان کے یہاں پچاس برس سے کاروبار جاری ہے۔

۸۔ حافظ رفیع الدین اینڈ سنز بالائے قلعہ حیثیت بیس ہزار | لیکن یہ دونوں ہمت والے لوگ ہیں۔ لاکھ

۹۔ محمد نسیم صاحب بسالہ امپیریل لاک ورکس بالائے قلعہ حیثیت دس پندرہ ہزار | تک کا کاروبار کرسکتے ہیں۔

۱۰۔ محمد بشیر عبدالصمد صاحب باہری منڈی حیثیت پچاس ساٹھ ہزار بمبئی میں ان کی دوکان ہے۔ جس نے خاصی ترقی کی ہے۔

۱۱۔ حافظ اللہ بخش اینڈ سنز رنگریز باہری منڈی حیثیت پچاس ساٹھ ہزار لین دین کا کام بھی کرتے ہیں۔

۱۲۔ شمس الدین پسر رحیم الدین۔ ایس۔ ایس۔ ڈی برادرز متصل مسجد چھتاری محلہ بنی اسرائیل۔ حیثیت بیس پچیس ہزار۔

۱۳۔ حاجی حیدر بخش حاجی ننھے میاں محلہ بنی اسرائیل۔ حیثیت بیس پچیس ہزار۔ پرانا کام ہے۔ انھوں نے صفیں جانماز اور دری بطور ہدیہ مکہ بھیجی تھیں۔

۱۴۔ شائننگ لاک ورکس مالک عبد الشکور محلہ ٹنٹن پاڑہ حیثیت چالیس ہزار روپے۔

۱۵۔ امام الدین وزیر الدین محلہ ٹنٹن پاڑہ حیثیت بیس پچیس ہزار

۱۶۔ ننھے خاں اینڈ سنز سیٹی بنانے والے ٹنٹن پاڑہ حیثیت دس پندرہ ہزار

۱۷۔ محمد اسمٰعیل سیٹی بنانے والے ٹنٹن پارہ حیثیت ہزار دو ہزار لیکن بڑے تیز آدمی ہیں۔ دو دو سو ماہوار تک کما لیتے ہیں۔

۱۸۔ محمد اسحٰق سیٹی بنانے والے گھٹیا دربار اسٹریٹ ڈیڑھ دو ہزار

۱۹۔ عبد اللہ خاں نصیر اللہ خاں میٹل کا کام محلہ آتش بازاں حیثیت تین چار ہزار

۲۰۔ عبد الغنی عبد العزیز میٹل کا کام محلہ آتش بازاں حیثیت تین چار ہزار

۲۱۔ وحید یہ لاک فیکٹری تالے کا کام اور نیا کام میٹل کا بھی کرتے ہیں۔ محلہ چراغچی حیثیت پچیس تیس ہزار۔ بڑے تیز آدمی ہیں۔ ذاتی کوشش سے ترقی کی ہے۔

۲۲۔ احمد علی صمد علی تالے کا کام اور نیا کام میٹل کا بھی کرتے ہیں۔ بابری منڈی بیس پچیس ہزار ذاتی کوشش سے ترقی کی ہے۔

۲۳۔ نبی بخش کرم الٰہی۔ اس کا کاروبار ختم ہوگیا ہے۔ لیکن یہ علیگڑھ کا سب سے بڑا کارخانہ جانسن کے مقابلہ کا تھا۔ پانسو آدمی کام کرتے تھے۔ ستر اسی ہزار روپے روزانہ کیش خزانہ میں رہتا تھا۔ ان کا کارخانہ کالا محل کہلاتا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد کاروبار ختم ہوگیا۔ ان کا ایک لڑکا محمد بشیر عبد الصمد کے نام کی فرم میں شریک ہے۔ ان کے تین لڑکے اور ہیں وہ معمولی طریقے پر کام کر رہے ہیں۔ سب پیسہ ان کے جانشینوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔

۲۴۔ تالے کے ایک اور بڑے موجد جن کا کاروا ب ختم ہوگیا ہے۔ منشی عبدالوحید تھے۔ ان کے لڑکے عبدالوحید صاحب ہیں۔ ان کے پاس تالے کا کاروبار اب نہیں ہے یہ عبدالعلیم اینڈ سنز میں کام کرتے ہیں۔

۲۵۔ نور محمد بالائے قلعہ۔ ان کے فرم کا کمرشل الیکٹرک ورکس ہے۔ بہت بڑا کاروبار الیکٹرو پلیٹنگ کا ہے۔ بجلی کا بہت سی قسموں کا سامان بنتا ہے جسے یہ باہر فروخت کرتے ہیں۔ علیگڑھ میں بجلی کا سامان فراہم کرنے والوں میں یہ سب سے بڑی فرم ہے۔ آج کل میٹل کا کام بھی کرتے ہیں اور لین دین کا کام بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی سٹی اسکول کے پاس ایک بڑا مکان بنوایا ہے حیثیت پچاس ہزار ہے

۲۶۔ علی محمد جے گنج۔ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام ہے۔ حیثیت پانچ سات ہزار۔

۲۷۔ ابن محمد ننھے خاں دہلی دروازہ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام حیثیت پچیس تیس ہزار

۲۸۔ مصطفٰے اینڈ سنز دہلی دروازہ تالے کا کام کرنے والے حیثیت چالیس پچاس ہزار۔

۲۹۔ ایس فضل الدین اینڈ سنز عوریا باغ۔ گورنمنٹ کنٹریکٹر تالے آئرن اسٹیل کے۔ بندوق کی مرمت کا کام بھی ہوتا ہے۔ پانی کے پائپ کا کام، بلڈنگ فٹنگ کا سامان، چپراسیں بنتی ہیں۔ اسٹاشنری ... کا کام بھی ہے۔ آگ بجھانے کے پمپ بھی بن رہے ہیں۔ ان کا لڑکا پوسٹل سیل کے کام میں ٹھیکیدار ہے جس کا نام محمد رشید ہے۔ ان کی حیثیت پندرہ بیس ہزار ہے۔ بیچ میں ان کو نقصان ہوگیا تھا۔ بہت تیز آدمی ہیں۔

۳۰۔ محمد بخش سلیم الدین عوریا باغ تالے کا کام ستر اسی ہزار کی حیثیت ہے۔ اچھی فرم ہے۔ بڑی ساکھ ہے۔ باہر بھی اور یہاں بھی اور کاریگروں پر بڑا اثر ہے۔

۳۱۔ حافظ نظام الدین عوریا باغ پوسٹل سیل میں گورنمنٹ کنٹریکٹر ہیں۔ حیثیت دو تین ہزار پہلے بڑی حیثیت تھی اب سرمایہ بگڑ گیا ہے۔

۳۲۔ محمد صدیق دہلی دروازہ پوسٹل سیل میں گورنمنٹ کنٹریکٹر حیثیت دو تین ہزار۔ والد کو خاں صاحب کا خطاب ملا تھا۔ نیں اولاد کی حالت اتنی اچھی نہیں ہے۔

۳۳۔ عبد الحق محمد صدیق دہلی دروازہ۔ پرشیل سیل میں گورنمنٹ کنٹریکٹر ان دونوں بھائیوں کی حیثیت دو تین ہزار
(نوٹ) کسی زمانہ میں دہلی دروازہ میں آٹھ دس چوٹی کے کارخانے تھے سب ختم ہو گئے۔

۳۴۔ کلب مینوفیکچرنگ کمپنی۔ بالائے قلعہ میٹل کے گورنمنٹ کنٹریکٹر ہیں حیثیت تیس چالیس ہزار الیکٹرو پلیٹنگ کا کام بھی ہے۔ سب سے پہلے علیگڑھ میں بیرل (Barrel) کے ذریعہ الیکٹرو پلیٹنگ انھوں نے ہی شروع کیا۔

۳۵۔ حاجی منیر الدین حاجی نذیر الدین محلہ دوبے کا پڑاؤ لوہے کا کام کرنے والے حیثیت ستر اسی ہزار ان کی علیگڑھ میں اور باہر بڑی ساکھ ہے۔ یہ لوہے کی مختلف چیزیں بنا کر بھی بیچتے ہیں۔ مثلاً تالوں کے گھیر تالے کے کڑے، گھوڑے کے نعل وغیرہ۔ ان کے یہاں تالے بھی بنتے ہیں تالے کے میٹریل کو بہت بڑے پیمانہ پر سپلائی کرتے ہیں سب سے خوبی اور عزت کی بات یہ ہے کہ تمام صرافہ کی چاندی ان کے یہاں آکر کٹتی ہے۔ اس سے ان کی ساکھ کا پتہ چلتا ہے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں۔ ذاتی پیسے سے دوکان کے اوپر مسجد بنائی ہے۔ چاندی کی کٹائی کے تمام پیسے مسجد میں لگاتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرتے ہیں اور اس کمائی کو مسجد کی تعمیر میں لگاتے ہیں۔

۳۶۔ عبد الحکیم اینڈ سنز محلہ چھ پیٹی متصل قرش۔ الیکٹرو پلیٹنگ کا کام۔ حیثیت دو تین ہزار۔ نور محمد اور یہ ایک ہی خاندان سے ہیں اور ان کے والد تمام شہر میں الیکٹرو پلیٹنگ کے کام میں استاد مانے جاتے ہیں۔ تیزاب کی رنگائی اور سونے چاندی کے ملمع کا کام خاندانی ہے انہی کے یہاں سے یہ کام پھیلا ہے زیورات اور سامان پر انہی کے یہاں سے سونے چاندی کا ملمع شروع ہوا ہے۔ یہ لوگ ابتداءً دہلی دروازہ کے رہنے والے تھے۔ ۳۷۔ محمد اسمٰعیل سرائے سلطانی تالے کا کارخانہ حیثیت تین چار ہزار۔ ۳۸۔ ولی محمد سرائے سلطانی۔ چابی کا کام بہت بڑا تھا۔ اب کچھ میٹل کا کام شروع کر دیا ہے۔ حیثیت آٹھ دس ہزار۔ ۳۹۔ زاہد حسین ٹنٹن پارہ۔ براس ٹپ بناتے ہیں۔ ان کی مدراس میں تالے کی دوکان تھی۔ جنگ کے ہنگامے کی وجہ سے بند کر کے چلے آئے مدراس میں ان کا بہت روپیہ رہ گیا۔ موجودہ حیثیت چار پانچ ہزار۔ ان کے مورث اعلیٰ اچھے سیدوں میں تھے۔

۴۰۔ عبد الرحمٰن عبد السلام بالائے قلعہ تالے کا کام۔ بمبئی میں تالے کی دوکان ہے۔ ان کے لڑکے نے کئی دفعہ کاروبار بگاڑا سنبھالا ہے۔ اب حالت اچھی ہو گئی ہے۔ بیس پچیس ہزار کی حیثیت کے آدمی ہیں۔

(۴۱) رشید احمد انصاری۔ محلہ چراغ چیاں۔ تالے کا کام آٹھ دس ہزار کی حیثیت ہے۔

۴۲۔ عبدالغفور انصاری محلہ چراغ چیاں بیس ہزار کی حیثیت ہوگی۔

(نوٹ) انصاریوں میں اور بہت سے آدمیوں کے اچھے اچھے کام تھے لیکن اب ختم ہوگئے ہیں

۴۳۔ ایس نظام الدین اینڈ سنز ماموں بھانجہ تالے کا کام حیثیت چالیس پچاس ہزار۔

۴۴۔ عبدالمجید عبدالحفیظ کالا محل تالے کا کام حیثیت بارہ ہزار

۴۵۔ نظیر احمد ننھے خاں سرائے بی بی۔ تالے کا کام اور میٹل کا کام بھی۔ حیثیت آٹھ دس ہزار روپے

ان کے علاوہ اور بہت سے تالے کے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت اتنی کم ہے کہ کارخانہ داروں کی جگہ ان کا شمار کاریگروں میں کرنا زیادہ موزوں ہے۔

(نوٹ) اوپر جو حیثیت درج کی گئی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے پاس ذاتی سرمایہ اتنا موجود ہے۔ جائداد کی صورت میں، ساز و سامان کی صورت میں یا نقد لیکن اس ذاتی سرمایہ کے ذریعہ وہ کاروبار اس سے بہت زیادہ روپے کا بھی کر سکتے ہیں اور بہت کم کا بھی۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا ذاتی سرمایہ صرف ہزار دو ہزار ہے لیکن بازار میں ان کی ساکھ اچھی ہے۔ روپیہ کا ہیر پھیر کرنا خوب جانتے ہیں اور انھیں ماہوار دو دو سو کی آمدنی یعنی سو دو سو فی صدی منافع ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کے کاروبار میں زیادہ پائداری اور ثبات نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلہ میں جن لوگوں کی حیثیت زیادہ ہے ان کی آمدنی زیادہ مستقل اور پائدار ہو سکتی ہے اگرچہ ان کے منافع کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہوگی۔

(viii) گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول علیگڑھ | جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۱۹۲۶ء میں علیگڑھ میں گورنمنٹ میٹل ورکنگ اسکول قائم کیا گیا تھا۔ اس میں بجلی کی قوت محرکہ سے مشینیں چلائی جاتی ہیں اور طلبہ کو حسب ذیل کام سکھلائے جاتے ہیں تالا بنانا اور مہر کھودنا۔ پریس میٹل یعنی ڈائی اور پنچ کا کام۔ اب اس میں مشین کے ذریعہ خراد کا کام بھی کیا جانے لگا ہے۔ ٹھٹیرے کا کام، قلعی اور الیکٹروپلیٹنگ کا کام نمونہ سازی عمارت اور فرنیچر کی فٹنگ، ڈھلائی گرم بھٹی کا کام، جنرل فٹنگ، ڈرائنگ اور ڈزائن بنانا۔

میں اس بات کی کوئی باقاعدہ تحقیقات نہیں کر سکا کہ اس مدرسے سے متعلق سرکاری ملازمتوں اور طالب علموں کی جماعت میں مسلمانوں کا تناسب فی صدی کیا تھا لیکن بظاہر یہ تقریباً بمنزلہ صفر کے معلوم ہوتا تھا۔

[سرکار کے پورے وسائل کی طاقت اور کچے مال کا اجارہ اُسے ملا ہوا تھا] [کیونکہ نجی صناعوں کے مقابلہ میں] [میٹل ورکنگ اسکول کی طرف سے تالہ بنانے کے کام کے شروع کئے جانے کو علیگڑھ کے نجی صناع بہت اندیشہ اور فکر کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے] مسلمان صناعوں کو خصوصیت کے ساتھ شکایت تھی کیونکہ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طرف سے بالکل نئے لوگوں اور طبقوں کی ہمت افزائی اور مربیانہ سرپرستی کی جا رہی تھی جس سے تالے اور دھات کی صنعت کا پرانا توازن بگڑ گیا تھا۔ جنگ کے بعد ان نئے لوگوں کی دھات اور تالے کی صنعت میں کس طرح کھپت ہو سکے گی اور اس کی وجہ سے کن پرانے صناعوں کو اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر پریشان اور سرگرداں پھرنا پڑے گا یہ سوالات سخت خطرناک امکانات کا پتہ دے رہے تھے۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال　　عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	۲۵ " "	۲۵۰۰۰۰۰
ادا شدہ سرمایہ	۱۲ " ۵۰ ہزار روپے	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمہ کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے ، ایسٹرن فیڈرل ، آگ ، زندگی ، ریل و رسائل ، موٹر ، ہوائی جہاز کے خطرات ، مزدوروں کا مالی معاوضہ ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے ۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن ، لاہور ، بمبئی ، حیدرآباد دکن ، احمد آباد ، کانپور ، پشاور

فلسطین TEL-VIV

عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب

استاد قانون

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

قیمت مجلد، تین روپے آٹھ آنے

بادشاہ

یعنی

مکیاولی کی مشہور کتاب

پرنس کا اردو ترجمہ

از

ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب (ڈی فل ہائیڈلبرگ)

قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ دہلی

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

۱- قاعدہ ۴ر ۲- درس سبق ۴ر

- ۳- نماز ۴ر
- ۴- حکایتیں اول ۴ر
- ۵- 〃 دوم ۳ر
- ۶- حبیب خدا ۴ر
- ۵- نظمیں ۴ر
- ۶- میونسپلٹی ۴ر
- ۷- صدیق اکبر ۴ر
- ۸- خط کتابت ۴ر
- ۹- ضلع کا انتظام ۴ر
- ۱۰- قومی گیت ۴ر
- ۱۱- غزلیں ۴ر
- ۱۲- ہمارا ہندوستان ۴ر
- ۱۳- امامی بھی پڑھنے لگے ۴ر
- ۱۴- عمر فاروق ۴ر
- ۱۵- ڈسٹرکٹ بورڈ ۴ر
- ۱۶- شہید کربلا ۳ر
- ۱۷- ہماری دنیا ۴ر
- ۱۸- ایشیا ۴ر
- ۱۹- یورپ ۴ر
- ۲۰- قصہ فسانۂ عجائب ۴ر
- ۲۱- مثنوی میر حسن ۴ر
- ۲۲- گل بکاؤلی ۴ر
- ۲۳- چار درویش اول ۴ر
- ۲۴- 〃 〃 دوم ۴ر
- ۲۵- 〃 〃 سوم ۴ر
- ۲۶- چار درویش چہارم ۴ر
- ۲۷- قصہ حاتم طائی اول ۴ر
- ۲۸- 〃 〃 دوم ۴ر
- ۲۹- 〃 〃 سوم ۴ر
- ۳۰- 〃 منصور موہنا ۴ر
- ۳۱- 〃 فردوس بریں ۴ر
- ۳۲- لیلیٰ مجنوں ۴ر
- ۳۳- شکنتلا ۴ر
- ۳۴- تانگے والا ۴ر
- ۳۵- بھشتی ۴ر
- ۳۶- صوبے کی حکومت ۴ر
- ۳۷- حکومت ہند ۴ر
- ۳۸- جمہوریت ۴ر
- ۳۹- دوہے ۴ر
- ۴۰- دلچسپ شعر ۴ر
- ۴۱- مرثیے ۴ر
- ۴۲- مسدس حالی ۴ر
- ۴۳- حالی کی نظمیں ۴ر
- ۴۴- گنتی ۴ر
- ۴۵- بڑی گنتی ۴ر
- ۴۶- پہاڑے پیمانے ۴ر
- ۴۷- اجرت کا حساب ۴ر
- ۴۸- تنخواہ کا حساب ۴ر
- ۴۹- چاند تارے ۴ر
- ۵۰- نزلہ زکام ۴ر
- ۵۱- حالات قرآن مجید ۴ر
- ۵۲- تعلیمات 〃 (عقائد) ۴ر
- ۵۳- 〃 〃 (عبادات) ۴ر
- ۵۴- 〃 〃 (اخلاق) ۴ر
- ۵۵- 〃 〃 معاملات ۴ر
- ۵۶- قصص قرآن مجید ۱ ۴ر
- ۵۷- 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۵۸- کعبہ شریف ۳ر
- ۵۹- حدیث شریف ۴ر
- ۶۰- عثمان غنی ۴ر
- ۶۱- علی مرتضیٰ ۴ر
- ۶۲- صحابہ کرام ۱ ۴ر
- ۶۳- 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۶۴- 〃 〃 ۳ ۴ر
- ۶۵- 〃 〃 ۴ ۴ر
- ۶۶- 〃 〃 ۵ ۴ر
- ۶۷- خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۴ر
- ۶۸- حضرت غوث پاک ۴ر
- ۶۹- اجمیری خواجہ ۴ر
- ۷۰- نظام الدین اولیا ۴ر
- ۷۱- گوتم بدھ ۴ر
- ۷۲- کرشن کنھیا ۴ر
- ۷۳- رام کہانی ۱ ۴ر
- ۷۴- 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۷۵- افریقہ ۴ر
- ۷۶- امریکہ ۴ر
- ۷۷- جنوبی امریکہ ۴ر
- ۷۸- سرزمین ہند ۴ر
- ۷۹- صوبے ۴ر
- ۸۰- دیسی ریاستیں ۴ر
- ۸۱- داستان امیر حمزہ ۱ ۴ر
- ۸۲- 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۸۳- 〃 〃 ۳ ۴ر
- ۸۴- 〃 〃 ۴ ۴ر
- ۸۵- 〃 〃 ۵ ۴ر
- ۸۶- کہاوتیں ۴ر
- ۸۷- پہیلیاں ۳ر
- ۸۸- گرونانک ۴ر
- ۸۹- مثنوی میر حسن ۴ر
- ۹۰- گلستان ۴ر
- ۹۱- احمد خاں دکاندار ۴ر
- ۹۲- عبدالرحمٰن راج ۴ر
- ۹۳- نصیب خاں حجام ۴ر
- ۹۴- خدا خدمت گار ۴ر
- ۹۵- پیارے خاں درزی ۴ر
- ۹۶- حفیظ خاں خانساماں ۴ر
- ۹۷- جمن بڑھئی ۴ر
- ۹۸- سمدھو حلوائی ۴ر
- ۹۹- میرا ننھا ۴ر
- ۱۰۰- ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے ۴ر

مکتبہ جامعہ دہلی

رجسٹرڈ سر ایل ۸۹۲

WHAT SCIENCE CAN PRODUCE



PRODUCTS OF INTERNATIONAL STANDARD & QUALITY

CHEMICAL, INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES LTD., BOMBAY—8

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

تاریخ الامت (مکمل)

ازالحاج مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری پروفیسر تاریخ اسلام - سیرت پاک سے لے کر خلافت عثمانیہ تک سات جلدوں میں - اٹھویں جلد جو اسی سلسلے کی کڑی ہے - قرآن اور اسلامی تاریخ کے فلسفے پر حاوی ہے - قیمت مکمل سٹ ۱۵ر

پردۂ غفلت (ڈراما) ڈاکٹر سید عابد حسین　عمر
انتخاب میر - مولوی نورالرحمن　عمر
سیاسیات کی پہلی کتاب　۸ر
بادشاہ (پرنس کا ترجمہ)　ﷲ

نقش آخر (ڈراما) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی　عمر
باغبانی پروجکٹ (اسکولوں کے لئے)　۱۲ر
ہندوستانی کی پہلی کتاب　۸ر
عہد نبوی میں نظام مملکت　ﷲ

ننھی مرغابی
روٹی کس نے پکائی
جادو کا گھر
لومڑی کا گھر
بی مینڈکی اور کوا
بندر اور نائی
بیبو جیبو
پان کھا کر طبلہ بجائے
چل مرے مٹکے ٹمک ٹم
پھر مگیوں کیا خاک ؟
پکڑ دم کے ٹکو
تارا دھرمی تارا
بچوں کی کہانیاں
جگنو کی بتی

تانبیل خاں　۵ر
جیبو متو　۹ر
لال مرغی　۸ر
دو بھائی　۸ر
عقاب　۷ر
ایورسٹ کی داستان　۹ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ۱　۸ر
" " " ۲　۸ر
ترکوں کی کہانیاں　۸ر
دنیا کے بچے　۸ر
دنیا کے بسنے والے　۸ر
مقناطیس کی کہانی　۸ر
بجلی کی کہانی　۵ر
بجلی اور مقناطیس کی کہانی　۵ر
محنت ڈراما　۷ر

سمندر کا عجائب خانہ　۵ر　عمر
عقائد اسلام　۵ر　۴ر
ارکان اسلام　۶ر　۶ر
ہمارے نبی　۸ر　۶ر
ہمارے رسول　۸ر　۱۰ر
سرکار کا دربار　۵ر　عمر
سرکار دو عالم　۷ر　عمر
رسول پاک　۸ر　عمر
خلفائے اربعہ　۷ر　عمر
دس جنتی　۱۰ر　۱۰ر
نبیوں کے قصے　۱۰ر　۱۰ر
محاسن اسلام　۵ر　عمر
قومی نظمیں　۱۱ر　۸ر
بچوں کا کھلونا　۸ر　۱۲ر
شریر لڑکا (ڈراما)　۶ر

ہمارا مکمل پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۴۱ - نمبر ۳	بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے، آکسن - دیال پریس دہلی

وقف کی دینی حیثیت

دولت مند مسلمانوں نے جو اوقاف مختلف اغراض مثلاً مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں یا امام باڑوں پر کئے ہیں ان کی دینی حیثیت کیا ہے؟

یہ سوال کئی مخلص اصحاب نے مجھ سے کیا۔ اس لئے میں نے اس مسئلے کی تحقیق اور چھان بین کی۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر ائمۂ حدیث و فقہ کے نزدیک وقف کی شرعی حیثیت مسلم چلی آ رہی ہے۔ ان کے بیانات سے وقف کی جو حقیقت میں سمجھ سکا، وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے:۔

۱۔ کسی مال یا جائداد کو مالک اپنی ملکیت سے نکال کر ایک خاص غرض کے لئے روک دے کر اس کی آمدنی یا پیداوار اسی مخصوص غرض میں صرف کی جائے۔

۲۔ بہت سے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اس میں ابد تک کی شرط لگانی ضروری ہے۔ یعنی وقف ہمیشہ کے لئے ہونا چاہیے ورنہ صحیح نہ ہوگا۔

۳۔ وقف کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ کسی کو اس کا متولی بنا دے، اور اس سلسلۂ ولایت کا ہمیشہ کے لئے سامان کر جائے۔

۴۔ موقوفہ مال کی آمدنی یا موقوفہ جائداد کی پیداوار ابد الآباد تک واقف کی معینہ غرض کے سوا بشرطیکہ وہ دین کے خلاف ثابت نہ ہو کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہو سکے گی۔

۵۔ اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ وَلَا یُبَاعُ وَلَا یُوْھَبُ وَلَا یُوْرَثُ:۔ یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے، نہ بیچا جاتا ہے، نہ ہبہ کیا جاتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔

یہ وقف میرے نزدیک قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ اس میں جتنی صورتیں مال کے انتقال یعنی ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھ میں جانے کی بیان کی گئی ہیں، مثلاً خرید و فروخت، وصیت و

معاشرت، صدقہ وزکوٰۃ، ہبہ وخیرات وغیرہ ان میں کہیں اشارۃً یا کنایۃً ایسے وقف کا ذکر نہیں ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔

بعض فقہا نے اس کو وصیت میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ وصیت اور وقف میں دو نمایاں فرق ہیں۔

۱۔ وقف میں فقہاء کے بیان کے مطابق وقف کرنے میں مال واقف کی ملکیت سے خارج ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد وصیت کا مال دوسرے کے ہاتھ میں جاتا ہے

۲۔ وقف میں مال واقف کی ملکیت سے نکل کر کسی کی ملک نہیں ہوتا بخلاف اس کے وصیت میں موصی کے مرنے کے بعد موصیٰ لہٗ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔ اور اپنی خواہش کے مطابق اس کو صرف کرتا ہے۔

ایسی کوئی وصیت قرآن سے نہیں ثابت کی جاسکتی جس پر موصی کے مرنے کے بعد کسی کی ملکیت نہ رہے۔

اور وقف عقل کے خلاف حسب ذیل وجوہ سے ہے:۔

۱۔ مال وجائداد فطرتاً مملوک ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی کی ملکیت میں نہ ہوں۔ یہی دشواری تھی جس کی وجہ سے بعض فقہا کو یہ کہنا پڑا کہ مالِ موقوفہ کا مالک اللہ ہوتا ہے، اگر یہ صورت ہے تو پھر تصرف بھی اللہ ہی کا ہوگا، اور امام وقت جو حکومت الٰہی کا نائب ہوتا ہے اپنی صوابدید کے مطابق اس کو صرف کرے گا نہ کہ مردہ کی خواہش کے مطابق۔

۲۔ وقف کرتے ہی جب مال واقف کی ملکیت سے نکل گیا تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اب اس پر اس کا تصرف باقی نہیں رہا۔ یہ بیک وقت اجتماع نقیضین ہے کہ وہ مال کا مالک بھی نہیں ہے لیکن وہ صرف ہو رہا ہے۔ اسی کی خواہش اور ارادے کے مطابق۔

۳۔ مال یا جائداد سے جو آمدنی یا پیداوار ہوتی ہے وہ زندوں کی محنت سے ہوتی ہے

اس لئے اس کے اوپر زندوں ہی کو متصرف بھی ہونا چاہئے ۔مردہ کی خواہش کا اس کے اوپر مسلط رہنا کسی صورت سے جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کیونکہ اس سے اکثر حالات میں نقصان ہوتا ہے۔ وقف کرنے والے کو کیا خبر کہ کل زمانے کی ضروریات کا تقاضا کیا ہوگا یہ تو زندہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔

چنانچہ ایک مضحکہ خیز معاملہ خود میرے شہر میں درپیش ہے وہاں ایک وقف تعزیہ اور امام باڑہ کے اخراجات کے لئے ہے۔ جو لوگ اس کے متولی ہیں وہ اب اہل حدیث ہوگئے ہیں جو ان امور کو شرک سمجھتے ہیں۔ مگر واقف کے شرائط کے مطابق ان کو یہ سب مشرکانہ مراسم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وہ ہرچند چاہتے ہیں کہ ہم اس امام باڑہ کو مدرسہ بنالیں اور وقف کی آمدنی کو تعلیم پر صرف کریں لیکن نہیں کرسکتے ۔ اگر مقدمہ بھی دائر کریں کہ یہ امور شرع شریف کے خلاف ہیں۔ اس لئے ہم کو فقہا کے فتوؤں کے مطابق اجازت دی جائے کہ اس آمدنی کو ہم دوسری جائز مد میں صرف کریں تو واقف کی ذریت جو شیعہ ہے اس کو عین مذہب کے مطابق ثابت کردے گی

علاوہ بریں یہ سلسلۂ وقف اگر جائز قرار دیا جائے اور اسی طرح جاری رہے تو دولتمند معلوم نہیں کس قدر جائدادیں وقف کر ڈالیں گے ۔جس آیندہ نسلوں پر دنیا تنگ ہوجائے گی ۔آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اوقاف کا شمار کیا جائے تو ان کی آمدنی سالانہ کروروں روپے تک پہنچتی ہے ۔جس کا بڑا حصہ بے کار مصارف میں ضائع جاتا ہے ۔

بعض سادہ دل بزرگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اوقاف ملت کا سرمایہ ہیں جن سے بڑے بڑے قومی کام چل سکتے ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملت کا سرمایہ نہیں بلکہ مردوں کا سرمایہ ہیں جو ان کے مخصوص اغراض سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مفید لیکن زیادہ تر غیر مفید کاموں میں صرف ہو رہے ہیں۔

۴۔ وقف کر دینے سے مال جب واقف کی ملکیت سے خارج ہوگیا تو اس پر اس کو تولیت

کا حق کہاں رہا۔ اگر اس نے اس وقت کسی کو متولی بنایا تھا جب وہ اس کا مالک تھا تو اس کی ملکیت ختم ہوتے ہی متولی کی ولایت بھی ختم ہوگئی۔ الغرض عقلاً وقف میں اس قدر قباحت ہے کہ وہ جائز ہو ہی نہیں سکتا۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت جبکہ اسلامی خلافت استبدادی حکومت میں تبدیل ہوگئی اور سرمایہ داری مسلمانوں پر مسلط ہوگئی۔ دولت مندوں نے مال سے جہاں دنیاوی آسائشیں حاصل کیں وہاں یہ بھی چاہا کہ اس سے ایک مستقل جائداد آخرت کے لئے بھی بنالیں جس کا ثواب ابد تک ملتا رہے، اور اس لئے یہ وقف کا طریقہ اختیار کیا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جن کی نگاہ قانونی امور میں بہت باریک بیں تھی، وقف کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اور امام ابویوسف بھی جو بغداد کے قاضی القضاۃ تھے۔ اس امر میں اپنے استاد کے تابع تھے۔ مگر بعد میں ان کی رائے بدل گئی۔ امام سرخسی لکھتے ہیں :-

وکان ابویوسف یقول اولاً بقول ابی حنیفہ۔ وَلکنّہٗ لما حج مع الرشید فرأی وقوف الصحابۃ بالمدینۃ ونواحیہا رجع فافتٰی بلزوم الوقف۔	امام ابویوسف پہلے ابوحنیفہ کے قول پر تھے لیکن جب انھوں نے ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ اور اس کے اطراف میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوقاف دیکھے تو ان کے قول سے رجوع کرلیا
(کتاب المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۲۸)	اور وقف کے جواز کے فتوے دینے لگے

امام سرخسی کے بیان کے مطابق امام ابوحنیفہ کے نزدیک "وقف" یا "حبس" کا مفہوم صرف یہ تھا کہ وقف کرنے والا مال کو اپنی ملکیت میں روک لے اور اس کے منافع کو صدقہ کردے۔ یقیناً اس صورت کے جواز میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس کی مثال عاریت کی ہے جو دینے والے کی ملکیت میں رہتی ہے، لیکن نفع اٹھانے کا حق وہ دوسرے کو دے دیتا ہے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ واقف کے مرنے کے بعد وقف ورثہ میں تقسیم ہوگا کیونکہ وہ مورث کی ملکیت میں ہے۔

وقف کے جواز پر فقہا کا استدلال قرآن سے مطلقاً نہیں ہے، بلکہ صرف اس روایت سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک اچھا نخلستان ملا تھا جس کا نام ثمغ تھا۔ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں اس کو صدقہ کرنا چاہتا ہوں جس طرح حکم ہو عمل کروں، سرور عالم نے فرمایا کہ

ان شئت حبست اصلها و تصدقت بها۔ — اگر تمہاری خواہش ہے تو اصل مال کو روک لو اور اس کی پیداوار کو صدقہ کرو۔

ائمہ ستہ حدیث کے متفق علیہ الفاظ روایت کے یہی ہیں۔ ان سے واضح طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور کا فرمان یہ تھا کہ نخلستان کو اپنی ہی ملکیت میں روکے رکھو اور اس کے پھل کو صدقہ کرو۔ کیونکہ اس وقت حبس یا وقف کا لفظ ان اصلاحی معنوں میں نہیں بولا جاتا تھا جن میں بعد کے فقہا نے ان کو استعمال کیا ہے۔ غالباً ابو حنیفہ کا یہ خیال کہ مال موقوفہ واقف ہی کی ملک میں رہتا ہے، اسی بنا پر تھا۔

بعد میں اس روایت پر اضافے ہوئے اور اس کے الفاظ میں تبدیلیاں کی گئیں۔ یہاں تک رفتہ رفتہ یہ اس وقف کا ثبوت بنالی گئی جو فقہا نے تجویز کیا تھا، حالانکہ ایسی روائتیں بھی ہیں جو اس کے خلاف ہیں۔

امام طحاوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ سورہ نساء میں فرائض و وراثت نازل ہوجانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حبس کی ممانعت فرمادی، جو میں نے خود سنی۔ نیز ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ وراثت سے کوئی چیز روکی نہیں جاسکتی بجز اسلحہ اور سواری کے۔ یعنی جنگ کے ہتھیار یا سواریاں جو جہاد کے لئے دیدی جائیں ان کے سوا اور کسی شے کا کسی مخصوص غرض کے لئے روکنا جائز نہیں ہے۔ وہ ورثہ میں تقسیم ہوگی۔

حضرت ابن عباس کی روایت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، لیکن حضرت علی کے قول کے

متعلق بعض فقیہوں نے کہا ہے کہ وہ غیر معتبر ہے اس لئے کہ ان کا عمل اس کے خلاف تھا۔ کیونکہ مصر میں انھوں نے اپنا ایک گھر اپنی اولاد کے لئے خود وقف کیا، مگر مصر میں حضرت علی کب گئے، وہاں کون سا مکان بنایا یا خرید کیا، اور وہ کون سی اُن کی اولاد وہاں تھی جس کے لئے اس کو وقف کیا؟

ان میں سے ایک بات کا بھی ثبوت تاریخ سے نہیں ملتا۔

اسلم جیراجپوری

غالب اور اس کے نقاد

بیسویں صدی میں غالب کی مقبولیت خاصی حیرت انگیز ہے۔ یہ دور عوام کا دور ہے ملوکیت پسندی اور امارت سے اُسے نفرت ہے۔ غالب بہت بڑا تنگ نظر اور خواص پرست تھا۔ آج نظم اور اس میں ایک پیغام اور اس پیغام کے سماجی پہلو کی تلاش ہے۔ غالب، پیغام اور اس کے سماجی پہلو دونوں سے ماورا ہیں۔ آج کل زبان میں سادگی اور خیال میں آئینے کی سی صفائی پسند کی جاتی ہے۔ غالب کا خیال تو باوجود بلند ہونے کے کہیں کہیں آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مگر غالب کی زبان میں سادگی صرف آخر میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں اپنے باغ اور اپنی بہاریں عزیز ہیں غالب ساری عمر ہندوستان کے بجائے ایران و توران پر نظریں جمائے رہے، وہ اپنی فارسی کے مقابلے میں اردو کو ہمیشہ حقیر سمجھا کیے۔ غالب کی شاعری میں کسی خاص نظریہ حیات کی ترجمانی نہیں۔ لطیف کے الفاظ میں "انھوں نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سائے میں ایک منتشر زندگی بسر کی"۔ پھر کیا بات ہے کہ ان کی مقبولیت بجائے کم ہونے کے بڑھتی جاتی ہے۔

کوئی دن جاتا ہے کہ اس مقبولیت کا تازہ ثبوت نہ ملتا ہو، دیوان غالب کے اچھے سے اچھے ایڈیشن نکل چکے۔ ان پر کئی تنقیدیں بھی شائع ہو چکیں، جنگ اور گرانی کے باوجود انتخاب غالب اور مرقع چغتائی دو دو بکتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ تھوڑے تھوڑے فرق سے حال میں غالب پر تین اچھی کتابوں کا تیسرا ایڈیشن نکلا ہے دیکھنا یہ ہے کہ ان سے ہمیں غالب کے متعلق کیا نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

مکاتیب غالب جب پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئے تو ان سے غالب کی زندگی کے ایک ایسے باب پر روشنی پڑتی تھی جو اس وقت تک تاریکی میں تھا۔ جس نے شاعر کو

صرف فرشتہ یا ہیرو بنا کر دیکھ سکتے ہیں یا جو دلی، درویش صوفی یا لیڈر ہی کے قایل ہیں،
اُنھیں ان خطوط سے بڑی مایوسی ہوئی تھی غالب نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی
خاں سے نئے نئے جتن سے روپئے مانگتے تھے، اور اس میں ذرا بھی نہ شرماتے تھے
اس لئے بیشتر خطوں میں روپے کا تقاضا یا اس کی رسید یا روپیہ مانگنے کی نئی تمہید ہے
ان میں ادبیت زیادہ نہیں، مگر غالب کی شخصیت پر ان خطوں سے بڑی روشنی پڑتی ہے
عرشی نے ایک مفصل مقدمے میں غالب کے رام پور کے دربار سے تعلقات، ان کی اصلاحیں
ان کی انشا، املا اور خطوں کی چھپائی کے متعلق تمام ضروری معلومات یک جا کر دی ہیں جس
کی وجہ سے کتاب غالب کے طالب علموں کے لئے بہت مفید ہو گئی ہے۔ نئے ایڈیشن میں
صاحب زادہ بیتاب کے نام دو خط بہت اہم ہیں۔ یہ خط کیا ہیں، بیتاب کے کلام پر اصلاحیں
ہیں، جن سے غالب کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ محض اچھے شاعر ہی نہیں اچھے
استاد اور معلّم بھی تھے۔ عرشی نے اپنے دیباچہ میں ناظم کے کلام پر جن اصلاحوں کا حوالہ
دیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کولرج کی طرح ان شاعروں میں تھے جو بہت اچھا
تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ غالب کے املا اور متعلقات انشا کی تفصیل
سے غالب ایک ترقی پسند، آزاد رائے، اور نکتہ سنج مصنف کی حیثیت سے سامنے آتے
ہیں۔ ناظم کی ایک مشہور غزل کا مصرعہ تھا "عاقل نہیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط" "
"عاقل نہیں" کے بجائے "احمق نہیں" کر کے غالب نے مصرعہ کی روانی اور خوبی دونوں میں
اضافہ کر دیا افسوس ہے کہ کسی نے ابھی تک اس پر توجہ نہ کی کہ ناظم کے یہاں غالب کا رنگ
کس قدر جلوہ گر ہے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

مہر کی کتاب "غالب" بڑی فاضلانہ کتاب ہے اس میں پیدائش سے لے کر وفات
تک غالب کے حالات، ان کی تصانیف نظم و نثر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے پہلے
ایڈیشن میں "یادگار" پر جو اعتراضات تھے وہ دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دئے گئے تھے۔

"یادگار" میں غالب کے حالات بہت زیادہ تفصیل سے نہیں دئے گئے۔ حالی کا مقصد دراصل غالب کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرنا تھا۔ دوسرے حالی کی "پاک بین" طبیعت کو رہ رہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ غالب کی زندگی میں قوم کے لئے کوئی افادی پہلو نہیں ہے، در اصل افادی پہلو کا حالی ذرا محدود تصور رکھتے تھے۔ غالب کی زندگی سے وہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا جو راہِ نجات یا بہشتی زیور سے پہنچ سکتا ہے۔ لیکن غالب کی زندگی ان دونوں کتابوں سے زیادہ دلچسپ ہے، اس لئے حالی نے حالات پر زور کم دیا، کلام کی تنقید اس کے تعارف اس کی ترجمانی پر زیادہ زور دیا۔ حالی سے بعض تاریخوں کے تعین اور بعض واقعات کے بیان میں بھی غلطی ہوئی۔ مگر بحیثیت مجموعی اس سے یادگار کی بنیادی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مہر کی کتاب میں وہ اضافے بہت اہم جو مولانا ابوالکلام آزاد نے کئے ہیں، ان میں پہلی بار غالب کی قید کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے یہاں حالی کو پردہ پوش مجرم ٹھہرایا ہے غالب کی قید محض مجسٹریٹ کی نامہربانی اور کوتوال کی دشمنی کا نتیجہ نہ تھی، غالب کے یہاں باقاعدہ جوا ہوتا تھا، اور فتوحات کا ایک حصہ غالب کو ملتا تھا۔ غالب نے کبھی اپنی رندی پر اور شاہدبازی پر پردہ نہیں ڈالا، انھیں سزا نہیں ذلت ناگوار تھی۔ غالب کے متعلق اتنی حقیقت پسندی سے حالی کام نہیں لے سکتے تھے یہ صرف بیسویں صدی کی عقلیت کی روشنی میں ممکن تھا۔

مہر نے غالب کے حالات کے علاوہ اخلاق و عادات، تصانیف اور کلام، طریق اصلاح اور شاگردوں کے متعلق بھی تین باب لکھے ہیں، اخلاق و عادات کے بیان میں وہ غیر شعوری طور پر غالب کے اپنے بیانات سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتے ہیں، حالانکہ غالبؔ نے جہاں اپنے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ وہ واقعہ نہیں خواہش ہے، حقیقت نہیں، آرزو ہے۔ اگر مکاتیب غالبؔ کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے تو مہر کے بہت سے بیانات کے ماننے میں قدرتی طور پر تامل ہوگا، کون کہہ سکتا ہے کہ غالب کو احسان لینا گوارا نہ تھا، یا غالب بھی سادہ دل و راست گفتار تھے یا مخالف سے ہمیشہ عفو درگذر کرتے تھے، وہ ہر ایک سے نہیں مانگتے تھے۔ لیکن انھیں مانگنے

میں ذرا تامل نہ ہوتا تھا۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے تھے۔ مگر ان کا یہ لکھنا کہ پنشن کے باب میں والی رامپور کی کوششوں کو ذرا دخل نہ تھا یا عبدالصمد کو فرضی قرار دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ جتنے اچھے دوست تھے اتنے ہی سخت دشمن تھے۔ قتیل اور صاحب برہان کے خلاف اگر ان کا لہجہ اتنا تیز نہ ہوتا تو شاید ان کی مخالفت اس قدر شدید نہ ہوتی۔

مہر کے مقابلے میں اکرام غالب کے حضور میں زیادہ گستاخ ہیں۔ غالب نامہ کا تیسرا ایڈیشن جواب دو حصوں میں شائع ہوا ہے، بعض وجوہ سے مہر و عرش دونوں کی کتابوں سے زیادہ اہم ہے۔ پہلا حصہ، آثار غالب کے نام سے شائع ہوا ہے، دوسرا جس میں غالب کے فارسی و اردو کلام کا تاریخی ترتیب سے انتخاب کیا گیا ہے، ارمغان غالب ہے، مہر و عرش کے یہاں غالب کے حالاتِ زندگی کی تحقیق ہے۔ اکرام نے آثار غالب میں ایک حصہ تذکرے کے لئے اور دوسرا تبصرے کے لئے وقف کیا ہے، تذکرے میں اکرام نے مہر و عرش کی کتابوں سے بہت مدد لی ہے۔ نیز مہیش پرشاد نے خطوط غالب کا جو ایڈیشن مرتب کیا ہے، اس کو بھی ذہن میں رکھا ہے اور غالب کے مقدمے کی جو روداد رسالہ اردو میں شائع ہوئی تھی اس سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ایک مسلسل واضح اور روشن تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہیں جس میں نہ حالی کے بیان کی سی تشنگی ہے نہ مہر کی سی عقیدت مندی اور نہ اسد علی انوری کی سی بے لگامی۔ اگرچہ غالب کے بچپن اور جوانی کی تصویر اب بھی دھندلی سی ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح غالب کے بڑھاپے کے زمانے کی بھی ہمیں مکمل معلومات ملتی ہیں مگر دونوں کے جوانی اور بچپن کے واقعات کا زیادہ علم نہیں۔ جانسن اپنے بچپن اور جوانی سے شرماتا تھا۔ غالب نے اس کا ذکر تو کیا ہے، مگر تفصیل نہیں لکھی۔ اس کے علم کے بعد غالب کی شخصیت کا ارتقا پوری طرح سمجھ میں آسکے گا۔ اکرام نے ایک عقدے کو بڑی خوبی سے حل کیا ہے۔ اور وہ غالب اور بہادر شاہ کے تعلقات ہیں۔ غالب نے ایک مرتبہ قلعے

واپسی پر یہ واقعہ سنایا تھا کہ آج ہمیں بڑی داد ملی۔ بادشاہ نے فرمایا کہ مرزا تم پڑھتے خوب ہو اس سے بعض اوقات ظفر کی سخن فہمی پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ کا دل شروع سے غالب کی طرف سے صاف نہ تھا۔ وہ ذوق کا شاگرد، مربّی اور قدر دان تھا، غالب ذوق کے حریف تھے اور بہادر شاہ کے دل میں ولی عہدی کے وقت سے غالب کی طرف سے گرہ تھی۔

آثار غالب کے دوسرے حصے میں پہلے غالب کے تذکرہ نگاری پر بحث کی گئی ہے اور حالی بجنوری اور لطیف کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے ادبی ارتقا کی منزل متعین کرنے کی کوشش ہے۔ اکرام نے لطیف کی طرح غالب کے کلام کے چار دور قائم نہیں کیے بلکہ پانچ کئے ہیں۔ نیز انھوں نے حالی اور بجنوری کی طرح غالب کی جدت پسندی تشبیہات و استعارات، ظرافت اور پہلو دار اشعار کا ذکر کافی سمجھا ہے۔ انھوں نے ان کی نفسیاتی ژرف بینی، لفظی صناعی، ظرافت پر بھی زور دیا ہے۔ اس طرح یہ دوسرا حصہ بہت دلچسپ اور مفید ہو گیا ہے۔ تیسرے حصے میں تبصرہ عمومی کے نام سے بہت سے عنوان بڑھائے گئے ہیں۔ ان میں سے غالب کی مقبولیت کے اسباب، نیچرل شاعری، غالب کی عشقیہ شاعری، غالب کا فلسفہ، مذہب، مشاہیر اردو شعرا سے غالب کا موازنہ اور مغلیہ تہذیب و تمدن کی ترجمانی قابل ذکر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج بھی یادگار غالب کے دوسرے حصے کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا "یادگار" غالب کی سوانح عمری کے لحاظ سے زیادہ اہم نہیں حالی شخص پر زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے تھے، ان کا قومی اور سماجی نقطۂ نظر انھیں بہت جلد اس کے کاموں تک لے آتا تھا۔ یادگار میں حالی نے غالب کے کلام کی شرح کر کے ایک غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ "یادگار" غالب کا انتخاب بھی ہے، غالب کا تذکرہ بھی اور غالب پر تنقید بھی۔ حالی کے بعد اکرام نے کوشش کی ہے کہ آثار غالب اور ارمغان غالب میں

یہ سب چیزیں جمع کر دیں۔ کچھ لوگوں کو ان کی مغربیت مغربی مصنفین کا حوالہ، اور مغربی طریقۂ فکر پسند نہیں۔ بعض ان کی زبان میں کوئی خاص بات نہیں پاتے خاص بات سے غالباً ان لوگوں کی مراد کوئی خاص چاشنی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ انھوں نے غالب کے کلام، ان کے حالاتِ زندگی، ان کے ماخذ، ان کے معاصرین، ان کے زمانے کی تاریخ، سب کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے غالب کو کسی خاص عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ایک غیر شخصی نقطۂ نظر قائم رکھا ہے۔ وہ بظاہر ایک سانس میں دو باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہ تصویر کے دونوں رُخ دیکھنے کی کوشش ہے، ان میں قوتِ فیصلہ کی کمی نہیں، اور ان کی رائیں اگرچہ سب قابلِ قبول نہیں، مگر اکثر سنجیدہ اور وزنی ہوتی ہیں۔ وہ بعض اہم مقامات سے بہت جلد گذر جاتے ہیں ناظم کے یہاں غالب کا اثر انھیں نظر نہیں آتا۔ مومن کے خاص رنگ کو وہ پہچان نہیں سکتے، اور صرف چیستان گو مومن کو جانتے ہیں۔ وہ غالب کو ناسخ کا پیرو کہے جاتے جاتے ہیں۔ مگر آثار غالب میں، نظر کی وسعت اور گہرائی دونوں کا اتنا ثبوت ملتا ہے کہ کتاب کی خوبی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب پر ہمیشہ بحث کی گئی ہے اور کی جاتی رہے گی۔ حالی نے غالب کی جامعیت پر زور دیا ہے۔ اکرام نے تنوع پر۔ بجنوری کہتے ہیں کہ ان کے ساز سے ہر نغمہ نکلتا ہے، بات ایک ہی ہے۔ کہنے کے انداز مختلف ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ غالب قدیم شعراء میں سب سے زیادہ جدت پسند ہیں، وہ قدامت پرستی سے بیزار ہیں دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے کے بجائے خود راستہ نکالتے ہیں اور اس پر چلنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ دراصل ایک اچھے ساتھی ہیں، اور اچھا ساتھی بزرگ نہیں ہوتا۔ وہ سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ ہماری شاعری کی بساط میں دل والے بہت سے تھے۔ غالب اُسے ایک نیا ذہن دیتے ہیں، وہ زندگی کرنے کا پورا پورا حوصلہ رکھتے ہیں۔ گناہوں کے حساب سے انھیں داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد آتا ہے، وادیِ پُر خار

۵۱ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

میں آبلہ پا طلب کرتے ہیں، کوئی سچی بات کہنے پر تکلیف دیتا ہے تو دار پر کھنچے جانے کا لطف یاد کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے جام کو تہ تک پی جانے کا عزم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں جو مایوسی ہے، وہ انسان دوستی کا لازمی نتیجہ اور اسی وجہ سے (Humanism) یا فطری ہے۔ غالب کے مزاج کی سب سے نمایاں خصوصیت کیا ہے؟ حالی کے نزدیک ظرافت، فیض احمد فیض کے نزدیک درد مندی، کسی کے نزدیک رجائیت، کسی کے نزدیک قنوطیت، میرا خیال یہ ہے کہ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت آدمیت ہے، جسے انسانیت کہتا، مگر اب لوگ انسانیت کو ملوکیت کے مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ یہ آدمیت گناہ آدم کو بھی اتنا حسین سمجھتی ہے کہ بہشت بھی اس کے مقابلے میں بے کیف نظر آتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے، ان میں بحث سے قطع نظر نہیں، کیسی مزیدار طنز ہے۔

دراں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائش شورش نائے و نوش

سیہ مستی ابر باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا

چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار

نظر بازی و ذوق دیدار کو — بفردوس روزن بدیوار کو

غالب میں بڑی جرأت ہے۔ وہ ہر دل کا چور بیان کرسکتے ہیں۔ ان کے یہاں بڑی چمک دمک ہے، وہ ذہن میں روشنی سی کر دیتے ہیں۔ وہ اپنی حقائق نگاہ سے دلوں میں ایک خلش پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ خلش اور بے چینی ذہنی زندگی کی قدرتی علامت ہے۔ ان کی ظرافت سے یہ خلش گوارا ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی بالکل جاتی نہیں۔ ان کی ظرافت چلبلا پن ہے، وہ سختی و سستی و رنج و راحت کو ہموار کرتی ہے۔ اس سے زندگی کے نشیب و فراز تو کم نہیں ہوتے

پچھلے صفحہ کا نوٹ

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اک آبلہ پا وادیٔ پُر خار میں آوے

حق گویم و نادان بزبانم دہد آزار — یارب چہ شد آں لذت پروار کشیدہ

گزران سے گذرنا آسان ہو جاتا ہے۔ واعظ پر شاعروں نے کتنے کتنے دیوان سیاہ کئے ہیں اور طنز کے تیر برسائے ہیں۔ غالب ایک شعر میں یہ سب باتیں کہتے ہوئے گذر جاتے ہیں ؎

کہاں مے خانے کا دروازہ، غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اکرام نے غالب کی عشقیہ شاعری پر بڑے دلچسپ انداز سے تبصرہ کیا ہے۔ غالب کا عشق ظاہر ہے۔ اس دنیا کا عشق تھا۔ اور اس کے اثر سے ان کے کلام میں ایک نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی اور حسن کی مصوری بھی ملتی ہے۔ مگر اکرام کی یہ رائے صحیح نہیں کہ غالب کے یہاں چونکہ محبت کا وہ بلند ترین تصور نہیں، جو اقبال یا رومی میں ہے، بلکہ وہ "عورت" کے حلقے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان کے یہاں وہ درد اور کسک ناپید ہے جو رومی یا اقبال کی خصوصیت ہے۔ بات یہ ہے کہ خالص عاشقانہ شاعری کے لحاظ سے غالب کی شاعری میں میرؔ کی وہ گرمی جو ہڈیوں تک کو پگھلا دے، مومن کی وہ گہری اور حسین جذباتیت، حسرت کی وہ سپردگی اور جوش کی وہ بھبکتی ہوئی مگر تندرست ہوس انگیزی نہیں جو ان کے عاشقانہ کلام کی جان ہے اور اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ غالب اپنے آپ کو کبھی (*Self-abandonment*) نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی رفعت اُسے روکتی تھی۔ عشق اس کا کبھی کبھی کا دل بہلاوا ہے میرؔ کی طرح اس کی جان کا روگ یا اقبال کی طرح جوشِ حیات نہیں ہے، اور ہمیں جو ہے اس پر قانع ہونا چاہیے۔

اکرام نے غالب کے خطوط پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، عام طور پر لوگ خطوط کی دلچسپی، ان کی جدتیں اور القاب و آداب کی موزونیت پر زور دیتے تھے۔ اکرام نے اس میں سچی انشا پردازی کی جو خصوصیات دیکھی اور دکھائی ہیں، وہ واقعی وہاں ہیں۔ نثر پہلے پُرتکلف ہوتی تھی، پھر خطیبانہ ہونے لگی، دونوں میں سہارا تھا، ایک صنائع کا دوسرے میں جذباتیت کے سیلاب کا، غالب کے خطوط یوں بھی زندہ ہیں کہ ان میں نثر کا اپنا حسن ہے، ان میں خیال واضح ہے، کم سے کم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، الفاظ

کا انتخاب اچھا ہے، اور پھوڑے پھنسی کا بیان بھی ذرا سے اشارے سے حسین بن جاتا ہے۔ ان خطوں کی دلچسپی کا راز ان کی ادبیت میں ہے۔ اکرام نے اس راز کو سمجھ لیا ہے۔

اکرام نے غالب کا موازنہ میرؔ، سوداؔ، مومنؔ، خسروؔ، فیضؔ سے کیا ہے۔ یہاں اختلاف رائے کی قدم قدم پر گنجائش ہے۔ مگر اس سے شاید ہی کوئی انکار کرے کہ میرؔ، مومنؔ، سوداؔ اور اقبال سب سے جامع غالب کا کلام ہے۔ اور سب سے زیادہ زندگی کے ہر دور میں ساتھ دے سکتا ہے۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ غالب مغل تہذیب و تمدن کے بہت اچھے ترجمان ہیں، ان میں مغلوں کی نفاست، ہمواری، رواداری، ارضیت سب ملتی ہیں، وہ ایک تہذیبی سرمایہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں محض عقلیت یا عارفانہ نظر، یا رکھ رکھاؤ اہم ہیں، تندہ رہنا، اور زندگی میں ایک تیز روشنی دینا اہم ہے۔ پنشن کے قصے بذات خود کتنے غیر دلچسپ ہیں۔ مگر غالب کی شخصیت کے پرتو سے وہ بھی دلچسپ بن جاتے ہیں۔

اس شخصیت کی سب سے اچھی یادگار ان کا کلام ہے۔ ارمغان غالب میں اکرام نے اُن کے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب پیش کیا ہے۔ بظاہر "انتخاب غالب" کے بعد جو خود غالب نے کیا، اس کی ضرورت نہ تھی۔ مگر انتخاب میں صرف غزلوں اور قصیدوں کا انتخاب ہے ارمغان میں تمام اصناف آئے ہیں، انتخاب میں کوئی تاریخی ترتیب نہیں ہے۔ یہاں ہمیں جو ترتیب ملتی ہے وہ کافی غور و خوض کا نتیجہ ہے۔ اکرام نے اس چیز پر بہت زور دیا ہے کہ ۱۸۲۷ء سے لے کر ۱۸۴۷ء تک غالب کا اردو کلام بہت کم ہے۔ اور وہ زیادہ تر فارسی میں لکھتے ہیں۔ اس تاریخی ترتیب کے بعد یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ غالب کے کلام میں شروع سے انسانی فطرت کا ایک ایسا شعور اور باوجود بیدل کی تقلید کے فن کا ایک ایسا احساس ملتا ہے جو نہایت غیر معمولی ہے۔ ان کے پہلے دور میں بھی اچھے صاف رواں اشعار کی تعداد کافی ہے، اور دوسرے دور میں جب وہ بیدل کی ظاہری تقلید سے آزاد ہو چکے تھے اور جوانی کے تجربوں نے انھیں عرفی اور نظیری سے قریب کر دیا تھا، اچھے اشعار کا تناسب بہت

کافی ہے۔ یہ ایک دلچسپ انکشاف ہے کہ غالب اردو کے تین چوتھائی اچھے اشعار ۱۸۳۲ء تک
کے لگ بھگ کہہ چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جب انھیں اپنی شاعرانہ
قدرت کا پورے طور پر علم ہوا تو وہ اردو کی محدود فضا پر قانع نہ رہ سکے اور وسیع تر
فضائیں تسخیر کرنے کی انھیں فکر ہوئی۔ بالکل ایسی ہی مثال اقبال کی ہے جو یوں تو اردو فارسی
میں کہتے رہے مگر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک زیادہ تر فارسی کی طرف متوجہ رہے، تا آنکہ
حالات انھیں پھر اردو کی طرف لائے۔ انتخابِ غالب اگرچہ غالب کا کیا ہوا ہے اور غالب کا
اچھا انتخاب ہے، مگر کوئی بھی علیٰ الاعلان اسے غالب کا بہترین انتخاب نہ کہے، خود عرشی نے ایسے
بہت سے اچھے اشعار درج کیے ہیں جو اس انتخاب میں غالب نے شامل نہیں کیے
عرشی کا خیال یہ ہے کہ غالب کا معیار اس وقت سہل ممتنع تھا، اور اس میں کوئی شک
نہیں کہ اس لحاظ سے یہ انتخاب خصوصیت رکھتا ہے۔ مگر غالب کی خصوصیت محض سہلِ
ممتنع ہی نہیں ہے۔ غالب جس چیز سے غالب ہوئے وہ ان کا انوکھا اور منفرد خیال
اور اس خیال کے لئے ایک نئی استعاروں سے سجی ہوئی اور تشبیہوں سے مالا مال، خیال
انگیز اور خیال آفریں زبان ہے۔ یہ مڈلٹن مرے کے الفاظ میں زبان کی فتح اور اسٹائل
کی معراج ہے۔ ارمغانِ غالب میں اس کی جا بجا مثالیں ملتی ہیں۔ اردو کلام عام طور پر
سب کے سامنے ہے، ان کی فارسی مثنوی چراغِ دیر کے چند شعر دیکھئے۔
نازنینانِ بنارس کے متعلق لکھتے ہیں:-

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار ◆ خرامے صد قیامت فتنہ دربار ◆ ببالیدن دو عالم گلستاں رنگ ◆ ز تابِ رخ چراغانِ لبِ گنگ
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گرِ ہوش ◆ بہار بستر و نوروزِ آغوش ◆ بہ مستی موج را فرمودہ آرام ◆ ز نغزی آب را بخشیدہ اندام

غالب کی تشبیہات کو نظر انداز کر دیا جائے تو غالب غالب نہ رہ سکیں گے۔ ارمغانِ غالب میں یہ
تشبیہات بھی ہیں اور غالب کی دوسری خصوصیات بھی ملتی ہیں۔

آل احمد سرور

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

زمین والوں کا تمدّن

مریخ میں ایک جلسہ ہونے والا تھا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کو جلسہ کرانے کا خیال آیا، اس نے دوسروں سے اس بارے میں گفتگو کی، وہ راضی ہو گئے۔ جلسے کا اعلان کیا گیا اور مقررہ وقت پر لوگ جمع ہوئے۔ جی نہیں، مریخ میں یہ طومار نہیں ہوتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں، اب تو زمین والوں کی سمجھ میں بھی کچھ کچھ آنے لگا ہے کہ دیکھنا ممکن ہے بغیر اس کے کہ آنکھیں ہوں، حرکت کرنا ممکن ہے بغیر اس کے کہ مقام بدلے اور سمجھنا ممکن ہے بغیر اس کے کہ دماغ زحمت اُٹھائے۔ اور ہاں زمین والے اب بھی جان گئے ہیں کہ زندگی کے لئے زمانے کی قید لازمی نہیں۔ وقت گذرتا ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نہ گذرے۔ تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مریخ میں جلسہ کب ہوا اور کہاں ہوا۔ اس میں لوگوں نے اپنا مطلب کیسے بیان کیا، اور سننے والوں نے ان کی باتیں کیسے سنیں اور کیسے سمجھیں، مگر ہاں میں یقین دلاتا ہوں کہ جلسہ بہت اہم تھا، اور چونکہ اس کا مقام کوئی ہال یا پارک نہ تھا بلکہ پورا سیارہ۔ اس میں بے شمار لوگ شریک تھے، اور کیوں نہ ہوتے، ان کے یہاں ایک نوجوان جسے تحقیق کرنے کا بڑا شوق تھا، زمین کی سیر اور زمین والوں کی زندگی کا مشاہدہ کر کے آیا تھا، اور انھیں بتانے والا تھا کہ ایک سیارہ جو مریخ کے مقابلے میں روشنی اور حرارت کے سرچشمے سے زیادہ قریب ہے، کیسے لوگوں سے آباد ہے، اور ان کی زندگی کس ڈھنگ کی ہے۔ اس نوجوان نے محسوس کیا کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہیں اور اس کی باتیں سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہیں تو اس نے کہا۔

حضرات میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور میرے شوق کی داد دی۔ لیکن مجھے بالکل یقین نہیں کہ میں اپنا مطلب بیان کر سکوں گا۔ اور جس زندگی کو

میں دیکھ کر آیا ہوں، اس کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کرسکوں گا، میں ایک سیارہ کا چکر لگا کر
آیا ہوں۔ جو کائنات کا سب سے بڑا قیدخانہ اور سب سے بڑا کارخانہ ہے۔ ہم روشنی کے
بنے ہوئے لوگ ایک حالت پر نہیں رہتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے اندر دوسری شخصیت
کو پاتا رہتا ہے، اور ایک لمحہ ایسا آتا ہے۔ جب ہم میں سے ہر ایک کائنات کی روشنی میں گم ہو جاتا
ہے، لیکن ہم روشنی کی طرح آزاد ہیں، ہر جگہ ہوتے نہیں تو ہر جگہ پہنچ سکتے ہیں، ہم کائنات
کے دل سے دور ہیں تب بھی اس کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں، ہماری زندگی کا ایک پختہ
نظام اور اٹل قانون ہے۔ ہمارے یہاں ہر بات یقینی ہوتی ہے، اور جسے ہم جانتے ہیں کہ
یقینی ہے اس سے ہم انکار نہیں کرتے۔ زمین والے، جو انسان کہلاتے ہیں، ان تمام نعمتوں
سے محروم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو جو پیدا ہوتا ہے، سب کچھ نئے سرے سے سیکھنا
ہوتا ہے، اسی وجہ سے علم بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور ان چند لوگوں میں بھی ہر ایک
کا علم ایک الگ رنگ اور الگ تاثیر رکھتا ہے۔ ان میں جو سب سے بڑے عالم ہوتے ہیں وہ
فلسفی کہلاتے ہیں، اور یہی اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ علم کیا ہے اور کیسے حاصل ہوتا ہے
آپ کو اس پر ہنسی آئے گی، مگر انسانوں کے لئے یہ کوئی ہنسی کی بات نہیں ہے، وہ دیکھ نہیں
سکتے جب تک کہ ان کے آنکھیں نہ ہوں، سن نہیں سکتے، جب تک کہ کان نہ ہوں، ان کا
سارا علم پانچ حواس پر منحصر ہے، جن کا درست ہونا یا نہ ہونا اتفاقی بات ہے، اس لئے کہ
ان میں اندھے اور بہرے اور احمق بھی ہوتے ہیں انسانوں نے بہت دنوں تک غور کرنے
کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ وہ اپنے حواس پر پورا اعتبار نہیں کرسکتے۔ اور یہی حواس انھیں
علم کے بہتر ذریعے دریافت نہیں کرنے دیتے۔ اسی وجہ سے میں نے کہا ہے کہ زمین کائنات کا
سب سے بڑا قیدخانہ ہے۔ یہاں زندگی پر جسم کی، اور جسم پر وزن کی قید لگی ہوئی ہے، یہاں
کوئی خواہش بغیر وسیلے کے پوری نہیں ہوتی، یہاں کا عمل ناقص وسیلوں کا پابند یہاں کا
علم شبہوں میں گرفتار اور ایمان علم کی سرکشی سے بیزار رہتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ زمین کائنات

سیاست بڑا کارخانہ بھی ہے، یہاں کوئی چیز ایک حالت پر نہیں رہتی - ہر وقت گھٹتی یا بڑھتی، بنتی یا بگڑتی رہتی ہے - یہاں دن کے اُجالے کے بعد رات کا اندھیرا ہوتا ہے، گرمی کے بعد سردی، سردی کے بعد پھر گرمی ہوتی ہے، اور زمین والوں نے یہ دیکھ کر کہ دن اور رات اور موسموں کی تبدیلی ایک خاص قاعدے کے مطابق ہوتی ہے - اسے وقت کا پیمانہ بنا لیا ہے - وہ اگر وقت کو دن اور مہینے اور سال میں تقسیم کر لیتے تو شاید سب دیوانے ہو جاتے - ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ وقت کو محدود اور محسوس کرنے کے بعد زندہ رہنا کیسے گوارا کرتے ہیں - ہم جانتے ہیں کہ وقت ہماری ایک کیفیت ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دھارا ہے جس میں کل کائنات بہتی ہے اور ڈوبی رہتی ہے - ہر کارخانہ چیزیں بنانے کے لئے ہوتا ہے - مگر زمین پر حالت یہ ہے کہ جب تک ایک چیز کو نہ بگاڑئے دوسری بنتی نہیں - اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہاں سامان کی کمی ہے - وہاں قدرت نے تو ہر چیز مہیا کر دی ہے، مگر جاندار مخلوق کے لئے عام قاعدہ رکھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کھا کر اپنا پیٹ پالیں - اس طرح ہر جان کے ہزار دشمن ہوتے ہیں اور زندہ وہی رہ سکتا ہے جو اتفاق یا تدبیر سے اپنے آپ کو دشمنوں سے بچا سکے - انسان بھی اس قاعدے کے پابند ہیں - انھیں بتایا گیا ہے کہ ساری مخلوق میں ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے - مگر ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی گئی ہے جتنا ہی اعلیٰ ان کا مرتبہ ہے اتنی ہی زیادہ ان کی ذمہ داریاں اور دشواریاں ہیں - دوسری مخلوق کو صرف جان کا خطرہ رہتا ہے - ان کے لئے ایمان کا خطرہ ہے - دوسری مخلوق کے لئے کافی ہے کہ وہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے دشمنوں سے بچی رہے - انسان کا زندہ رہنا اس کو زندہ رکھنے کے لئے کافی نہیں - اسے جہالت تباہ کر سکتی ہے - اس لئے اسے علم چاہیئے - وہ اپنی حیثیت اور مرتبے کو بڑی جلدی بھول جاتا ہے - اس لئے ضروری ہے کہ اس کی طبیعت تہذیب کے ایک خاص سانچے میں ڈھالی جائے، لیکن تہذیب کے قاعدے قانون بھی زنجیریں بن سکتے ہیں - اس لئے ضروری ہے کہ عقل کی ریتی انھیں کاٹتی رہے -

گویا ہر پیمانہ پر، ہر طریقے سے اور زندگی کے ہر شعبہ میں مٹنے اور بننے کا سلسلہ ہر دم جاری رہتا ہے۔ انسان اسے محسوس کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی بنیاد یقین پر ہی ہو سکتی ہے، اور وہ یقین کی بنیاد پر اپنی زندگی تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ وہ یقینی باتوں کو اپنا مذہب کہتے ہیں، اور مذہب ان میں جو قوت پیدا کرتا ہے اس کے بل پر وہ زندگی کے قاعدے قانون بناتے ہیں، رسمیں قائم کرتے ہیں اور عادتیں ڈالتے ہیں۔ یہ کام بے حد مشکل ہوتا ہے اس لئے کہ ہر انسان کی طبیعت یا خیالات یا مذاق دوسروں سے مختلف ہوتا ہے، اور یہ اختلاف قائم نہ رہے تو انسان کی شخصیت ماری جاتی ہے، جیسے کا کوسل دیکھئے تو پھر وہ کھلتی نہیں، معلوم ہوتا ہے قدرت کا منشا یہ تھا کہ ہر انسان اپنی دنیا الگ بنائے مگر انسان نے یہ دیکھا کہ اس کا کام مل جل کر رہنے اور اتحاد عمل سے ہی چل سکتا ہے، اس نے خود غرضی کے میلانات کو قابو میں کیا، اور ایسی عادتیں ڈالیں کہ اس کے لئے اکیلا رہنا ناممکن ہو گیا۔ اس طرح انسانی زندگی کا دار مدار مذہب، قانون، رسم و عادات پر ہے، اور ان چاروں رنگوں سے زندگی کی جو تصویر بنائی جاتی ہے اسے تہذیب کہتے ہیں۔ مگر یہ تصویر ایک مرتبہ بنا کر ہمیشہ کے لئے محفوظ نہیں کر دی جاتی۔ قدرت کا ایک حکم ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ پیدا کرتا رہے۔ انسان اپنی تہذیبی دولت کو بڑھاتا نہ رہے، فکر اور نئے عمل کے لئے نئے میدان تلاش کرتا نہ رہے، تو مذہب، قانون، رسم اور عادت سب کے سب پتھرا جاتے ہیں وہ جذبات، اور خواہشیں جن کی کامیابی کو وہ زندگی کا نچوڑ سمجھتا ہے، آہستہ آہستہ اس کے لئے اخلاقی زنجیریں بن جاتی ہیں، اور وہ ان سے اس طرح پیچھا چھڑاتا ہے جیسے کوئی قیدی قید خانے سے نکل کر بھاگے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں قید خانے سے نکل بھاگنے کی طاقت نہ رہے، تب وہ نئی تہذیب بنانے کے کام کا نہیں رہتا، دوسروں کا غلام بن جاتا ہے اور یہ غلامی اُسے بھلی بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ میں نے انسانی تہذیبوں کو کارگذاری کے طور پر جانچا تو میں نے دیکھا کہ انسان برابر ترقی کرتا رہا ہے۔ جن باتوں

کو وہ پہلے بنیادی حقیقتیں مانتا تھا، وہ قبائلی رسموں اور روائتوں سے کچھ زیادہ نہ تھیں
رفتہ رفتہ وہ اس قابل ہوگیا کہ انسانیت کے ایک ہمہ گیر مذہب کا خیال اس کے دل
میں سما سکے۔ اس کا دماغ پہلے عقل کی صورت سے وحشت کرتا علم کے نام سے ڈرتا تھا
لیکن پھر وہ دونوں سے مانوس ہوگیا اور اب انسان سمجھنے لگے ہیں کہ ان کے دماغوں کے
باہر عقل اور علم کا کوئی وجود ہی نہیں۔ علم نے انسانی زندگی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے
انسان جو پہلے دوسرے جانوروں کی طرح مجبور تھا، اب اپنے بنائے ہوئے آلات کے
ذریعے بڑے بڑے فاصلے بہت جلد طے کرلیتا ہے، اس کے لئے خشکی اور تری کوئی رکاوٹ
نہیں، اور وہ ہوا میں اُڑنے والے جہاز بھی بنا لیتا ہے، زمین کی دولت اب اس طرح
اس کے قابو میں آگئی ہے کہ وہ چاہے تو عام انسانی زندگی کے معیار کو بہت بلند کرسکتا
ہے۔ اور تجربے سے اتحادِ عمل کی ایسی تدبیریں اور ترکیبیں معلوم کرلی ہیں کہ اگر وہ چاہے
تو ہزاروں برس تک اس محنت کی کمائی پر گذر کرسکتا ہے جو اس نے اب تک صرف کی ہے
شرط یہ ہے کہ وہ ایسا چاہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ انسان کو اپنی خواہشوں پر کوئی اختیار
نہیں۔ اور اس کی طبیعت اس کے علم اور اس کی عقل کے باوجود اتنی من چلی ہے کہ ہزار
بنے بنائے کام لگاڑ دیتی ہے۔ انسان زبان سے کہتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں کہ آدمی
کو آدمی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ مگر ضد اور غصہ میں وہ ایک دوسرے پر
ایسی زیادتیاں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں رحم اور محبت کا مادہ ہی نہیں، ان کی
عقل انھیں بتاتی ہے کہ زندگی کا ایک دستور ہونا چاہیے، لیکن یہ دستور بن جائے تو ان
کی طبیعت کو اس کے عیب نکالنے اور اس کی خلاف ورزی کرنے میں مزا آنے لگتا ہے اور
ان کی عقل انھیں راہ راست پر لانے کے بجائے اور حیرانی میں ڈال دیتی ہے، انسانوں نے
جتنے بڑے کام کئے ہیں وہ اس یقین کی بدولت کئے ہیں کہ ان میں اس کی قدرت ہے لیکن
انھیں زیادہ تسکین اس سے ہوتی ہے کہ وہ مایوسی کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرلیں اور

نہیں کہ ہم تقدیر سے مجبور ہیں۔ انسان کی طبیعت من چلی، اس کا دل بے پروا، اس کا ارادہ آزاد نہ ہوتا تو اس کی کارگزاری بہت ہی حقیر ہوتی۔ مگر اس نے جو کچھ کیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ کر سکتا، اگر اس کی طبیعت علم اور عقل کو اپنا رہنما بنا سکتی، اگر اس کا دل صبر اور استقلال کو اپنی تربیت کا ذریعہ بناتا، اگر اس کا ارادہ پرند کی طرح پھدک کر درخت سے درخت اور پھول سے پھول پر نہ جاتا بلکہ اپنی منزل کو اپنی نظر میں رکھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی بہت مصیبتوں کا ذمے دار خود انسان ہے۔ لیکن اسے حواس کے قید خانے میں گرفتار کیوں کیا گیا، اگر قدرت کا منشا ریہ تھا کہ وہ ترقی کرے اور صحیح راستے سے نہ بھٹکے۔ برائی اور بھلائی کرکے اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کا جذبہ کیوں رکھا گیا، جب قدرت کا مقصد یہ تھا کہ انسان اپنے اصول یا تصور میں گم ہو جایا کرے۔ انسان کی زندگی ایک امتحان کی منزل ہے جس سے وہ گذر نہیں پاتا، ایک مسلسل آزمائش جس میں وہ پورا اترتا ہے تب بھی اُسے نجات نہیں ملتی، جب تک کہ اس کے اور اس کی دنیا کے درمیان موت کا پردہ نہ پڑ جائے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ انسان اتنا خون اور پسینہ بہا چکا ہے کہ وہ حواس کی قید سے آزاد ہونے کا حق دار بن گیا ہے اور میری درخواست ہے کہ اب آپ سب مل کر تقدیر کے خالق سے التجا کریں کہ وہ زمین والوں کی تقدیر کو بدل دے۔

ذہین بیوی

(ایک مکالمہ)

رشید صاحب ۔ صاحبو! آج کے موضوع گفتگو پر مجھے اندیشہ ہے ۔ آپ نے آزادی اور دلجمعی سے غور نہ کیا ہوگا ۔ غور کرنے کے لئے ذہن کی یکسوئی کی ضرورت ہے ۔ اور یکسوئی کیسے میسر آسکتی ہے ۔ جب آج کی گفتگو کا انجام رہ رہ کر ہمارے اور آپ کے سامنے آتا ہو ۔

جہاں تک بیوی کا سوال ہے ۔ میں سمجھتا ہوں ۔ ہر بیوی خواہ وہ عام طور پر کیسی ہی ہو ۔ شوہر کے حق میں ہمیشہ ذہین ہوتی ہے ۔ شوہر کو بیوی کی ذہانت سے اتنا سابقہ نہیں پڑتا ۔ جتنا اس کی ذہنیت سے ۔ اور یہ بیوی کی ذہنیت ہی ہوتی ہے جو شوہر کے لئے اسے ذہین بنا دیتی ہے ۔

میرے نزدیک میری اور آپ کی یہ دشواری اس طور پر دور ہو سکتی ہے ۔ کہ ہم سب صدق دل سے اس امر کا جلد سے جلد اعلان کر دیں ۔ کہ ہماری گفتگو قطعاً غیر جانبدارانہ ہوگی ۔ اور ہمارا روئے سخن نہ اپنی نیک بیویوں کی طرف ہے اور نہ کسی اور کی ۔ ہمارا روئے سخن صرف میکروفون کی طرف ہے ۔ اور مجھے یقین ہے ۔ کہ بیویاں خواہ وہ ذہین ہوں ۔ یا نہیں ۔ اس امر کی تصدیق کریں گی ۔ کہ کوئی شوہر خواہ وہ کتنا ہی مظلوم یا غبی کیوں نہ ہو ۔ میکروفون پر بیوی کو مخاطب نہ کریگا ۔

دوسری بات جو میرے ذہن میں آتی ہے ۔ وہ یہ ہے ۔ کہ کس بناء پر ذہین بیوی کو مستقل عذاب قرار دیا جائے ۔ مجھے موضوع گفتگو میں ایک جھول نظر آتا ہے ۔ کہ

اس موضوع کا انتخاب کرنے والا بیوی کے کاروبار سے ناواقف معلوم ہوتا ہے عورت کے ساتھ مستقل کا لفظ لانا ہی عورت سے ناواقفیت کی دلیل ہے مستقلاً نہ کوئی عورت ذہین ہوتی ہے۔ اور نہ عذاب۔ بات صرف اتنی ہے۔ کہ جس طرح اطباء نے اشیاء کا مزاج دریافت کیا ہے۔ کہ کون سی چیز کس درجہ میں گرم۔ خشک یا تر ہوتی ہے۔ اسی طرح ذہین بیوی بھی مختلف درجوں میں سرد خشک گرم تر ہوتی ہے۔ اور اسی اعتبار سے ذہین بیویاں مستقلاً یا عارضی طور پر عذاب بنتی رہتی ہوں یا نہیں۔ ان کے نماز مند شوہر مسلسل داخل حسنات ہوتے رہتے ہیں۔

غفور صاحب ۔ سید صاحب! گستاخی معاف۔ جس وقت آپ داخل حسنات ہو رہے ہوں۔ میرا دخل درمعقولات دینا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن ایک بات یاد رکھئے۔ کہ آپ ذہین بیوی کے عذاب کو جو رنگ دے رہے ہیں۔ وہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ کے عافیت بخیر ہونے کی بشارت نہیں دیجا سکتی۔

رشید صاحب غفور صاحب! میں تو اپنی عافیت کی طرف سے مطمئن ہوں۔ آپ بھی ذہین بیوی کی طرف سے مطمئن ہیں کہ نہیں۔

غفور صاحب آپ نے اطمینان کی بھی ایک ہی کہی۔ بھلا ذہانت اور طمانیت کا ساتھ کہاں اس کے طفیل تو جنت سے نکالے گئے۔ وہ دن اور آج کا دن سکون تک نصیب نہ ہوا۔ پھر بھلا جس سے اپنے ذہن کا بار نہ سنبھلتا ہو۔ اس پر بیوی بھی اپنی ذہانت کا بار لاد دے۔ تو کہاں ٹھکانا ہے۔ بہشت کے بدلے دے کر دنیا میں جگہ رہ گئی تھی۔ یہاں سے نکلے تو شاید دونوں جہاں سے ہی جائیں گے یہ مانا کہ شوہر ایک زمانے سے بیوی کی ناز برداری ہی نہیں۔ بار برداری کا کام بھی کرتے چلے آئے ہیں۔ خواہ بچے ہوں یا چلتے اور کوٹ ہوں یا دستانے۔

لیکن ذہانت کا یہ بار گراں تو سنبھالتے بھی نہ سنبھلیگا۔

رشید صاحب غفور صاحب! اب تک تو دوزخ سے ڈرایا گیا ہوں، اب آپ نے بہشت سے ڈرانا شروع کر دیا۔ لیکن آپ ذہین بیوی کو جس طرح پیش کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے کچھ آس بندھتی ہے۔ کہ اگر ہم آپ دونوں ذہین بیوی کے آشوب کو سمجھ جائیں۔ تو ہم کو یقیناً جنت نصیب ہوگی۔ اختر صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ یعنی ہمارے جنت نصیب ہونے کے بارے میں نہیں۔ بلکہ غفور صاحب کی ذہین بیوی کے بارے میں۔

اختر صاحب معاف فرمائیے گا مصیبت تو یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذہانت کا یقین ہی نہیں۔ بلکہ اس پر ناز بھی ہے۔ اور اس سے عشق بھی ہے۔ یہ جو آپ اپنے ذہن اور اپنی ذہانت کو مزے لے لے کر کوس رہے ہیں۔ یہ دراصل محبت بھری جھپکیاں ہیں۔ آپ کی مثال اس ماں کی سی ہے۔ جو اپنے بچے کو اپنی محبوب ترین شے اور دنیا کی خوبصورت ترین چیز سمجھتے ہوئے بھی صبح سے شام تک اس کے شریر اور نالائق اور پاجی اور شیطان اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہونے کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ اور اپنی مظلومی کے اظہار میں سارے جہاں کو سر پر اٹھا لیتی ہے دراصل وہ اپنی مظلومی کا اظہار نہیں کرتی۔ اپنے لاڈ اور پیار کا اظہار کرتی ہے۔ اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس امر کی اشاعت کرتی ہے۔ کہ اگر دنیا میں کوئی ماں ہے۔ تو وہ ہے۔ اور کوئی بچہ ہے۔ تو اس کا بچہ۔

غفور صاحب اختر صاحب! گستاخی معاف۔ مجھے تو آپ پر گھریلو ذہنیت کا بڑا گہرا سایہ پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ماں کی تشبیہ اچھی ہے۔ مگر یہاں کی ذہانت کی دلیل نہیں۔

رشید صاحب لیکن حسرت جب تک بیوی کی ذہانت کا مسئلہ طے نہ ہو جائے

ماں کی محبت یا ہمسایہ کے حقوق کا سوال اٹھانا کچھ غیر متعلق سا معلوم ہوتا ہے۔

اختر صاحب تو پھر میں اپنے دوست کو اس مال دار شخص کے مسابہ قرار دوں گا۔ جو اپنی دولت کا پرستار ہوتے ہوئے اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ وہ دولت کو ایک مصیبت اور عذاب بتاتا ہے۔ اور وقت بے وقت یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ کہ وہ ایک ایسا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ جس کو دوسرے یعنی وہ جو مال دار نہیں ہیں کسی طرح سنبھال ہی نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اس کو اپنی دولت حد سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اور اس کے تحفظ کے لئے وہ ضروری سمجھتا ہے۔ کہ دوسروں کو اس سے محروم رہتے ہی میں اپنی عافیت نظر آئے۔ اسی لئے وہ دولت کی برائیوں سے ساری دنیا کے کان پاٹ دیتا ہے۔

غفور صاحب اختر صاحب! اب آپ تبلیغ پر اتر آئے۔ مجھے تو اس میں بھی گھریلو رنگ نظر آرہا ہے۔ یاد ش بخیر ایک ذہین بیوی نے اپنے شوہر سے کیا خوب کہا تھا۔ کہ تمہاری ذہنیت کا تو یہ حال ہو گیا ہے۔ کہ اگر میں سیاہ کو سفید بتانے لگوں۔ تو تم میری بات ضرور کاٹ کر رہوگے۔ آپ تو ایک کانٹوں کے تاج کو پھول مالا بنانے کی فکر میں ہیں۔

رشید صاحب "کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں"

اختر صاحب چلئے اسے بھی جانے دیجئے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں۔ کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے ذہن پر فریفتہ ہوتا ہے۔ اور ذہانت کو اپنی ملکیت خاص خیال کرتا ہے یہی سبب ہے۔ کہ ہم ذہین بیوی کے تصور سے گھبراتے ہیں۔ مگر میری رائے میں تو یہ فرار پسندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ذہین بیوی

کو ایک عذاب سمجھنا اپنی زندگی کی ایک تلخ اور ناخوشگوار حقیقت سے فرار کا ذریعہ ہے ۔ اور بس ۔

غفور صاحب لیجئے اختر صاحب! آخر آپ بھی آئے نا زندگی کی تلخ اور ناخوشگوار حقیقتوں کی طرف۔ غنیمت ہے ۔ آپ نے کسی حقیقت کی تلخی کا اعتراف تو کیا ۔

رشید صاحب یعنی وہ جو کہا ہے ع شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے ذہن میں

اختر صاحب جی ہاں کیوں نہیں ہوتا دراصل یہ ہے ۔ کہ گھر کے باہر مردوں کی دنیا میں ہمیں اپنے سے زیادہ ذہین لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے ۔ اس سے ہماری خود پسندی کو ٹھیس لگتی ہے ۔ اور ہمارا جھوٹا جذبہ خود پسندی ۔ یا برتری مجروح ہو جاتا ہے ۔ ہم بھلا یہ کیوں چاہنے لگے ۔ کہ کوئی دوسرا ہماری ذہنی فضیلت کے مقابلہ میں اپنی ذہانت کا علم بلند کرے ۔ اور ہمیں نیچا دکھائے چنانچہ اس شکست کا انتقام لینے کے لئے ہم گھر کا رخ کرتے ہیں ۔ ذہین بیوی کو ایک عذاب قرار دینے سے یقیناً ہمارا مطلب اس کے سواء اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی ذہانت کے پندار کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھنے کی بدحواسانہ کوشش کر رہے ہیں ۔

رشید صاحب سنو سنو ، شرم شرم !

غفور صاحب لیجئے اختر صاحب! ایک خانگی محاذ تو تھا ہی ۔ آپ نے تو دلائل اور براہین کا نیا محاذ قایم کر دیا ۔ مگر مجھے ڈر ہے ۔ یہ بھی کہیں دوسری Maginot لائن ثابت نہ ہو ۔ یہ ٹوٹی تو پھر ساحل آب تک کہیں اور رکنے کی جگہ نہ ملے گی ۔ ایک ذہین بیوی کی طرح آپ نے میرے الفاظ کا وہ مفہوم لے لیا ۔ جس کا نتیجہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا ۔ میرے خیال میں ذہانت کوئی ایسی چیز نہیں جیسے کان

کے لئے کوئی نئی طرز کا آویزہ ۔ مگر مصیبت یہ ہے ۔ کہ اکثر ذہین عورتیں اس کا مقصد ایک آویزے یا ایک نئے بلاؤز Blouse سے زیادہ نہیں سمجھتیں ۔

رشید صاحب جزاک اللہ

غفور صاحب عورت ایک خوشنما پھول ہے ۔ لیکن بقول ایک صاحب حلا ۔ کانٹے سے ہی جانا کہ پھول ہے ۔ اور یہ کانٹا ہے حقیقت میں ذہانت کا کانٹا ۔ ذہین عورتوں نے نسوانیت کے پھول کو تو بھلا دیا اور سمجھیں کہ پھول بنا ہی کانٹے کے لئے تھا ۔ میری نزدیک ذہانت کوئی چندن ہار کی قسم کی چیز نہیں ہے ۔ بلکہ ایک ایسا وصف ہے جس کی بناء پر انسان زمین کے ذروں کو چھوڑ کر ستاروں سے الجھتا ہے، پھولوں کی طرف سے آنکھیں بند کرکے کانٹوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے، حیات اور کائنات کے ان بھیدوں کو ٹٹولتا ہے ۔ جو آج تک کسی کے ہاتھ نہ آسکے ۔ ایک مادام کیوری کی طرح معمل میں دن رات ایک کر دیتا ہے، تب کہیں جاکر انسانی بے عملی کی شب تاریک کو ایک نئی روشنی سے جگمگاتا ہے۔ کہیں یہی وصف Hypatia مصر کی مشہور فلسفی عورت کی طرح سکندریہ کے چوک میں منبر پر چڑھ کر ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کی تعبیر کرتا ہے اور پھر جاہل علماء اور عوام کے ہاتھوں سنگسار ہو کر شہید علم کا رتبہ حاصل کرتا ہے ۔

رشید صاحب اللہ آبرو رکھے اور تندرست

غفور صاحب اگر میں نے ذہانت کی غلط تعریف نہیں کی تو شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں گے ۔ کہ یہ ایک جنون ہے ۔ ایک آزار ہے ۔ ایک بوجھ ہے ۔ ایک ذمہ داری ہے ۔ جو شخص اس وصف کو اپناتا ہے ۔ وہ خود کو ایک

جنون میں مبتلا کرتا ہے۔ اور اس سے تو آپ انکار نہ کریں گے کہ بادشاہوں کی طرح کسی اقلیم میں بھی ایک مجنوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں اور ایسے دیوانوں کی یقیناً عورتوں کے طبقہ میں کسی ہستی کی ہے۔ اگر ایک مادام کیوری ہوئیں بھی۔ تو وہ ان مستثنیات میں سے ہیں، جو کلیہ کو ثابت کرتی ہیں۔

اب ذہن کی ان سب ذمہ داریوں۔ اس کی نوک اور چبھن کے ساتھ ساتھ انسان آخر انسان ہے۔ (خواہشوں۔ امیدوں اور ارمانوں کا ایک پتلا۔ اور یوں شاید) اسے حق بھی پہنچتا ہے۔ کہ وہ زندگی کی کم از کم ایک شعبے میں تو ذہن کے بوجھ سے آزاد ہو کر خالص انسانی مسرتوں کا لطف اٹھائے۔ اور جب یہ ہے۔ تو آپ ہی بتائیے کہ ذہین بیوی اس کے لئے عذاب نہیں ہوگی تو کیا ہوگی؟

رشید صاحب اس سے تو شاید یہ مطلب نکلتا ہے۔ کہ آپ مرد کی جنسی فوقیت کے قائل نہیں۔ اور عورت کو آرایش خلوت اور سرمایۂ عیش و نشاط سے زیادہ حیثیت نہیں دینا چاہتے۔ اس لئے میں آپ کا برا نہیں چاہتا۔ اپنے آپ کو بشارت دینا چاہتا ہوں۔

غفور صاحب جی نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں تو خانگی مملکت کی حدود میں داخل ہوتے ہی جنسی مساوات کا قایل ہو گیا۔ لیکن ہم نے تو یہ دیکھا۔ کہ دنیا بھر کے اصول و قوانین جہاں گھر کی چوکھٹ کے اندر پہنچے۔ سب کے سب گھریلو تعمیرات کی زد میں آ گئے۔ مردوں نے ایک زمانے تک اپنی فوقیت کا محاذ قایم رکھا اس سے پسپا ہوئے۔ تو بچاروں نے اپنا محاذ جدا قایم کیا۔ فطرت کا تقاضا بھی یہی تھا۔ کہ دونوں کے حلقہ ہائے عمل جداگانہ۔ دونوں کے محاذ علیحدہ ہوں

مگر گھریلو مملکت کی فاسسٹ قوتوں، ان کے بڑھے ہوئے حوصلوں کے مقابلہ میں اب اس محاذ کی بھی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ نہ معلوم کب ہالینڈ کے سمندری بند کی طرح ٹوٹ کر بہ جائے۔ خدا نخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ایک محاذ بالکل ناقص العقل۔ اور دوسرا عقل کے اٹمی بموں سے مسلح ہوا آج کل کیا جنگی محاذ اور کیا گھریلو دونوں پر عقل ہی کی ستم آرائی ہے۔ لیکن ڈر ہے۔ کہ گھریلو محاذ کہیں عقل اور ذہانت کا ایسا ٹایم بمب نہ تیار کردے۔ جو دونوں محاذوں کو زمین کے برابر کردے۔ تو میرا مطلب یہ ہے۔ کہ شوہر کو بیوی کی علمی۔ ادبی۔ کلچرل اور فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت نہیں، بلکہ اسکی ہمدردی اور دلسوزی کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے۔ کہ ہمدردی اور دلسوزی کو خالص ذہانت سے کچھ ایسا زیادہ واسطہ نہیں۔

رشید صاحب سبحان اللہ! مکرر ارشاد ہو!

اختر صاحب مگر بندہ نواز! سوال تو یہی ہے۔ کہ آپ زندگی میں یہ دست شفقت اور یہ سہارا کیوں چاہتے ہیں۔ عورت کیوں نہ اپنی مٹی کے دیوتا کے ٹوٹے ہوئے پاؤں جوڑنے کی کوشش کرے۔ اور جب وہ اپنی عظیم ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبا ہوا گھر واپس آئے۔ تو اس کے چرنوں کا امرت دھو دھوکر پیئے۔ آخر کیوں اس کے جنون اور نشہ کا آثار اس کی ذہانت کے زہر کا تریاق بنے۔ کیوں نہ وہ ایک دیوی بن کر اس دیوتا کے برابر بیٹھے۔ اور اس سے کہے۔ کہ میرے دیوتا! تمھارے یہ پاؤں مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ میرے آقا! ان پر کم از کم (Nickel Plating) تو کرا لو۔

غفور صاحب اچھا یونہی سہی۔ لیکن اگر دیوی دیوتا کو نکل پلیٹنگ کا مشورہ دے سکتی ہے۔ تو دیوتا بھی دیوی سے ایک نئے قلب اور صیقل شدہ قالب کا

مطالبہ کر سکتا ہے۔

رشید صاحب غفور صاحب! کوئی اور بات ہوتی تو میں آپ کی صلح اختر صاحب سے کرا دیتا۔ لیکن جب ذہین بیوی درمیان میں ہو تو آپ دونوں کے بیچ میں پڑنا میری بڑی نالائقی ہوگی۔ اور آپ دونوں کی بیویوں کی حق تلفی! میں تو کچھ اب سمجھتا ہوں کہ زیر بحث مضمون ہی غلط ہے۔ اس لئے ہم تینوں برخود غلط۔

بذات خود میں بیوی اور خدا کے مسئلہ پر سرے سے سوچنے ہی کا قائل نہیں ہوں۔ دونوں کو صرف تسلیم کرتا ہوں۔

(آل انڈیا ریڈیو دہلی)

سپاہی کا گیت

(کوپ رولو زادہ محمد فواد)

ذیل میں کوپ رولو زادہ محمد فواد (Köprülüzade Mehmet Fuat) کی ایک نظم کا ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے پیش کیا جاتا ہے۔ کوپ رولو زادہ محمد فواد جیسا کہ اس نام کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے، ترکی کے مشہور خاندان کوپ رولو کے رکن ہیں۔ یہ جدید ترکی کے ایک نامور ادیب اور شاعر ہیں استنبول یونیورسٹی میں ترکی زبان اور ادب کے پروفیسر ہیں۔ ان کے قلم سے ترکی ادب اور تاریخ پر کئی تصنیفیں نکل چکی ہیں، منجملہ ان کے دو نہایت مشہور ہوئی ہیں اول (Türk Edebiyati Tarihi) (ترکی ادب کی تاریخ) اور دوم Türk Edebiyatinda İlk mutasavviflar (ترکی ادب میں پہلے صوفیوں کا درجہ)

موجودہ نظم اول بار پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں شائع ہوئی اس میں ماضی اور حال دونوں کا نہایت پر اثر طریقے پر ذکر کیا گیا ہے۔ (ریاض الحسن از روما)

(۱)

دریائے ڈینوب کے کنارے سرو کی قطاروں میں سے۔
بادِ صبا گذرتی ہے اور خاموشی سے روتی ہے
گلاب کے چمن میں (بلبل کے بجائے آج) الّو بولتا ہے ....
یہ ویرانے ماضی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

(۲)

جہاں لوگ نماز ادا کرتے تھے وہاں (آج) گھاس اُگی ہے اور ایک پتھر بھی (نشان کا) باقی نہیں رہا

چشموں سے (اب) خون کے آنسو بہتے ہیں۔
وہاں ایک خوب صورت معشوق تھا، جس کی چتونوں سے پریشانی ٹپکتی تھی۔
اور اس کے سفید ماتھے پر ایک سیاہ چادر پڑی ہوئی ہے۔
شکستہ میناروں سے (اب) اذان کی آواز نہیں سنائی دیتی۔
تمام چولھوں کی آگ بجھ گئی ہے اور دیگ الٹے پڑے ہیں
لیکن، میری آواز کا جواب دینے والے صرف برفانی پہاڑ تھے۔

---

(۴)

چڑیاں بید کے درختوں پر
اپنی پرانی داستانیں دہراتی ہیں۔
اکثر راتوں کو دریائے ڈینوب ماتم کرتا ہے
کیونکہ اس کے سینے میں کتنے بے کفن شہید دفن ہیں۔

---

(۵)

باغوں میں فصل کے وقت انگور میں مٹھاس نہیں رہی۔
باغی غلام نے حراج دینا بند کر دیا ہے۔
اور سات بادشاہوں نے پھر سے تاج پہنا ہے۔
دگوبا، شاہین کے نشیمن کو کووں نے گھیر لیا ہے

Shahim ynuasini Kargalar Sarmish

لے یہاں دو باتیں قابل لحاظ ہیں، اول ترکی لفظ (Karga) کو لیجیے۔ اس کے معنی کوے کے ہیں۔ اب کاگا کرگا، کوا کی صوتی اور معنوی حالت پر غور کیجیے، کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا

(۶)

اور پرانے شاعر آگے بڑھ! اور ہاتھ میں پھر رباب لے۔
اور اپنے نغموں سے دشمن کے دل میں ہیبت پیدا کر۔
اور کہہ دے کہ اس خاموش سیلاب کو حقارت سے نہ دیکھے۔
(کیونکہ) اس نے اکثر قوموں پر فتح پائی ہے۔

کہ بہت دور ماضی میں وسط ایشیا کی یہ زبان ویدوں کی زبان سے قریب تھی اس سلسلے میں دو چار الفاظ اور بھی مل سکتے ہیں مگر یہ میدان اب تک بالکل خالی رہا ہے اس لئے تحقیقات کی ضرورت ہے۔ دوسری چیز کا ذکر ایک ادبی لطیفے کے طور پر کروں گا۔ آخری مصرعے میں جو تشبیہہ پیش کی گئی ہے۔ اسے بالکل اسی ترکیب کے ساتھ علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم باغی مرید (بال جبریل) میں استعمال کیا ہے۔ پیروں کے متعلق کہتے ہیں: میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد۔ زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کا دماغ ایک ہی راستے پر گیا، کیونکہ دونوں فارسی شاعروں سے متاثر ہوئے ہیں۔

د مبر ۱۹۶۵ء

پھول

یہ پھول جب صبح کو خواب سے جاگے۔
تب کتنے شاداں اور پر رونق تھے۔
لیکن شام کو ان کی ساری آہ و زاری بے کار ہو گی۔
(کیونکہ) اُن کو ٹھنڈی رات کی آغوش میں سونا ہو گا۔
آسمان پر جو رنگا رنگی پھیل رہی ہے
اور جو سفید ارغوانی اور سنہری قوس قزح میں بدل رہی ہے۔
وہ انسانی زندگی کے لئے ایک مفید تجربے کا پتہ دیتی ہے۔
آہ! یہ سارا نظارا ایک ہی دن میں ختم ہو جاتا ہے!
صبح کو کلی نے آنکھ کھولی
اور جب آنکھ کھولی تو پیری کا عالم تھا۔
گویا زندگی اور موت کا فسانہ ایک کلی میں پنہاں تھا۔

Cuna ysepulcro enunboton hallaron

یہی حال انسانی زندگی کا ہے
یعنی انسان ایک دن میں پیدا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔
خواہ وہ کتنا ہی زندہ رہا ہو مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند گھنٹوں سے زائد نہیں جیا۔

پیدرو کالدیروں دے لا بارکا

Pedro caldelón dela Barca

ہسپانوی شاعر

ترجمہ ریاض الحسن از مدما

۱۹۶۵ء

سہارنپور کی برادریوں کا جائزہ

برادریوں کے جائزہ کا کام صرف شہر سہارنپور تک محدود رکھا گیا۔ اس کام کے لیے کچھ مسلم اور کچھ ہندو برادریوں کا انتخاب کیا گیا۔ شہری زندگی میں جن برادریوں کو اہمیت حاصل تھی، ان میں سے بیشتر اس جائزہ میں شامل کر لی گئی ہیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے کچھ برادریاں جائزہ میں شامل نہیں کی جا سکیں۔ شہر کی مسلم برادریوں میں جن کا جائزہ لیا گیا، وہ یہ تھیں:-

(۱) مومن انصار (جلاہے تیلی) (۲) رانگڑ (راجپوت) (۳) گاڑے (۴) قریشس قصائی (۵) بنجارے (۶) چوب فروشان (کلال) (۷) شیخ (نومسلم) (۸) کمبوہ (۹) شیخ زادے اور سید۔

سہارنپور شہر کی جن غیر مسلم برادریوں کا جائزہ لیا گیا اُن کے نام یہ ہیں

(۱) چمار (۲) سینی (۳) جین (۴) کھتری (۵) بوہرے (۶) اگروال

مسلم برادریوں کے بارے میں ایزد حسن صاحب ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول نے ایک تخمینہ دیا تھا جو بغیر اس بات کی ضمانت کئے ہوئے کہ یہ صحیح ہے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مومن انصار (نور باف و روغن کر)	۱۴	تا	۲۰	ہزار
راجپوت اور پٹھان	۱۲	"	۱۵	"
لوہار اور بڑھئی	۸	"	۱۰	"
قریشس (قصائی	۴	"	۶	"
شیخ زادے	۲	"	۳	"

کمبوہ

سید

شیخ نومسلم

بنجارے

نائی

دھوبی ایک ہزار

فقیر

سبزی فروش دکو بجڑے

درزی

چوب فروشاں کلال

پنجابی (بساطی)

مومن انصار کی برادری شہر سہارنپور میں روغن گروں اور لوریا فوں کی برادریوں کے سربرآوردہ افراد کے اندر چونکہ عام جذبہ ایک دوسرے کو باہم متحد سمجھنے کی طرف پایا گیا، اس لئے ہم نے بھی ان کا مطالعہ متحدہ صورت ہی میں کرنا مناسب سمجھا۔ یہ چیز کس حد تک الکشن کی سیاسی مصلحت پر مبنی تھی اور کس حد تک اصل حقیقت پر اس کی تحقیقات کا ہم کو موقع نہیں مل سکا۔ لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ان دونوں برادریوں کے افراد کے درمیان سہارنپور میں شادی بیاہ نہیں ہوتا، اور ان کی چودھرایت کے نظام بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔

اس برادری کے بیدار اور تعلیم یافتہ افراد اپنے تئیں عرب نسل کا تبلاتے ہیں اور اپنا سلسلہ نسب ایوب انصاری سے ملاتے ہیں۔ پچھلے دنوں اس برادری کے

لوگوں اور دوسرے شیخ انصاریوں میں خاصا گرم بحث و مباحثہ جاری رہا، ایک کتاب مفتی شفیع صاحب دیوبندی نے "نجابت النسب" کے نام سے لکھی تھی جس میں اس بات سے انکار کیا گیا تھا کہ مومن انصار اور قریش کا تعلق عرب نسل سے ہے اس کے جواب میں مومن انصار کی طرف سے کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں خاص طور پر لائق ذکر "تیغ براں" مصنفہ سہراب صاحب سہارنپوری، بازار نخاسہ اور تذکرۃ الانصار، مصنفہ محمد خورشید صاحب امرتسری ہیں اس کے علاوہ مومن گزٹ کانپور فتنہ جلاہا سلسلہ مقدمہ گورکھپور کو بھی مطالعہ کے لائق بیان کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے مجھے اس لٹریچر کے مطالعہ کا موقع نہیں مل سکا۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ بحث و مباحثہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس لئے میں اس پر اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں دے سکتا۔

اللہ رکھا اینڈ سنز ووڈ کارورز اور مینو فکچرز کے مالک کے بیان کے مطابق جن کا تعلق مومن انصار کی برادری سے ہے، شہر سہارنپور کے مندرجہ ذیل محلوں میں مومن انصار کی برادری پھیلی ہوئی ہے۔ زیادہ تر نیا بانس شاہ جی، ٹوپیا سرائے، کھالہ پار، شہر تیا پیر، محلہ تماندار، ہرن ماران، محلہ شاہ بہلول، محلہ یحییٰ شاہ، محلہ آتش بازان، محلہ منڈی شوپری، خان عالم پورہ، سب سے بڑی بستی اور منتفرق طور پر شہر کے مختلف محلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ محلہ ڈھولی کھال میں بھی سو دو سو آدمی ہوں گے۔ عربی مدرسہ کے پاس بھی رہتے ہیں۔

برادری کے لوگوں میں نہایت سختی کے ساتھ صرف آپس کے لوگوں میں شادی بیاہ ہوتا ہے۔ برادری کے باہر بالکل نہیں ہوتا، تھوڑا سا بھی فرق ہو جائے تو نہ لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ بد چلنی کے سلسلے میں بھی برادری سے خارج کر دیا جاتا ہے روغن گروں اور نوربافوں میں بھی آپس میں شادی بیاہ کا لین دین نہیں ہے مرادآباد دیوبند اور بریلی میں تو ہے لیکن یہاں شہر اور دیہات میں نہیں ہے۔

برادری کی پنچایت ہے، ان کے الگ الگ تھوک ہیں اور دھڑا بندی پائی جاتی ہے۔ نوربافوں میں سب سے پہلے صرف ایک دھڑا تھا بعد میں تین دھڑے ہوئے۔ اس کے بعد ایک دھڑے کا اور اضافہ ہوا، ہر دھڑے کا ایک چودھری ہوتا ہے، اور چودھرایت کو شادی بیاہ کے معاملے میں اور ہر معاملے میں بڑا دخل ہوتا تھا، تینوں دھڑوں کے چودھری کبھی مل کر اور کبھی علیحدہ علیحدہ نظام کو سنبھالے رہتے تھے لیکن چوتھے دھڑے کے پیدا ہو جانے سے نظام میں ابتری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان دھڑوں میں سے ایک کا نظام تو آپس کی نا اتفاقی سے بالکل ٹوٹ گیا ہے، باقی تین دھڑوں میں بھی تفریق ہو گئی ہے اور ان کی تنظیم اچھی نہیں رہی ہے۔ چودھرایت کا اثر کم ہوتا جا رہا ہے پنچایت اور چودھری کے فیصلے کو اب زیادہ نہیں مانتے، شرما شرمی ایک دوسرے کا لحاظ کر لیتے ہیں۔ مومن انصار کی اس نا اتفاقی سے دوسری برادریوں کے لوگ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعداد سب سے زیادہ ہونے کے باوجود یہ اپنی برادری کے نمائندے میونسپلٹی وغیرہ میں نہیں بھیج سکتے، بلکہ دوسری برادری کے لوگوں کو منتخب کرتے ہیں۔

ان چاروں دھڑوں میں بیٹی کا لین دین ہوتا ہے، شادی غمی کے موقع پر صرف اپنے دھڑے کے لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جب دھڑا ایک تھا تو کئی کئی ہزار آدمیوں کے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا تھا، اسی لئے شادی بیاہ میں خرچ زیادہ تھا اور سب کچھ لٹا بیٹھتے تھے، لیکن اب اس سال تو کچھ نکاح ایسے ہوئے ہیں جن میں پانچ آدمیوں کو بھی نہیں بلایا جا سکا، جب مکان جائداد یں نکل گئیں تو اب کچھ عقل آئی ہے۔ یہ لوگ ابھی تک کپڑا پہننا نہیں جانتے، امیروں کے گھر میں زیور ہے۔ لیکن وہ بھی حیثیت سے زیادہ نہیں۔ غریبوں کے یہاں نہیں ہے، پیر پرستی، فقیر پرستی پہلے تو بہت تھی لیکن اب دھوکہ کم کھاتے ہیں۔ تعلیم بہت

کم ہے - جبریہ تعلیم میں جرمانہ ادا کرتے ہیں لیکن بچے کو تعلیم نہیں دیتے -

چھرے اور تاڑی کی لت میں ہر گھر کا کوئی نہ کوئی بچہ مبتلا ہے ، کچھ سنبھل جاتے ہیں اور کچھ میں عمر بھر یہ عادت رہتی ہے - سینما بھی بہت کثرت سے جانے لگے ہیں بھوکے رہ جائیں گے ، لیکن سینما ضرور جائیں گے - جس کے گھر میں جیسی تنظیم و تہذیب ہے اسی پردہ چل رہا ہے -

لیکن ماسٹر ایز حسین صاحب کا بیان اس سے کچھ مختلف ہے ، ان کے بیان کے مطابق بری عادتیں نہیں پائی جاتیں - لیکن پھر بھی ترقی کی طرف قدم اٹھانا نہیں چاہتے منجدیں ان سے بھری ہوئی ملتی ہیں ، زکوٰۃ ، مہمان نوازی ، شادی بیاہ اور رسومات قبیحہ میں پیش پیش رہتے ہیں - بیدا مغز لوگ رسومات قبیحہ کو چھوڑ رہے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ ان کے پاس پیسہ نہیں رہا ہے - فقیر پرستی اور پیر دوستی ہے لیکن علم پرستی نہیں ہے - تعلیم کی حالت یہ ہے کہ گریجویٹ کوئی نہیں ، انڈر گریجویٹ ایک اور میٹرک ایک اور دو درجن کے درمیان ہیں ، لڑکوں میں بھی تعلیم کا شوق نہیں ہے اور لڑکیوں میں بالکل نہیں ہے ، مذہبی تعلیم میں حافظ قرآن بہت سے ہیں - مولوی کی سند کسی نے نہیں لی ہے -

برادری کی ایک انجمن بھی ہے لیکن اس کو خاطر خواہ فروغ نہیں ہے - انجمن کا نام جمعیۃ الانصار ہے - جس کا آل انڈیا اور صوبے کی انجمن سے الحاق ہے -

روغن گروں میں بھی چودھرایت کا نظام پایا جاتا ہے اور ویسا ہی ہے جیسا نوربافوں میں ہے - روغن گروں میں دو چودھری ہیں ، چودھری محمد اسمٰعیل صاحب اور چودھری شادی صاحب محلہ ٹوبیا سرائے -

امتیاز رکھے صاحب کے بیان کے مطابق مومن انصار میں جس میں نورباف اور روغن گر دونوں شامل ہیں - کنگھی بنانے کا کام بہت کثرت سے ہوتا ہے ، قریب قریب

پورا کام اسی برادری کے ہاتھ میں ہے اور کوئی دوسری قوم اس کام کو نہیں کرتی، میوہ فروشی باغات کی حفاظت و ٹھیکہ کے کام۔ بھٹیلہ کی ڈھلائی اور ٹپلہ کے کام تقریباً ۹۰ فی صد ان ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ راج کے کام میں یہ لوگ ۵۰ فی صد ہیں۔ سبزی کے کام میں بھی بہت ہیں۔ غلہ کی تجارت میں ایک عبدالسلام صاحب ہیں۔ آج اُن کی حیثیت دس پندرہ لکھ روپے کی ہے۔ کپڑے کی تجارت میں دیہات سے گاڑھا کھدر لاتے ہیں۔ درزی کے کام میں بھی بہت ہیں۔ تقریباً ۵۰ فی صد درزی اسی برادری کے ہوتے ہیں، فیکٹریوں اور ملوں میں بھی بہت ہیں۔ ریلوے کیرج شاپ میں بھی مومن انصار کے افراد ہیں۔ چاول کو سیلا کرنے کا کام دھان کو کوٹنے کا کام بھی سب یہی لوگ کرتے ہیں، بھینسوں کے کام میں یعنی دودھ بیچنے کے کام میں بھی ہیں اور کاشت کے کام میں بھی ہیں، قصائیوں کے پیشہ میں تو صرف چند ایک ہوں گے، باقی ہر پیشہ اور ہر کام میں گھسے ہوئے ہیں۔ خانگی ملازمت بھی کثرت سے کرتے ہیں۔ خوش حال لوگوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ملے گا جہاں ان کی عورتیں اور مرد کام کرتے ہوئے نہ ملیں۔

ماسٹر ایزد حسن کے بیان کے مطابق مومن انصار حسب ذیل کام کرتے ہیں:۔

میوہ فروشی، پارچہ فروشی، چوب فروشی، بیضہ فروشی، سبزی فروشی، ملازمت، حمالی، مزدوری، معماری، نجاری (بڑھئی کا کام) کارخانہ دار (نقشین کام اور چاول کے) پارچہ بافی، روغن گری، تجارت، چاول، کھلی، دال سونٹھ ہینگ، مسالہ جات، خیاط (درزی) فیکٹری میں بھی ملازم ہیں، پولیس اور فوج میں خال خال ہوں گے۔

کاروبار اوسط درجے کا کرتے ہیں۔

میوہ فروشی میں یہ لوگ پچاس فی صدی ہیں۔ آڑھت، ٹھیکیداری خوپچہ کا کام کرتے ہیں۔ آڑھت میں پھل باہر بھی بھیجتے ہیں، اور نیلام بھی کرتے ہیں۔ اس کام میں خاص طور

پر برادری کے حسب ذیل لوگ ممتاز ہیں:۔

۱ کلّے خاں صاحب ٹھیکیدار ریلوے اسٹیشن و بازار

۲۔ نور محمد صاحب سبزی منڈی

۳۔ عبداللطیف محمد حسن صاحبان

پارچہ فروشی میں دیسی بدیسی سب کپڑا بیچتے ہیں۔ بڑی دوکان کوئی نہیں ہے۔ گلگڑ گنج میں دویم درجہ کی پانچ چھ دوکانیں ہیں، ان میں حاجی محمد شفیع صاحب بزاز بازار گلگڑ گنج ممتاز ہیں:۔

چوب فروشی میں بھی دویم درجے کا کاروبار ہے، ان میں لائق ذکر کام نور محمد صاحب محلہ شاہ بہلول اور زندہ حسن صاحب محلہ شاہ بہلول کے ہیں، بیضہ فروشی میں ممتاز لوگ یہ ہیں

(۱) عبدالمجید عبدالوحید (۲) محمد یوسف (۳) عبدالرحمٰن

سبزی فروش اور میوہ فروش :۔ عبدالرحمٰن، عبدالغنی

ملازمت :۔ (۱) ماسٹر ایز حسن صاحب اسلامیہ ہائی اسکول سہارنپور

۲۔ بابو بشیر احمد صاحب روڈز اینڈ بلڈنگس کلرک

کارخانہ دار :۔(۱) عبدالوحید صاحب نقشین چوب کا کام محلہ منڈی (۲) محمد عمر یا محمد ابراہیم (۳) اللہ رکھا اینڈ سنز

چاول کے کاروبار میں :۔(۱) عبدالسلام صاحب (۲) چودھری شادی، (۳) چودھری اسمٰعیل محمد ٹوپیا سرائے (۴) ابراہیم صاحب بھجڑی والا، نیا بانس باغات اور چاول دونوں کا کام۔

پرچون کے کام میں :۔ محمد شفیع صاحب بازار شہید گنج

مندرجہ بالا لوگوں میں عبدالسلام صاحب کے علاوہ باقی اور سب لوگ

پانچ ہزار سے پچاس ہزار تک کی حیثیت کے ہیں۔

عبدالسلام صاحب کی پندرہ بیس لاکھ کی حیثیت ہے، ڈیڑھ لاکھ وار بانڈ میں دے چکے ہیں اور ایک لاکھ اور دینے والے ہیں۔ سہارنپور میں آڑھت کی آٹھ دس بڑی فرمیں ہیں، ان میں ایک عبدالسلام صاحب کی ہے۔ مسلمانوں کی اور کوئی بڑی آڑھت کی فرم نہیں ہے آڑھت کے کام میں عبدالسلام صاحب کا نمبر تیسرا ہے۔ پہلا نمبر ایک ماروارمی فرم سیٹھ مامن چند رادھاکشن کا ہے، جن کی حیثیت پچاس لاکھ کی ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری مارواڑی فرم سیٹھ شادی رام ادمی رام کا نمبر ہے، ان کی چھ سات دوکانیں ہیں مجموعی حیثیت ۲۰ لاکھ کی ہوگی۔ تنہا سہارنپور کی دوکان کو دیکھا جائے تو پانچ لاکھ کی حیثیت ہوگی، اور اس لحاظ سے عبدالسلام صاحب کا نمبر دوسرا ہو جائے گا، عبدالسلام صاحب گڑ، شکر، چاول، گیہوں، چنا سب چیزیں باہر بھیجتے ہیں۔ سہارنپور کا چاول کی وجہ سے بڑی منڈیوں میں شمار ہوتا ہے۔ عبدالسلام صاحب کو خاص شہرت چاول کی تجارت کے سلسلے میں ہے۔ مال کی فراہمی میں عبدالسلام صاحب کو بہت زیادہ سہولت ہے۔ یہ اگر چاہیں تو ہندو دوکانداروں کی فراہمی تک بند کرسکتے ہیں، کیونکہ چاول کے صاف کرنے اور سیلا کرنے کا کام ان کی برادری والے کرتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کو روپیہ پیسہ لینے کی بنکوں سے ضرورت نہیں ہوتی۔ اپنے ہی روپئے سے ہمیشہ کاروبار کرتے ہیں، نقد روپے کے لحاظ سے مسلمانوں میں سادھو، کمہار اور عبدالسلام صاحب بہت بڑی حیثیت کے لوگ ہیں۔ سکنا کی جائداد بہت بڑی اُن کے پاس ہے۔

ان کا کاروبار گجرات کاٹھیاواڑ سے زیادہ ہے۔ یوپی اور پنجاب کے ہندوؤں میں تو تعصب پایا جاتا ہے۔ وہ تو ایسا کرسکتے ہیں کہ اگر ہندو ۱۴ر آڑھت لے رہا ہے اور مسلمان ۱۲ار یا ۱۳ار تو وہ ہندو ہی کو ترجیح دیں گے، لیکن گجرات، کاٹھیاواڑ کے ہندوؤں میں یہ تنگ نظری نہیں ہے۔ اس لئے گجرات وغیرہ کی طرف (ماؤنٹ آبو کے آگے)

ہندوؤں سے بھی کاروبار ہے۔ یوپی اور پنجاب میں صرف مسلمانوں سے ہے۔

سہارنپور میں اس قسم کے کاروبار میں جو دوسرے مسلمان لگے ہوئے ہیں ان سب کی کچی آڑھت ہے، یعنی مقامی کاروبار ہے۔ مال باہر نہیں بھیجتے، بلکہ کاشتکاروں کا مال مقامی خریداروں کے ہاتھ فروخت کرتے رہتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کا کاروبار سو سال سے چل رہا ہے۔ ابتدا میں کچی آڑھت کا کام تھا۔ زیادہ ترقی دادا کے زمانے سے ہے۔ اصل ترقی حافظ عبدالرحمٰن صاحب کے زمانے سے ہوئی۔ انھوں نے پکی آڑھت کا کام شروع کیا۔ اس کام میں ان کے بیٹے عبدالسلام نے مدد دی اور انھوں نے اس کام کو بیس گنا کر دیا، عبدالسلام اور عبدالقیوم دو بھائی ہیں۔ عبدالقیوم ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ عبدالسلام صاحب بالکل نوجوان ہیں۔ انھوں نے سہارنپور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں میٹرک تک تعلیم پائی ہے، کھیل کا بہت شوق تھا۔ یہ میونسپل کمشنر بھی ہیں۔ بازار شہید گنج میں ان کی دوکان ہے۔

سہارنپور میں ایک مرچنٹس چیمبر موجود ہے۔ جس کے غلّہ کا سٹہ کرنے والے لوگ ممبر ہوتے ہیں۔ عبدالسلام صاحب کو اس کا ممبر بنانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن وہ اس کے ممبر نہیں بنے۔ سٹہ چاول کا نہیں ہوتا، اور آج کل باقی اور دوسری چیزوں کا بھی سٹہ بند کرا دیا گیا ہے۔

مومن انصار برادری کے لوگ عام طور پر مزدور پیشہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی مالی حالت اور جماعتی حیثیت بھی اچھی نہیں ہے۔ مزدور کی حیثیت سے یہ لوگ بہت محنتی اور بے عذر ہوتے ہیں۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان سب کام میں لگے رہتے ہیں۔ کسی کام کے کرنے میں ان کو عذر نہیں ہوتا۔ اس برادری کے ترقی نہ کرنے کا بڑا سبب تعلیم نہ ہونا ہے۔ اب دولت اور آمدنی میں ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن اس کو ٹھکانے سے خرچ کرنے کا طریقہ نہیں معلوم ہے۔ چمکنے اور نمایاں ہونے کا موقع

انھیں نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس سرکاری ملازمتیں ہیں، نہ قانون داں ہیں نہ ان میں حکام رسی ہے۔ برادری میں کوئی وکیل نہیں ہے۔ لکیر کے فقیر ہیں نئی بات کوئی نہیں پیدا کرتے۔

برادری کے لوگ مقروض کسی کے نہیں ہیں، اور نہ کسی کے پابند ہیں۔

نورباف برادری میں حسب ذیل لوگوں کو ممتاز کہا جاسکتا ہے:۔

(۱) عبدالرزاق صاحب ٹیلر ماسٹر (۲) عبدالرحمٰن عبدالغنی تاجران میوہ (۳) حافظ عبدالکریم عبدالرحیم بساط خانہ (۴) حاجی عبدالکریم ٹیلر ماسٹر خان عالم پورہ، (۶) محمد شفیع صاحب پرچوں کی دکان بازار شہید گنج (۷) ماسٹر غلام محمد صاحب جراب فروش ہرن ماراں (۸) عبدالشکور صاحب جراب ساز (ہوزری) ہرن ماراں (۹) حمید الکریم محمد اسحاق صاحبان ہوزری ہرن ماران (۱۰) حاجی محمد اسمٰعیل حبیب احمد صاحب سوداگران پرچونی بازار لوہانی سرائے ان کی شاخ منصوری میں بھی ہے (۱۱) عبدالحفیظ عبدالرزاق صاحب پرچونی اور کپڑے کا کاروبار لوہانی سرائے۔

روغن گر برادری میں حسب ذیل لوگ ممتاز ہیں:۔

(۱) عبدالسلام صاحب تاجر چاول و میونسپل کمشنر (۲) محمد ابراہیم صاحب بھجڑی والا باغات اور کھیتی باڑی باغبانی و کاشتکاری (۳) چودھری محمد اسمٰعیل صاحب چاول کا کاروبار (۴) چودھری شادی صاحب چاول کا کاروبار (۵) حافظ سلطان احمد صاحب تیل، کھل اور گھی کا کاروبار کچی آڑھت۔

نوٹ:۔ عبدالسلام صاحب کے علاوہ باقی مندرجہ بالا سب لوگوں کی حیثیت پانچ ہزار اور پچاس ہزار کے درمیان سمجھنا چاہیے۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب

عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ	۲۲۴۴۰۶۰
ادا سرمایہ	بارہ لاکھ پچاس ہزار	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمد آباد، کانپور، پشاور

سیلون اور فلسطین

TEL-۷۱۷

ادارۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

۱۔ قاعدہ ۴ر — ۲۔ دس سبق ۴ر

- ۱۔ نماز ۴ر
- ۲۔ حکایتیں اول ۴ر
- ۳۔ 〃 دوم ۴ر
- ۴۔ حبیب خدا ۴ر
- ۵۔ نظمیں ۴ر
- ۶۔ میونسپلٹی ۴ر
- ۷۔ صدیق اکبر ۴ر
- ۸۔ خط کتابت ۴ر
- ۹۔ ضلع کا انتظام ۴ر
- ۱۰۔ قومی گیت ۴ر
- ۱۱۔ غزلیں ۴ر
- ۱۲۔ ہمارا ہندوستان ۴ر
- ۱۳۔ اماں بھی پڑھنے لگے ۴ر
- ۱۴۔ عمر فاروق ۴ر
- ۱۵۔ ڈسٹرکٹ بورڈ ۴ر
- ۱۶۔ شہید کربلا ۴ر
- ۱۷۔ ہماری دنیا ۴ر
- ۱۸۔ ایشیا ۴ر
- ۱۹۔ یورپ ۴ر
- ۲۰۔ قصہ فسانۂ عجائب ۴ر
- ۲۱۔ مثنوی میر حسن ۴ر
- ۲۲۔ گل بکاؤلی ۴ر
- ۲۳۔ چار درویش اول ۴ر
- ۲۴۔ 〃 〃 دوم ۴ر
- ۲۵۔ 〃 〃 سوم ۴ر
- ۲۶۔ چار درویش چہارم ۴ر
- ۲۷۔ قصہ حاتم طائی اول ۴ر
- ۲۸۔ 〃 〃 دوم ۴ر
- ۲۹۔ 〃 〃 سوم ۴ر
- ۳۰۔ 〃 منصور موہنا ۴ر
- ۳۱۔ 〃 فردوس بریں ۴ر
- ۳۲۔ لیلیٰ مجنوں ۴ر
- ۳۳۔ شکنتلا ۴ر
- ۳۴۔ تانگے والا ۴ر
- ۳۵۔ بھشتی ۴ر
- ۳۶۔ صوبے کی حکومت ۴ر
- ۳۷۔ حکومت ہند ۴ر
- ۳۸۔ جمہوریت ۴ر
- ۳۹۔ دوہے ۴ر
- ۴۰۔ دلچسپ شعر ۴ر
- ۴۱۔ مرثیے ۴ر
- ۴۲۔ مسدس حالی ۴ر
- ۴۳۔ حالی کی نظمیں ۴ر
- ۴۴۔ گنتی ۴ر
- ۴۵۔ بڑی گنتی ۴ر
- ۴۶۔ پہاڑے پیمانے ۴ر
- ۴۷۔ اجرت کا حساب ۴ر
- ۴۸۔ تنخواہ کا حساب ۴ر
- ۴۹۔ چاند تارے ۴ر
- ۵۰۔ نزلہ زکام ۴ر
- ۵۱۔ حالات قرآن مجید ۴ر
- ۵۲۔ تعلیمات ۱ (عقائد) ۴ر
- ۵۳۔ 〃 ۲ (عبادات) ۴ر
- ۵۴۔ 〃 ۳ (اخلاق) ۴ر
- ۵۵۔ 〃 ۴ معاملات ۴ر
- ۵۶۔ قصص قرآن مجید ۱ ۴ر
- ۵۷۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۵۸۔ کعبہ شریف ۴ر
- ۵۹۔ حدیث شریف ۴ر
- ۶۰۔ عثمان غنی ۴ر
- ۶۱۔ علی مرتضیٰ ۴ر
- ۶۲۔ صحابہ کرام ۱ ۴ر
- ۶۳۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۶۴۔ 〃 〃 ۳ ۴ر
- ۶۵۔ 〃 〃 ۴ ۴ر
- ۶۶۔ 〃 〃 ۵ ۴ر
- ۶۷۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ۴ر
- ۶۸۔ حضرت غوث پاک ۴ر
- ۶۹۔ اجمیری خواجہ ۴ر
- ۷۰۔ نظام الدین اولیا ۴ر
- ۷۱۔ گوتم بدھ ۴ر
- ۷۲۔ کرشن کنھیا ۴ر
- ۷۳۔ رام کہانی ۱ ۴ر
- ۷۴۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۷۵۔ افریقہ ۴ر
- ۷۶۔ امریکہ ۴ر
- ۷۷۔ جنوبی امریکہ ۴ر
- ۷۸۔ سرزمین ہند ۴ر
- ۷۹۔ صوبے ۴ر
- ۸۰۔ دیسی ریاستیں ۴ر
- ۸۱۔ داستان امیر حمزہ ۱ ۴ر
- ۸۲۔ 〃 〃 ۲ ۴ر
- ۸۳۔ 〃 〃 ۳ ۴ر
- ۸۴۔ 〃 〃 ۴ ۴ر
- ۸۵۔ 〃 〃 ۵ ۴ر
- ۸۶۔ کہاوتیں ۴ر
- ۸۷۔ پہیلیاں ۴ر
- ۸۸۔ گرونانک ۴ر
- ۸۹۔ مثنوی میر حسن ۴ر
- ۹۰۔ گلستان ۴ر
- ۹۱۔ احمد خاں دکاندار ۴ر
- ۹۲۔ عبدالرحمٰن راج ۴ر
- ۹۳۔ نصیب خاں حجام ۴ر
- ۹۴۔ خدا خدمت گار ۴ر
- ۹۵۔ پیارے خاں درزی ۴ر
- ۹۶۔ حفیظ خاں خانساماں ۴ر
- ۹۷۔ جمن بڑھئی ۴ر
- ۹۸۔ سمدھو حلوائی ۴ر
- ۹۹۔ میرا منا ۴ر
- ۱۰۰۔ ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے ۴ر

مکتبہ جامعہ دہلی


WHAT SCIENCE CAN PRODUCE
Cipla
REMEDIES
PRODUCTS OF INTERNATIONAL STANDARD & QUALITY
CHEMICAL INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES LTD., BOMBAY—8